انّ من الشعر لحکمۃ و انّ من البیان لسحرا

کلیاتِ جگر

جگر مُرادآبادی



کلیاتِ جگر

جگر مرادآبادی

تحقیق و ترتیب

نواز چودھری

فہرست

جگر صاحب

(رشید احمد صدیقی)

جگر صاحب ان چار سر آمد اردو شعراء میں شمار کیے گئے تھے جن کو بیسویں صدی کے ایوان غزل گوئی کے چار ستون کہا جاتا ہے۔ یعنی حضرت فانی، اصغر، جگر اور حسرت۔ کیسے مستحکم یہ ستون ہیں، جن پر جدید غزل کی خوبصورت عمارت قائم ہے۔ باوجود ان تہلکوں اور زلزلوں کے جو اسے پیش آتے رہے۔

جگر صاحب اپنی سیرت و شخصیت کے اعتبار سے اپنے کلام سے بھی زیادہ دلاویز اور قابل احترام تھے۔

بالکل یاد نہیں آتا جگر صاحب سے پہلے پہل کب، کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے الہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغر صاحب مرحوم ہندوستانی اکیڈمی (یو۔ پی) میں صیغہ اردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغر صاحب کے یہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگر صاحب پر شراب کا کافی تسلط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی راہ و رسم ہو گئی کہ جگر صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے یہاں ٹھہرتے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے عزیز اور محترم دوست بن گئے۔

الہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے اس طرح خاموش مودب اور آنکھیں نیچی کیے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو ہاں، نہیں میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ اصغر صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ ایسے خوش ہوتے جیسے ان کا رواں رواں مسکرانے لگا ہو۔ ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر آسودگی اور عفو کی ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان تمام لوگوں کا قصور معاف کرنے لگا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔

کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں

بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو۔ اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مہم پر چلے جائیں۔ ان کے مواجہ میں اصغر صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اٹھ کر چلے جاتے۔

اصغر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا اکتایا ہوا تو کبھی کبھی مسکرا کر ان کو یہ فقرہ سنا دیتے۔ ''چاہے جہاں پھرو، لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا۔'' اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کرتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ ''اصغر صاحب! کہاں آنا پڑے گا بیچارے آتو جاتے ہیں۔'' اصغر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر بولے۔ ''ابھی کہاں آتے ہیں؟ ابھی تو لائے جاتے ہیں۔'' ایک دفعہ الہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کی ہاں جگر صاحب پھر اسی حال میں ملے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرے کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدحظ سے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کر کے بولے۔ ''یہ سب تمہارے شعر نہیں سنتے تمہارا گوشت کھاتے ہیں۔'' اصغر صاحب کی آزردگی پر کسی قدر برہمی کا رنگ چھانے لگا تھا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا۔ ''اصغر صاحب! آپ تو لکھنوی شاعری کے تشبیہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے، یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟'' کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ خشمگیں لیکن زیادہ حزیں لہجے میں بولے۔ ''رشید صاحب! آپ کو کیا معلوم ایسے ایسے بے رحم لوگ بھی ہیں جو ان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں، اور یہ جو یہ اسپرٹ ہوتی ہے نہ، وہ پلا پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ ادھ مرے ہو جاتے ہیں تو یکے پر لاد پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔'' میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہو گئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟'' بولے۔ ''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''...... صاحب تو آپ کو صاحب کشف و کرامات بھی بتاتے ہیں۔'' بولے۔ ''جی! تو پھر؟'' میں نے عرض کیا۔ ''...... صاحب نے آپ کا ایک شعر سن کر آپ کو مستجاب الدعوات بھی قرار دیا تھا۔'' بولے۔ ''آپ بھی تو کچھ کہئے؟'' میں نے کہا۔ ''آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے کہ جگر صاحب کا گوشت کھانے والے ویجٹیرین ہو جائیں۔'' اصغر صاحب ہنس پڑے اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھے اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لئے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے جاتے۔ ''یہ سب جگر صاحب کے لئے رہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا۔''

میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یونیورسٹی اور شہر میں بھی جگر صاحب محبوب اور مقبول تھے۔ اس زمانہ میں بھی شراب کا بڑا زور تھا۔ اکثر غافل اور بدمست شہر سے لائے جاتے۔ یونیورسٹی کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا تو ان کو میرے ہاں لاتا۔ میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرے میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔

یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو، یا کوئی نرس سرسام میں مبتلا مریض کی نرسنگ کرتی ہو۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بانکوں سے کم نہ تھے جن کے قصے تاریخوں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔

میں آ جاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور مودب ہو جاتے۔ لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے رہ رہ کے سمندر کی تہہ سے کوئی طاقت ور موج ابل کر باہر آنے والی ہو۔ لیکن سطح کے قریب پہنچ کر یک بیک زور ختم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔

یہ باتیں میں اس لئے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے۔ میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقے سے ان کی نمائش کرتا۔ جگر صاحب سے مجھے یہی شکایت تھی کہ وہ میرے سامنے مودب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنر دیتا رہے۔ اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اس وقت نہیں ہوتی، جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے۔

جگر صاحب اپنے حلقہ کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے تھے، تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے تھے۔ ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے سے پرہیز کرتا تھا۔ لیکن اتفاق یا ضرورت سے پہنچ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جاتے، جیسے مکتب کے چھوٹے بچے ہنس بول یا اودھم مچا رہے ہوں اور دفعتاً مولوی صاحب نمودار ہو جائیں۔

جگر صاحب مجھ سے یقیناً بہتر انسان تھے۔ وہ مجھ سے مساوات برتیں میری عیادت کریں، مجھ سے خدمت لیں، مجھ سے جھگڑیں یا مذاق کریں، یہ ساری باتیں سمجھ میں آتی تھیں۔ لیکن وہ مجھے حرمین شریفین قسم کا مولوی یا کسی اردو اخبار کا آبرو باختہ ایڈیٹر، یا برطانوی عہد کا تھانیدار سمجھیں، یہ میرے لئے ڈوب مرنے کی بات تو تھی ہی، خود جگر صاحب کے لئے کوئی فخر کی بات نہیں تھی۔

میرا خیال ہے کہ ان کے ہاں میرا جو رکھ رکھاؤ تھا، غالباً اس تعلق سے تھا جو مجھے اصغر صاحب سے یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے تھے۔ وضعداری شریفوں کی پرانی کمزوری ہے۔

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے ہیں۔ یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ سمجھتا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر آئے گی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوٹتیں جس آسانی سے اچھی عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ سوچتا تھا کہ جب میں اپنی معمولی بری عادتیں چھوڑنے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے۔ وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوش گریہ میں غالب کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا۔ جگر صاحب شراب سے کیوں اور کیسے تائب ہوئے؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ اس بارے میں ان سے کبھی ذکر نہیں آیا۔ اتنا البتہ جانتا ہوں کہ ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوتی جسے متبذل کہہ سکیں۔ ان کی زبان سے سخت کلمات نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی لوٹتے پوٹتے، دند مچاتے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیف و سرخوشی بخشنے کے بجائے شراب ان کو انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ ان پر تھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی الحس تھے اور تھوڑی سی تحریک بھی بہت ہو جاتی ہو۔ شاعری میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ جیسے خیال یا جذبہ برقی رو بن کر ان کے جسم و جان کو جھنجھنا دیتا ہو۔ کچھ دنوں سے ان کے کلام میں یہ بات بظاہر کم ہو گئی تھی۔ لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا تھا کہ جو بات کہی گئی ہے اس میں تاثرات کی شدت ہے، لیکن ان کو پیش کیا گیا ہے زیادہ مدھم آواز اور انداز میں۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ کہ اصلاً وہ دوری و مہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں، وصال کے نہیں۔ ان کا محبوب سے رشتہ کا انداز Centrifugal (مرکز گریز) ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کوئی خلل نہیں نظر آتا۔ اور ان کا کلام اس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دور ہو وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر اور برتر ہوگا جس کی پوزیشن اس کے برعکس ہو۔ جگر کے نقاد کو یہ نکتہ مدنظر رکھنا چاہئے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا۔ صحت خراب ہو گئی، طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا۔ مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جگر صاحب نے جس پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیلا، وہ جگر صاحب کا رزمیہ ہے۔ کتنے اور کیسے "روز ابرو شب ماہتاب" آئے ہوں گے اور جگر صاحب پر سے گزر گئے ہوں گے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

جگر صاحب بڑی مذہبی آدمی تھے۔ مذہبی لوگوں کے بارے میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں ملتی ہیں۔ یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں۔ ''میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں۔'' وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ......ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور قابل قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیش نظر ہیں وہ اس درجہ کے بیوقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیونکر دھوکہ دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو، ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات ان بندوں کو ہمیشہ کے لئے منتقل کر دیئے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو پڑھے بغیر عدالت مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی ان کے فرشتوں کو ہی دھوکہ دے کر کار براری کر لیں جو ان کا اعمالنامہ مرتب کرنے کے لئے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے۔

جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی تھے کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ اور انسان کے حقوق کو پہچانتے تھے۔ اور ان کا لحاظ رکھتے تھے کہ جس کا جو حق ہو، اسے پہنچ جائے۔ وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے تھے۔ ان میں حیا تھی۔ وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے تھے۔ ان میں غیرت اور حمیت تھی۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جھیل جاتے تھے۔ دوسروں پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ ان کے یہ جوہر تقسیم ملک کی ہلاکتوں میں کھلے۔ تفصیل میں طوالت ہے۔

جگر صاحب عالم فاضل نہیں تھے۔ مذہب ہو یا سیاست ہو یا شعر و ادب ہو ان پر ان کی گفتگو منطقیانہ یا فلسفیانہ نہیں ہوتی تھی۔ ان کا احساس جتنا سریع اور شدید تھا اتنا ان کا مطالعہ وسیع نہیں تھا۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں تفصیل سے گفتگو نہیں کر پاتے تھے۔ وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید غور کر بھی نہیں سکتے تھے۔ جس کے جذبات تند و تیز ہوں وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جگر صاحب اقبال کی شاعری کے کچھ ایسے قائل نہیں تھے۔ فانی بھی نہ تھے دونوں کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں فکر و فلسفہ کیسا؟ حالانکہ دونوں، بالخصوص جب جگر جہت د جہاں سے بلند ہوتے ہیں، اقبال کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جگر صاحب شعر و شاعری کے بارے میں جو کچھ کہتے تھے وسعت اور وزن سے قطع نظر اس میں خلوص کی پاکیزگی اور یقین کی محکمی ملتی تھی۔

میں نے جگر صاحب کو تقریباً ہر حال اور ہر صحت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت نوجوان آزاد منش، عورتوں میں ماں بہن بیٹیوں میں عمائد اور اکابر کی موجودگی میں، طلباء اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابل گرفت نہیں پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب عفیف و شفیق نظر آتے تھے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلتی تھی، اور نگاہ کبھی بے باک اور بے محابہ نہ ہوتی تھی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلف دوستوں میں میں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے خیالی میں تفریحاً کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس میں عورتوں سے تفریح یا عورتوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم میری جان پہچان کا کوئی اردو شاعر ایسا نہیں ہے سوا فانی مرحوم کے، جو اس بارۂ خاص میں جگر صاحب کا مقابلہ کر سکے۔

رؤسا اور امراء کے سامنے جگر صاحب حتیٰ الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے تھے۔ لیکن اس طرح کی صحبتوں میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متردد رہا۔ اس لئے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نظرانداز کر دیتے تھے، لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی ناواجب حرکت سرزد ہو جاتی تو جگر صاحب بغیر کچھ کہے یا کئے نہ رہتے تھے۔ چاہے اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ بھوپال کے نواب زادہ رشید الظفر صاحب زمانہ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں انہوں نے جگر صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور کسی طرح کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی کہ وہ کیا کریں، کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیان ریاست میں سے اکثر یہ چاہتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔

ان میں سے ایک جو بہت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے، اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب جس معاوضہ اور شرط پر چاہیں اس کے متوسلین میں شامل ہو جائیں۔ طرح طرح کے ڈورے ڈالے گئے۔ جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی بھوپال کے وظیفہ سے بسر اوقات ہوتی تھی۔ جگر صاحب اس ''آفر'' کو خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رئیس نے برملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹالنی چاہی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں رنگ امارت کا بھی جھلکا۔ جگر صاحب بے قابو ہو گئے، بولے، ''جناب آپ مجھے داموں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو رشید الظفر کے ہاتھوں بک چکا ہوں''

حاضرین سناٹے میں آ گئے اور جگر صاحب گھر آ گئے۔

جگر صاحب میں مروت اور وضعداری بہت تھی۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لئے وہ تمام آداب برتتے جو شریفوں میں قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بڑے دھوکے کھائے، اور نقصان اٹھائے۔ جگر صاحب کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں تھا۔ مدتوں بڑی تنگی ترشی

سے بسر ہوئی۔ خرچ آمدنی سے بہت زیادہ تھا، لیکن انہوں نے اپنی تنگدستی کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہو۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے، سامان قیمتی رکھتے، جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا، یا چرا لیتا، ورنہ خود کہیں کھو آتے۔

جگر صاحب جب کبھی میرے ہاں آئے، میں نے یہ سوال کیا۔ ''جگر صاحب سفر میں کیا کھو آئے؟'' اور تقریباً ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے ہیں۔ ایک دفعہ مشاعرے میں جو کچھ ملا تھا اسے جیب میں رکھ لیا۔ جن کے ہاں ٹھہرے تھے انہوں نے جگر صاحب کو دیکھ بھال کے لئے اپنے کسی عزیز کو مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے جگر صاحب کی بڑی خدمت کی، ہر وقت موجود رہتے، اور اظہار عقیدت کرتے۔ جگر صاحب کو غافل سمجھ کر انہوں نے سارے روپے نکال لئے۔ جگر صاحب کہتے تھے کہ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے، لیکن چپ رہے۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیوں؟'' بولے۔ ''یہ واقعہ ایسے وقت رونما ہوا جب میں جائے قیام سے رخصت ہو کر اسٹیشن آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ اچھا معلوم نہ ہوا کہ وہاں اس چوری کا اعلان کروں، اور کسی شریف آدمی کو رسوا کروں۔''

جگر صاحب جس کے مہمان ہوتے تھے اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کرتے تھے۔ میں نے غصہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہ دیکھا۔ حکم چلاتے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کبھی ان کی زبان پر نہ آئی۔ دوسروں کے عیب انہوں نے کبھی نہیں ڈھونڈے، نہ کبھی ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا نہ کرتے ہوں۔ جگر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عام شعراء کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے تھے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اسے اپنے اشعار سنا سنا کر ادھ مرا کر دیں۔

جگر نے بھی غزل کے اسی بدنام کوچہ میں پرورش پائی تھی۔ داغ کی شاگردی نے انہیں ستے نشے کا مزہ بھی چکھایا تھا اور محض زبان کے لطف و بیان کے چٹخارے سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ مگر جگر کی عظمت یہی تھی کہ انہوں نے اس کوچہ میں قیام نہیں کیا۔ وہ داغ کے شاگرد تھے مگر داغ نہ بن سکے۔ وہ اصغر کے مداح اور عقیدت مند تھے، مگر اصغر نہ بن سکے۔ کیونکہ ان کے اندر ایک لذت پرست کا دل تھا، اور نہ ایک صوفی کا۔ وہ تو ایک ایسے سرمست اور سرشار انسان کا دل لے کر آئے تھے، جس کے پاس صرف ایک دولت تھی، خلوص کی دولت۔ اور صرف ایک قوت تھی، محبت کی قوت۔

مجھے جگر کی شاعری کی جن خصوصیات نے متاثر کیا ہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری ذات کا پرتو ہے، سخن کا پردہ نہیں۔ یہاں صرف ان احساسات اور جذبات کی جھلک ملتی ہے جنہوں نے شاعر کو بے چین کیا ہے مضطرب رکھا ہے۔ یہاں وہ مضامین نظم ہوئے ہیں، جنہوں نے زبردستی شاعر کو مجبور کر کے اپنے کو نظم کیا ہے۔ یہ آسان بات نہیں۔ اس کے لئے زبردست

جرات اور ہمت کی ضرورت ہے جو ہر مصلحت کو ٹھکرا کر آگے بڑھ سکے۔ دوسروں سے خلوص برتنا آسان ہے، اپنے سے خلوص برتنا بہت مشکل ہے۔ جگر کی سب سے بڑی جیت یہی ہے کہ انہوں نے اپنے فن پر کبھی مصلحت کا نقاب نہیں ڈالا۔

جگر نے شراب اور شباب کی شاعری کی ہے۔ اور ان کی زندگی کے یہ گوشے بھی کسی کی نظروں سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ شراب کو انہوں نے اپنایا، اور اس دھڑلے سے پی کہ شاید ہی اتنی مستی اور اتنی زیادہ شراب ہندوستان کی کسی زبان کے شاعر نے پی ہو۔ جب سب کو جگر کے شعر مارے ڈال رہے تھے، اس وقت جگر کو شراب مارے ڈال رہی تھی۔ شاہد و شباب سے ان کے ربط و ضبط بھی چھپے نہیں ہیں، اور انہوں نے اپنی رندی اور اپنے عشق دونوں کو پاک اور بے لاگ رکھا۔ ایسا رند پارسا اور ایسا پاکیزہ مشرب شاہد باز شاید ہی اردو ادب نے کبھی پیدا کیا ہو۔ لہٰذا جگر کی غزل میں خمریات کا ذکر جگ بیتی نہیں، آپ بیتی کا حکم رکھتا ہے۔ عشق اور واردات قلبیہ شاعری ہی نہیں تھی، زندگی تھی۔ اس میں حقیقی تجربہ کا رنگ بھرا گیا تھا، اور وہ ذاتی کیف و درد اور سوز و نشاط کی آواز بن گئی تھی۔

شراب و شباب جگر کے ہاں آلودگی پر ختم نہیں ہوئے۔ داغ سے جو لذتیت اور حسیات کا مزہ انہیں ملا تھا، اسے اصغر کے تصوف نے نکھار کر آلودگی سے پاک کر دیا تھا۔ ان کے ہاں عشق، وصال کے مزہ کا نام نہ رہا، ہجر کا کیف بن گیا۔ جگر کی شاعری محبوب کو پانے سے زیادہ جذبہ عشق سے عشق کرنے کی شاعری ہے۔ وہ جذبہ عشق جو محبوب سے ملاتا نہیں، البتہ اس سے ملنے کی تمنا میں مستقل تڑپاتا ہے۔ اور یہ تڑپ، یہ خلش، یہ غم وہ کلید ہے، جو کائنات کے بھید کھولتی چلی جاتی ہے۔ جو یہ بتاتی ہے کہ اصل بصیرت ذات میں گم ہو جانے میں نہیں ہے، بلکہ نشاط سے آگے بڑھ کر غم دو جہاں کے زہر کو شوق کی طرح پی کر کائنات کے وجود کے دائمی کرب کا ہم راز ہو جانے میں ہے۔ انسان دوستی، عالمگیر ہمدردی اور اخوت کے مبارک جذبے غم سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ غم محبوب کا حسین اور بیش بہا عطیہ ہے۔

ہجر سے شاد، وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے
اک شاہد معنی و صورت سے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا، لیکن یہ مذاق عام نہیں
غم کہ ہے زینہ صفات و ذات
غم نہیں ہے تو آرزو، نہ حیات

یہاں محبوب کا کوئی کم معیار تصور نہیں ہو سکتا۔ جگر کا محبوب نہ شاہد بازاری ہے اور نہ بے رحم جلاد۔ بلکہ دراصل وہ عاشق کی تکمیل ذات کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ خود بھی شاعر ہی کی طرح درد و کیف

سے آشنا ہے۔ وہ بھی شاعر کی ذات کی سرمستی اور والہانہ پن میں شریک ہے ۔

ہاں ہاں، مجھے کیا کام مری شدت غم سے
ہاں ہاں، نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد
ملتا جلتا ہے مزاج حسن ہی سے رنگ عشق
شمع گر بے باک ہے، گستاخ پروانہ بھی ہے

جسے خود بھی عشق کی دولت عزیز ہے، اور جو عشق کے دل کی بات کو لفظ و معنی کے اشاروں کے بغیر بوجھ سکتا ہے ۔

ابھی ہے دل کو مقام سپردگی سے گریز
اک اور بھی سہی گیسوئے عنبریں میں شکن
بیٹھے ہیں بزم دوست میں، گم شدگان حسن دوست
عشق ہے اور طلب نہیں، نغمہ ہے اور صدا نہیں

اور اسی لئے حسن کا درجہ ان کے ہاں پرستش کا نہیں، رفاقت کا ہے۔ مگر وہ رفاقت جو پاکیزہ ہے۔ جو اس قدر مقدس ہے کہ میر کے لفظوں میں ۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

کی مصداق ہے۔ اس پاکیزگی کا ذکر جگر سے ان الفاظ میں کیا ہے ۔

وہ ہزار دشمن جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاک پا تری چھو گئی، وہ برا بھی ہو، تو برا نہیں!
مری طبیعت کو حسن فطرت سے ربط باطن نہ جانے کیا ہے
مری نگاہیں کبھی نہ اٹھیں طہارت چشم تر سے پہلے

غم انسانی زندگی کی بصیرت کی کلید ہے، اور غم محبت کا فیضان ہے۔ لہٰذا جگر کے نزدیک محبت ہی زندگی کا آدرش ہے، اور اسی مرکز پر انسانی سماج کی تشکیل ہونی چاہئے۔

ع میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اسی لئے وہ ایک انسانی سماج کا تصور کرتے ہیں، جس میں افراد اور قومیں خود غرضی اور تعصب کے بجائے محبت، راست کرداری اور خلوص کو نظام حیات قرار دے سکیں۔ ان کے نزدیک اصلی علم و عرفان یہی ہے اور اگر تہذیب کے ساری ملمع اور علم و سائنس کی ساری ترقی کے باوجود انسان کی داخلی زندگی میں انقلاب نہ پیدا ہو سکا اور وہ خود غرضی، لالچ، تعصب اور تنگ دلی سے باہر نہ نکل سکا، تو ان

کے نزدیک انسانیت کی ترقی بے کار ہے۔

دل میں اگر نہیں، تو کہیں روشنی نہیں   تسخیر مہر و ماہ مبارک تجھے مگر

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں، کہاں تک علم و فن ساقی!
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی، نہ من ساقی

گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے   جہل خرد نے دن یہ دکھائے

جگر کے نزدیک انسان کی راست کرداری اور جرات مندانہ خلوص اس کی سب سے اہم خصوصیات ہیں۔ اور اسی لئے جب انہیں اپنے وطن میں راست کرداری، جرات مندانہ خلوص اور وسعت نظری کی کمی نظر آتی ہے تو وہ مصلحت پرستی کے بغیر پورے خلوص اور کرب کے ساتھ اس پر تنقید کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے بہت سے مرثیے لکھے گئے۔ مگر جگر کی چھوٹی سی نظم ان سب پر بھاری ہے، کیونکہ اس میں وہ گاندھی جی کے سیاسی کردار سے زیادہ ان کے خلوص، ان کے پیغام محبت اور راست کردار پر زور دیتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ جمہوریت کا صحیح معیار فرد ہے۔ جو تہذیب بہتر افراد کو جنم دے سکتی ہے، وہی معیاری تہذیب کہلانے کی مستحق ہے۔ جگر ان معنوں میں اپنے دور کے ہندوستان اور اپنے دور کی مہذب دنیا سے نا آسودہ ہیں۔ وہ انہیں مادی آسودگی اور ظاہری چمک دمک کے سامان دیتی ہے۔ مگر انسان کی باطنی آسودگی اس کی راست کرداری کا حل اس کے پاس نہیں ہے۔ انسان کی مادی ترقی اور اس کے زوال کا یہی تضاد ہے، جسے کردار کے بحران سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ دن بدن زیادہ آسائش پسند، زیادہ متمول اور زیادہ طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کی خود غرضی اور مصلحت پرستی، اس کی تنگ نظری اور تعصب بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ جگر اس عظیم نفسیاتی اور ذہین بحران پر سخت تنقید کرتے ہیں۔

جگر اپنے دور سے مطمئن نہیں ہیں، مگر وہ مایوس بھی نہیں ہیں۔ جگر کی شاعری فرد کے لئے سوزِ یقیں کا پیغام دیتی ہے۔ وہ ماحول کی تاریکی سے تھک کر بیٹھ جانے والوں میں نہیں ہیں۔ خود اپنے سوزِ باطن سے غیر فانی شمع جلانے والوں میں سے ہیں۔

خود اپنے ہی سوز باطن سے، نکال اک شمع غیر فانی
چراغ دیر و حرم تو اے دل، جلا کریں گے بجھا کریں گے

ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا   اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہل دل

قسمت تری خود ہے ترے کردار میں مضمر
قسمت کو بنانا ہے تو قسمت سے گذر جا

ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں، ہم اپنی کیوں وضع خاص بدلیں
کہ انقلابات نو بہ نو تو ہوا کئے ہیں، ہوا کریں گے

اپنی اپنی وسعت فکر و یقیں کی بات ہے
جس نے جو عالم بنا ڈالا، وہ اس کا ہو گیا

زیست بسر کی نہ سہاروں کی ساتھ
جان فدا اس پہ کہ جس نے جگر
جسے جینا ہو، مرنے کے لئے تیار ہو جائے
یہ مصرعہ کاش! نقش ہر در و دیوار ہو جائے
سکوں تلاش نہ کر، اے دل سکوں دشمن!
ہر ایک لحظہ ہے در پیش کار زار حیات
پرائی آگ میں جلنا ہے کار مردانہ
خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع، جلنے دو

جو دشمن کے لئے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں
دل خوباں میں چبھتا ہے انہیں کا بانکپن ساقی!

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانہ میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانہ سے ہم نہیں

یہاں جگر ایک ایسے شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں، جسے فرد کی طاقتوں پر بے پناہ اعتماد ہے۔ جسے انسان کی عظمت اور اس کے باطنی متاع بے بہا کا احساس ہے۔

ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگر
انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں

اور ان کی شاعری یہاں ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں وہ ستانشہ نہیں بنتی، سوزِ یقیں اور جوش عمل کی پیغامبر بن جاتی ہے۔ اور غزل میں یہ آہنگ سمو لینا جگر کے علاوہ اس دور کے بہت کم شعراء کے ہاں ملتا ہے۔

ان خیالات کے بارے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ یہ خیالات جگر کے ذاتی خلوص سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں نہ تقلید کا رنگ ہے اور نہ کسی مخصوص مکتب خیال یا پارٹی میں ہونے کی وجہ سے ان کو اپنایا گیا ہے۔ ان پر جگر کی شخصیت کی چھاپ ہے۔ یہ جگر کی ذات کے ریشہ ریشہ کی پکار ہیں، اور ان میں ان کا خلوص مصلحت کوشیوں، گروہ بندیوں اور کٹر نظریہ پرستیوں کو للکار کر حقیقت کی نجی دریافت کے درجہ تک پہنچتا ہے۔

کہنے کو اہل علم کی کوئی کمی نہیں
لیکن خود اپنی فکر، خود اپنی نظر کہاں؟

جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن
بیٹھے ہم ہر بزم میں، لیکن

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان خیالات کو جگر نے جذبہ کی شکل میں ڈھال کر شعریت بخش دی ہے۔ شاعر کی حدود احساسات کے لطیف ترین ارتعاشات سے شروع ہوتی ہیں، اور خیال تک پہنچتی ہیں۔ عظیم شاعری محض احساسات کی شاعری نہیں ہوتی۔ وہ خیالات کو جذبہ کی قوت اور رنگینی بخش دیتی ہے، اور اسے شعریت کے پیکر میں ڈھال دیتی ہے۔ جگر ان گنے چنے شعراء میں سے ہیں، جنہوں نے جس خیال کو نظم کیا ہے اسے جذبہ کی رنگینی اور شعریت کا حسن بخش دیا ہے۔ ان کے ہاں خیال کی عظمت نہ سہی، مگر اس کا حسن اور اس کی صداقت ضرور ہے۔ ان کا مقام ہمارے عظیم ترین شعراء کی صنف میں نہ سہی، مگر کامیاب اور رنگین شعراء کی صف اول میں ضرور ہے۔

غالباً داغ جگر اور شعلہ طور کے کلام کے پیش نظر جگر کی غزل گوئی کے بارے میں یہ رائے عام طور پر ظاہر کی جاتی ہے کہ ان کی غزل گوئی اساتذہ کی کامیاب تقلید ہے۔ اس میں شراب وشباب کی پر کیف سرمستیاں ہیں اور اسے سماجی تنقید یا فکری تعمق سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن آتش گل کے دور کی شاعری کے بارے میں یہ رائے یقیناً نامناسب ہے۔ یہاں جگر کی قوت تغزل اس قدر پر تاثیر ہے کہ وہ خیال کے براہ راست اظہار کے باوجود شعریت اور تغزل کے انداز کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چند نظموں کی استثناء کے بعد جگر کی شاید ہی کسی غزل کو اس کیف سے خالی قرار دیا جا سکے گا۔

جگر کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی شاعری کا سنگیت ہے۔ ٹیگور کے ایک ڈرامہ میں ایک کردار نے کہا تھا، ہمارے الفاظ بولتے نہیں، گاتے ہیں۔ جگر کے الفاظ بھی بولتے نہیں، گاتے ہیں۔ جگر کسی ذاتی اہتمام یا در و بست کے بغیر شعر کی اندرونی موسیقی قائم رکھتے ہیں۔ لفظوں کے انتخاب، ان کے معنوں کے ربط، ان کی جھنکار اور صوتی تاثیر پر ان کی نظر اس قدر گہری ہے کہ گویا موزوں ترین الفاظ بلا کسی کاوش کے ان کے قلم سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ شعریت اور موسیقی جگر کی شخصیت کا جزو معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اشعار میں وہ جھنکار ہے جس میں صنعت گری کا شائبہ معلوم نہیں ہوتا۔ انداز بیان کا وہ سادہ نکھرا ہوا روپ ہے جو روح کو وجد میں لاتا ہے اور شاعری کو موسیقی کے کیف و مستی سے مالا مال کر دیتا ہے۔ جگر نے انداز بیان کے مختلف انداز اختیار کئے ہیں اور ہر جگہ ان کی ندرت ادا، والہانہ پن، بے ساختگی اور سادگی سے معمور شعریت سے بھرپور آہنگ ایک نیا عالم پیدا کر دیتا ہے۔

خرد حقیقت چالاک و چست و مست خرام
جنوں صداقت بے باک و مصلحت دشمن
ارے غضب، ارے ستم، وہ اک نگاہ سحر فن
جھکے اگر تو بت کدہ، اٹھے اگر تو بت شکن
کہاں کے لالہ و گل، کیا بہار توبہ شکن

کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن
وہی زمیں، وہی زماں، وہی مکیں، وہی مکاں
مگر سرور یک دلی، مگر نشاط انجمن!
کہاں پہلوئے خورشید جہاں تاب
کہاں اک نازنین دوشیزہ شبنم
زندگی فرش قدم بن کے بچھی جاتی ہے
اے جنوں اور بھی اک لغزش مستانہ سہی
اپنی شوریدہ مزاجی کو کہاں لے جاؤں
ترا ایماں نہ سہی، تیرا اشارہ نہ سہی

زلف و مژہ کے سائے سائے   راہ جنون آسان ہوئی ہے
بنتا جائے بگڑتا جائے   کار زمانہ جتنا جتنا
نہ آئے گی بہار اب کے برس کیا   لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک

یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا
شبنم کو ہنسی آئی، دل غنچوں کا بھر آیا
شعر و نغمہ رنگ و نکہت، جام و صہبا ہو گیا
زندگی سے حسن نکلا اور رسوا ہو گیا

عشق ہے کار شیشہ و آہن   عشق ہے پیارے، کھیل نہیں ہے

غرض جگر غزل شاعرانہ وراثت کا ایک اہم سرمایہ ہے۔ جگر کی سرمستی، ان کا خلوص، ان کی جرات اور راست کرداری، ان کی شعریت اور تغزل کی توانائی، یہ سب ایسے جوہر ہیں، جن سے کیف و بصیرت حاصل کی جاتی رہے گی۔ علی سکندر اب اس دنیا میں نہیں، لیکن جگر مراد آبادی کی آواز ایک مدت تک سوز یقین اور نور بصیرت بخشتی رہے گی۔

جگر نے کہا تھا۔

جان کر منجملہ خاصان مے خانہ مجھے!
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

جگر مراد آبادی

(مالک رام)

آزادی سے قبل جس زمانے میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے دفتر شملے میں جایا کرتے تھے، یہاں کی ''بزم ادب'' ہر سال اچھے بڑے پیانے پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا کرتی تھی۔ اس بزم کے کرتا دھرتا بیشتر سرکاری ملازم تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب ان حضرات کے دماغ دفتری مسلوں کی خشکی اور پیوست سے ماؤف اور بیکار ہو جاتے، تو یہ اسے شعر وسخن کی رنگینی سے تازگی بخشنے کی کوشش کرتے تھے۔ ماشاءاللہ خود بزم کے اراکین میں شاعروں کی کمی نہیں تھی، لیکن مشاعرے کو موقر اور وقیع بنانے کے لئے ہر سال باہر سے بھی دو چار نامی اور مشہور اساتذہ کو دعوت دی جاتی تھی۔

اتفاق سے ۱۹۳۶ء کے مشاعرے کے موقع پر میں شملے میں تھا۔ مشاعرہ ستمبر کے آخری اتوار کے دن ہوا تھا۔ اس سے پہلے دن سہ پہر کے وقت میں اور جلیل قدوائی اور بدر الدین صاحب لوئر بازار کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں چوڑا میدان میں ایک صاحب رکشا پر آتے ہوئے مل گئے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے رکشا رکوائی اور بڑھ کے جلیل صاحب سے بڑے تپاک سے بغل گیر ہو گئے۔ جلیل نے میرا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ آپ جگر مراد آبادی ہیں اور خصوصی دعوت پر مشاعرے میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں۔ شعلہ طور کے ساتھ محمد اودیاما کی بنائی ہوئی جو تصویر (یہ تصویر اوماایا مرحوم کا شاہکار ہے، بلکہ بہت حد تک ان کی عام شہرت اسی کی مرہون منت ہے۔ اس سے متعلق ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

ہمارے ایک دوست تھے، حمید عرفانی، انہیں بھی تصویر کشی سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے اوماایا کی اس تصویر کی نقل تیار کی اور ایسی عمدہ کہ باید وشاید۔ اس پر انہوں نے خود جگر سے ان کا ایک فارسی شعر لکھوایا اور دستخط لئے۔ جب میں نے یہ تصویر ان کے وہاں دیکھی، تو میری نیت خراب ہو

گئی۔ اب مجھے ٹھیک سا یاد نہیں کہ انہوں نے میرا شوق دیکھ کے خود ہی اسے میرے حوالے کر دیا، یا میں نے ہی کچھ حیلہ بہانہ کر کے یہ ان سے ہتھیالی، بہر حال تصویر میرے قبضے میں آ گئی۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے کتاب خانے کے ساتھ میں اسے اپنے عزیز دوست ملک احمد حسن مرحوم (اڈیٹر دور جدید) کے پاس چھوڑ آیا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ جب احمد حسن نے اسے دیکھا تو پوچھا، کیوں بھائی، واقعی یہ جگر صاحب کو ٹھیک تشبیہ ہے۔ میں نے کہا: واہ صاحب! یہ آپ نے کیا کہا! اصل تو یہ تصویر ہے، جگر صاحب تو اسے دیکھ کر بنائے گئے ہیں۔ یعنی یہ اصل ہے اور جگر صاحب نقل۔ پس یہ سوال تو ہو سکتا ہے کہ کیا جگر اس تصویر کے مطابق ہیں یا نہیں، لیکن آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ تصویر جگر کی ہے یا نہیں۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ افسوس، کہ میرے قیمتی کتاب خانے کے ساتھ یہ تصویر بھی لاہور کے ۱۹۵۳ء کے فسادات کی نذر ہو گئی۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

بعد کو میری ملاقات خود اویاما سے بھی ہوئی، بلکہ انہوں نے میری تصویر بھی بنائی تھی۔ تو خیر، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ کا جاپانی نام اویاما کیونکر رکھا گیا، تو انہوں نے بتایا کہ میری ولادت ۱۹۰۵ء میں روس اور جاپان کی جنگ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں جاپان نے روس کو شکست دی تھی، میرے والد کو اس سے بڑی خوشی تھی کہ ایک ایشیائی مٹھی بھر کے ملک نے روس کے سے دیوزاد یورپی ملک کو شکست دی ہے۔ اس جنگ میں جاپانی بحری بیڑے کا امیر البحر اوریاما، نامی تھا۔ والد نے میرا نام اسی کے نام پر محمد اویاما رکھ دیا۔)

چھپی ہے، بالکل وہی ناک نقشا؟ لیکن چونکہ اس میں محض خطوط ہیں اس لئے اس سے اصلیت پورے طور پر واضح نہیں ہوتی۔ میانہ قد، خاصا سانولا رنگ، چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی نیم وا آنکھیں اور ان میں سرخی کی جھلک، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا، ترشی ہوئی کھچڑی ڈاڑھی جس میں چاول کم اور دال زیادہ تھی، سر پر لمبے لمبے بے ترتیب پٹے، جو ٹوپی سے باہر نکلے پڑتے تھے، گلے میں سیاہ رنگ کی شیروانی اور نیچے چوڑیدار چست پاجامہ، سر پر سلیٹی رنگ کی بالوں والی اونچی دیوار کی ٹوپی اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا پمپ پہنے تھے۔ طبیعت میں حد درجہ بے چینی اور وحشت، حالانکہ وہ صرف چند منٹ کے لئے رکے، لیکن اس دوران میں بھی انہوں نے جو باتیں کیں، کچھ عجیب، کھڑی اکھڑی سی ......
یوں معلوم ہوتا تھا، گویا اپنے سائے سے بھڑک رہے ہوں۔ یہ تھے جگر صاحب!

اگلے دن مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔ خدا بخشے منتظمین کو، ان کی خوش انتظامی کے صدقے، یہ دس کی جگہ گیارہ بجے شروع ہوا تھا۔ تاجور تھے، جن سے پہلے کی ملاقات تھی، حسرت موہانی اور روش صدیقی سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ حسرت سے میرا تعارف تاجور مرحوم اور جلیل نے کرایا، اور دونوں نے

مبالغے سے کام لیا۔ سائل صاحب دلی سے تشریف لائے تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں پہلے سے نیاز حاصل تھا۔ انہوں نے بعض پرانی غزلیں سنائی تھیں۔ زبان کے پہلو سے واقعی ان کا جواب نہیں تھا۔ احسان دانش نے اپنی نظم ''مزدور کی عید'' سنائی تھی۔ حسب معمول انہوں نے پاٹدار آواز میں ترنم سے پڑھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس کے بعض مقامات ایسے دردناک تھے کہ بے اختیار میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ حسرت نے مشاعرے میں چار غزلیں سنائیں۔ ہر ایک میں غالباً چھ چھ سات سات شعر تھے اور سب تازہ کلام۔ یہ کاغذ کے چند پرزوں پر لکھی تھیں۔ مشاعرہ ختم ہونے پر یہ کاغذ انہوں نے مجھے دے دیئے۔ ان کے پڑھنے کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ ناک میں تو وہ بولتے ہی تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ گلے میں کسی خرابی کی وجہ سے آواز اتنی نیچی تھی کہ شاید ہی دور بیٹھے ہوئے کسی شخص کے پلے کچھ پڑا ہو۔ اور پھر انہوں نے شعر کا ہے کہ پڑھے، گھاس کاٹ کے رکھ دی، نظم اور نثر میں کوئی امتیاز نہیں رہا۔ کوئی اور ہوتا، تو ہلڑ مچ جاتا اور بدتمیز بے فکرے اسے زبردستی بٹھا دیتے۔ لیکن ان کی بزرگی اور شاعرانہ عظمت کے سامنے کسی کو دم مانے کی جرات نہ ہوئی۔ سب ادب کے مارے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے پڑھنے کے وقت ایک لطیفہ بھی ہوا۔

پہلی ہی غزل تھی۔ انہوں نے مطلع پڑھا۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے داد دی اور اسے پھر پڑھنے کی فرمائش کی۔ حسرت نے مطلع دوبارہ پڑھ دیا۔ حسن مطلع پڑھا، انہوں نے پھر داد دی اور مکرر پڑھنے کی درخواست کی۔ اب کے حسرت نے ناک کی پھنگی پر آئی ہوئی عینک کے اوپر سے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور شعر پھر پڑھ دیا۔ تیسرے شعر پر ان کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب کی جو شامت آئی، انہوں نے یکبارگی ''واہ'' کہہ کے ہاتھ اٹھایا اور ''پھر ارشاد ہو'' کا نعرہ لگایا۔ اب حسرت کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے دیکھا بھی نہیں اور ''کوئیں ضرورت نہیں'' کہہ کے اگلا شعر پڑھ دیا۔ اس کے بعد کسی کو مکرر کہنے کی جرات نہیں ہوئی۔

جگر صاحب نے بعض پرانی غزلوں کے علاوہ ایک غیر مکمل تازہ غزل کے چند شعر سنائے تھے، جس کا یہ بے پناہ مطلع آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے:۔

آ کہ تجھ بن اس طرح، اے دوست! گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں، کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جگر کو پڑھتے سنا۔ انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں ترنم سے کلام سنایا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجلس میں سماں بندھ گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں دو ہی ایسے شاعر دیکھے جنہیں سن کے بڑے بڑے ثقہ اور تقدس ماب ڈاڑھی بردار مولویوں تک کو وجد آ گیا۔ ایک حفیظ جالندھری اور دوسرے جگر مراد آبادی۔

میں ۱۹۳۶ء کے جاڑوں میں دلی آ گیا۔ یہاں میں نے ایک مختصر سا مکان قرول باغ میں اجمل خان روڈ پر لے لیا۔ جن لوگوں نے آج سے ۳۵۔۴۰ برس پہلے کا قرول باغ نہیں دیکھا اور ان کی نظر میں صرف اس کی موجودہ چہل پہل اور گہما گہمی ہے، وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس زمانے میں یہاں کیا خاک اڑتی تھی، بلا مبالغہ، اجمل خاں روڈ، غالب کی ''سرحد ادراک'' معلوم ہوتی تھی۔ اس سڑک پر بھی بس گنتی کے چند مکان تھے، اس کے ایک سرے پر جامعہ ملیہ کے دفتر اور اس کے عملے فعلے کے سکونتی مکان تھے اور دوسرے سرے پر طبیہ کالج کی عمارت۔ کوئی فرلانگ بھر کی دوری پر ''گندہ نالہ'' جو یوں سمجھئے کہ تہذیب و تمدن کی آخری سرحد تھی۔ اس کے اس پار خانہ بدوش رہگزروں اور بازیگروں کے پھوس کے چھپر اور جھونپڑیاں تھیں، اور یہ واقع ہے کہ لوگ اکا دکا، رات کی تاریکی تو در کنار، دن کی روشنی میں بھی اس علاقے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہاں دن دہاڑے مسافر لٹ جاتے، بلکہ بعض اوقات قتل تک کی واردات ہو جاتی تھی۔

تو خیر، چونکہ میں کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھا ''جہاں کوئی نہ ہو'' اس لئے میں نے سوچا کہ اس سے بہتر اور کونسا مقام ہوگا، اور مکان اسی اجمل خاں روڈ پر لے لیا۔

میں یہاں روزانہ صبح کے وقت ایک صاحب کو تیز تیز مکتبہ جامعہ کی طرف جاتے دیکھتا، گندمی رنگ، متوسط قد، دوہرا جسم، گول آفتابی چہرا، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، اونچی چوڑی پیشانی، بھرواں سیاہ ڈاڑھی اور مونچھیں، نیچے علی گڑھ فیشن کا پاجامہ، گلے میں شیروانی اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ وہ جب بھی ملے، منہ میں گلوری اور بغل میں پاندان دبائے ہوئے۔ کئی مرتبہ جی میں آئی کہ آدمی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں، ان سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہئے۔ یوں بھی پڑوس کا معاملہ ہے، آخر بالکل الگ تھلگ رہ کے تو زندگی کے دن کٹنے سے رہے۔ لیکن میری فطری کم آمیزی ہمیشہ مانع آئی۔ جرات پڑی کہ خود اپنا تعارف کرا دوں۔ آخر، خدا معلوم کیسے، خود انہیں خیال آیا۔ ایک دن آمنے سامنے آتے ہوئے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔ رک گئے، علیک سلیک ہوئی، پوچھا، آپ یہاں نئے آئے ہیں، کوئی تکلیف تو نہیں۔ معلوم ہوا ان کا نام ہے محمود علی خان (جامعی) تھے، جنہوں نے ہمارے ہاں سو شعروں کی جدت یا بدعت شروع کی۔ میر کے سو شعر، غالب کے سو شعر، مومن کے سو شعر...... غرض اس طرح انہوں نے نئے پرانے شاعروں کے کوئی دس پندرہ کتابچے شائع کئے تھے۔ اس کے بعد یار لوگ اسے لے اڑے۔ جس نے دیکھا کہ پورا دیوان چھپنا مشکل ہے، کون اسے چھاپے گا اور کون پڑھے گا، اس نے اپنا تعارف کرانے کے لئے یہ کم خرچ بالا نشین نسخہ استعمال کیا اور اپنے سو شعر چھپوا کے دوستوں میں تقسیم کر دیئے، تا کہ سند رہیں۔ یوں چھپنے کی ہوس بھی پوری ہو گئی اور سستے بھی چھوٹے۔ چنانچہ باز کے سو شعر، گلہری کے سو شعر اور نہ جانے کس کس کے سو شعر چھپ چکے

ہیں۔ لیکن محمود صاحب نے اس کے علاوہ متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ چونکہ انہیں انگریزی اور اردو دونوں پر پوری قدرت حاصل تھی اور آدمی ٹھہرے بے حد محنتی، اس لئے وہ ترجمے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔

غرض اس کے بعد ان سے تعلقات بہت گہرے اور مخلصانہ ہو گئے۔

ایک دن شام کے وقت ان کا آدمی آیا کہ "خان صاحب" بلاتے ہیں۔ میں پہنچا، تو دیکھا کہ جگر صاحب تشریف فرما ہیں۔ محمود صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ میں ان سے شملے میں مل چکا ہوں۔ جگر صاحب اور محمود صاحب کے بہت پرانے مراسم تھے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر محمود اور جلیل قدوائی نہ ہوتے تو غالباً ان کا کلام کبھی شائع ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی، تو کم از کم اس کی یہ ضخامت نہ ہوتی۔ جگر جس طرح کے لاابالی اور بے پروا شخص تھے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انہوں نے کبھی باقاعدگی سے اپنا کلام، ایک جگہ جمع نہیں کیا۔ وہ تو خوش قسمتی سے ان دونوں صاحبوں نے شروع سے حفاظت کا اہتمام کیا، ورنہ خدا معلوم کس قدر ضائع ہو گیا ہوتا۔ چنانچہ جیسا کہ شعلہ طور کے دیباچے میں جگر نے اعتراف کیا ہے، انہی دونوں کی بیاضوں سے یہ دیوان مرتب ہوا تھا۔

جگر صاحب یہاں کوئی دس بارہ دن رہے اور اس کے بعد اگلے برس کے دوران میں بھی جب میرا قیام قرول باغ ہی میں تھا، اکثر یہاں آتے رہے۔ ان ایام میں مجھے اچھی طرح قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور رفتہ رفتہ ہمارے آپس کے تعلقات بہت دوستانہ اور عزیزانہ ہو گئے۔

وہ اس زمانے میں پیتے تھے اور بے حساب! اور ستم بالائے ستم کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جوش بھی پیتے تھے، لیکن ان کا یہ اصول ہے، جس سے انہوں نے کبھی انحراف نہیں کیا کہ وہ دن میں ہرگز نہیں پئیں گے۔ صرف مغرب کے وقت، وہ بھی دو تین جام۔ اگر کبھی خاص دوست احباب کا مجمع ہوا، تو ایک آدھ زیادہ سہی۔ اختر شیرانی اور مجاز نے بھی کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قبل از وقت چل بسے۔ جگر کا بھی یہی حال تھا۔ ایک تو جب مل گئی، اور دوسرے جتنی چاہا پی لی۔ پھر اس کا بھی خیال نہیں کہ کس قسم کی ہے۔ اچھی یا بری، بس شراب ہو۔ وہ تو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انہیں توبہ کی توفیق دے دی کہ انہوں نے اسے ترک کر دیا، ورنہ جو حشر ان کا ہوا ہوتا، ظاہر ہے۔ تاہم آخر عمر میں ان کی صحت جو اتنی خراب رہتی تھی، تو اس کی اصل وجہ یہی اوائل عمر کی نامراد شراب نوشی اور دوسری بداعتدالیاں تھیں۔

ایک دن سر شام پینے بیٹھے اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں نصف بوتل کے قریب پی گئے۔ آدھی رات کے بعد کہنے لگے، چلو! جوش کے ہاں چلیں (جو دہیں قرولی باغ میں تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے) ہم نے بہت کہا کہ وہ سو چکے ہوں گے، اب اس وقت اتنی رات گئے انہیں دق کرنا ٹھیک نہیں ہو

گا۔ لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی بلکہ ہمارے کہنے پر بگڑ گئے۔ آخر سب نے عافیت اسی میں دیکھی کہ جس طرح یہ کہتے ہیں، اسی طرح کیا جائے۔ چنانچہ آگے آگے جگر اور انہیں سہارا دینے کو محمود صاحب اور ان کے پیچھے ہم چھ سات آدمی، جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے۔ سردیوں کی ڈھلتی رات اور اس زمانے کا قرول باغ، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسا ہو کا عالم ہوگا۔ وہ تو خیر گزری کہ پولیس کا سپاہی راستے میں نہیں مل گیا، ورنہ یقیناً وہ خیال کرتا کہ یہ مشٹنڈے شراب پی کر کہیں واردات کو جا رہے ہیں، یا کم از کم آوارہ گرد ضرور ہی ہیں اور ہمیں جوش کے مکان کے بجائے تھانے پہنچا دیتا۔ اب ایک لطیفہ ہوا۔ جگر صاحب چند قدم چلیں، اور سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر تقریر کرنا شروع کر دیں۔ اس پر کتوں اور سوروں نے (جن کے اس زمانے میں یہاں بڑی کثرت تھی) ادھر ادھر سے نکل کر بھونکنا اور چیخنا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ اس پر ہم سب بلطائف الحیل انہیں آگے چلنے کی ترغیب دیتے۔ قصہ کوتاہ، خدا خدا کر کے وہ تین چار سو گز کا فاصلہ کوئی آدھ پون گھنٹے میں طے ہوا اور ہم لدے پھندے جوش کے مکان کے بیرونی برآمدے میں داخل ہوئے۔ یہاں پہنچتے ہی جگر نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ہڑ بڑا کے آواز آئی: ''کون؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''جگر''۔ ''کون؟'' ارے، ایک مرتبہ جو کہا ہے، جگر، دروازہ کھولو'' ''بھائی ہم سو رہے ہیں، صبح کے وقت آنا۔'' ''سو رہے ہیں! آئے بڑے سونے والے۔ ارے ہم، ہم یہاں سردی میں باہر کھڑے ہیں اور تم سوئے پڑے ہو۔ جلد دروازہ کھولو۔ یہ محمود بھی ہمارے ساتھ ہے۔'' اس پر جوش غریب طوعاً و کرہاً اٹھے اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے اگلے دن مجھ سے کہا کہ میں دروازہ یوں تھوڑی کھولنے والا تھا۔ لیکن جب جگر نے محمود کا نام لیا، تو میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، ورنہ محمود یوں رات کے وقت قطعاً نہ آتے۔ یہ اس لئے کہ محمود صاحب پیتے نہیں تھے اور جوش صاحب کو معلوم تھا کہ وہ سنجیدہ آدمی ہیں۔

دروازے کا کھلنا تھا کہ جگر صاحب لپک کے کمرے میں داخل ہوئے اور اوپر کی گرم چادر پھینک، شڑاپ سے جوش کے لحاف میں گھس گئے، جیسے وہ گھر سے اسی کی تلاش میں یہاں تک آئے ہوں۔ اور کہنے لگے: ''محمود، اب کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں یہیں سوؤں گا۔ آپ تشریف لے جائیں۔ میں صبح کے وقت ناشتے کے بعد آ جاؤں گا۔ اچھا، خدا حافظ''۔ جوش بیچارے حیران پریشان کہ یہ بلائے بے درماں کہاں سے نازل ہو گئی! وہ کہتے ہی رہے۔ ''نہیں، جگر صاحب! آپ جائیے محمود صاحب کے ساتھ۔'' لیکن توبہ ہے، یہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ادھر ہم سب کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ آخر ہم نے دونوں دوستوں کو آپس میں راز و نیاز کرنے کے لئے شب بخیر کہا اور واپس چلے آئے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ جگر نشے کی حالت میں بالکل حواس کھو بیٹھے ہوں۔ کبھی

بہکی باتیں ضرور کرنے لگتے تھے۔ ابھی ایک موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں کہ یک لخت اس سے گریز کر کے کسی دوسرے مضمون پر بات چیت کرنے لگیں گے، حال آنکہ دونوں میں آپس میں قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سننے والا ہکا بکا ان کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہے کہ یا الٰہی، یہ کیا! ابھی دو منٹ پہلے تو یہ غزل کی حمایت میں دلائل بیان کر رہے تھے اور اب عینک کے تالوں کی پہچان اور ان کی مختلف قسموں پر تقریر فرمانے لگے ہیں، لیکن ان کی بلا سے، بات اصل یہ ہے کہ ان کا دماغ بیک وقت مختلف موضوعات کی جولانگاہ بنا رہتا تھا۔ اب اس دنگل میں کسی خاص وقت جس موضوع کا غلبہ ہو گیا، زبان پر اس کی بات آ گئی۔ لیکن وہ ذہنی کشمکش برابر جاری رہتی۔ پھر اگر پہلے موضوع کی بات چیت کے دوران میں، کسی دوسرے مضمون کا پلا بھاری ہو گیا، تو چت ہو جائے گا اور وہ بے اختیار اسے چھوڑ کر دوسرے سے متعلق باتیں کرنے لگتے۔ سامع کو اس سے حیرت ہو، تو ہوا کرے، ان کے لئے یہ بالکل قدرتی اور معمولی اسلوب گفتگو تھا۔ اور یہ بات سرخوشی کے عالم ہی سے مخصوص نہیں تھی، وہ ہوش کے وقت بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

بہر حال واہی تباہی بکنا یا گالی دینا کبھی ان کا شعار نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ حقیقت میں ان کا مزاج دینی تھا۔ اصغر گونڈوی مرحوم سے انہیں خاص عقیدت رہی۔ بلکہ وہ ان کے ہم زلف بھی تھے۔ اصغر جس پائے کے انسان تھے، ان کا ہر ایک ملنے والا اس کا معترف ہے۔ اصغر کی طرح جگر بھی حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت تھے۔ یہی سبب ہے کہ لاکھ بے عملی بلکہ بد عملی کے باوجود، اساسی طور پر ان کی روح کبھی ان آلائشوں سے ملوث نہیں ہونے پائی۔ انہوں نے فسق و فجور میں بھی لذت محسوس نہیں کی۔ جو کچھ سرزد ہوا، اضطراری طور پر۔ وہ ہوش کی حالت میں ہمیشہ پشیمان ہوتے اور ندامت محسوس کرتے اور اس سے باز رہنے کے منصوبے باندھتے۔ لیکن چونکہ کثرت شراب نوشی سے قوت ارادی حد درجہ کمزور ہو چکی تھی، اس لئے اس عزم میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں بہت حد تک قصور ان لوگوں کا بھی ہے، جو ان کے اردگرد رہا کرتے تھے۔ یہ اصحاب اپنے آپ کو ان کا بڑا دوست اور خیر خواہ کہتے تھے، وہ دراصل ان کے دشمن تھے۔ جگر صاحب کہیں جاتے، تو یہ حواری خود صاحب خانہ سے فرمائش کر کے بوتل منگوا لیتے، اور جام بھر کے جگر صاحب کے آگے رکھ دیتے۔ اب وہ بیچارے کیا کرتے! اگر کسی شخص کی اصلاح منظور ہو، تو سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اسے آزمائش میں نہ ڈالا جائے، تا کہ بتدریج اس کی قوت ارادی عود کر آئے اور رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہو جائے کہ وہ خود آزمائش کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اگر آپ قدم قدم پر اس کا امتحان کرنے لگیں، اس کے چاروں طرف اس کی لغزش کے ساز و سامان جمع کر دیں اور پھر اس سے کہیں کہ ہم چاہتے ہیں، آپ اس بری علت سے نجات حاصل کر لیں، تو یہ خیال خام ہے:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن، ہشیار باش!

اگر اس غریب میں ان آلودگیوں سے دامن جھٹک کر الگ ہو جانے کی قوت ہوتی، تو وہ ان حالوں پہنچتا ہی کیوں!

ان کی قوت ارادی کے فقدان پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جس طرح وہ اپنے آپ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے، اسی طرح کسی کی دل شکنی بھی ان سے محال تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ایک دن خاصی رات گئے ان کی ڈاڑھ میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت جو چھوٹا موٹا گھریلو علاج ممکن تھا، کیا گیا، لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ رات انہوں نے بہت بے چینی سے کاٹی۔ اگلی صبح ان کی جو شامت آئے، مختصر سا ناشتہ کر کے اکیلے طبیہ کالج چلے گئے کہ وہاں کسی حکیم صاحب سے دکھا کے دوا لے آئیں۔ وہاں جو پہنچے، تو لڑکوں نے پہچان لیا۔ اب کیا تھا، وہ انہیں گھیر گھار کے کالج کے ہال میں لے گئے اور دو گھنٹے تک ان سے کلام سنتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاج تو خیر کیا ہوتا، جب یہ وہاں سے لوٹے ہیں تو ان کی مظلوم صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ نہ صرف دانت کا درد بدستور موجود تھا، بلکہ اس پر دردِ سر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی۔ میں نے پوچھا کہ آخر آپ نے یہ کیوں کیا، انکار کر دیا ہوتا۔ تو رونی صورت بنا کے کہنے لگے، بھائی، میں کیا کرتا، وہ طالب علم اتنی محبت سے اصرار کر رہے تھے، کہ مجھ میں انکار کی ہمت نہ رہی۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔

جگر صاحب کے ساتھ زندگی بھر ہمیشہ کوئی نہ کوئی شخص رہا۔ سفر ہو یا حضر، انہیں کسی بھروسے کے آدمی کی ضرورت ہوتی، جو ان کے روزمرہ کے معاملات کی نگرانی کر سکے، ان کی ضروریات کا خیال رکھے، روپے پیسے کا حساب رکھے۔ اس کی وجہ یہ کہ ان کے مزاج میں سکون اور اطمینان نہیں تھا، بات جلد بھول جاتے، انتظامی صلاحیت شروع میں شاید کچھ رہی ہو، بعد کو وہ بھی مفقود ہو گئی۔ اس لئے اگر دیکھ بھال کے لئے کوئی چوکس آدمی ان کے ساتھ نہ رہتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ اب اگر یہ آدمی مخلص اور دردمند اور بے غرض دوست ہوا، تو اس سے انہیں بے حد آرام ملتا، اور کوئی نقصان بھی نہ ہوتا۔ لیکن بعض اوقات آدمی کے انتخاب میں غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ اسی طرح کا حادثہ ایک مرتبہ پیش آیا۔ یہ صاحب مستعد تو بہت تھے، لیکن تھے چور۔ آج یہ چیز غائب کر دی، کل وہ۔ جگر کے دوستوں نے انہیں بہت متنبہ کیا کہ وہ آدمی اعتماد کے قابل نہیں، لیکن انہوں نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اور تو اور، جگر صاحب کو بھی ان کی کارگزاریوں کا یقین آ گیا۔ کوئی اور ہوتا، تو اس کے بعد انہیں ایک لمحہ بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہ کرتا۔ لیکن اس کے باوجود کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ

کس قماش کے بزرگ ہیں، وہ ان سے معذرت کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ ایک دن جگر غسل خانے جانے والے تھے۔ چاہتے تھے کہ کلائی کی گھڑی اتار کر باہر بیٹھنے کے کمرے میں رکھ جائیں۔ لیکن وہ ذات شریف موجود تھے۔ جگر کو پورا یقین تھا کہ گھڑی ان کی غیر حاضری میں غائب ہو جائے گی۔ اب یہ تذبذب میں کہ کریں، تو کیا! گھڑی کو غسل خانے کے اندر لے جا نہیں سکتے اور باہر چھوڑ جانے میں جو خطرہ ہے، وہ سامنے موجود ہے۔ آخر جب مزید انتظار کرنا ناممکن ہو گیا، تو جھنجلا کے گھڑی ان صاحب کے ہاتھ دے کر کہا، اچھا، تو یہ بھی آپ لے لیجئے، اور خود غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

میں سمجھتا ہوں، اگر پیٹ پالنے کی مجبوری نہ ہوتی یا بعض دوسرے ذمے داریاں ان کے سر پر نہ ہوتیں، تو وہ کبھی کوئی کام نہ کرتے۔ ان کی ہستی کا خمیر جن اجزاء سے اٹھایا گیا تھا، ان میں کاہلی اور سستی کچھ ضرورت سے زیادہ مقدار میں پڑ گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا، کہ جہاں تک شعر کا تعلق ہے، وہ واقعی روح القدس کے شاگرد تھے، لیکن جہاں دنیا کا کوئی معاملہ آیا، وہ بالکل کودن تھے۔ وہ ہفتوں اور مہینوں کبھی تنکا اٹھا کے نہیں توڑتے تھے۔ اس پر ایک بات یاد آ گئی۔

۱۹۳۲ء میں جگر صاحب بھوپال گئے۔ محمود صاحب ان دنوں وہیں ٹیکسٹائل کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ گرمی اور برسات کے کوئی چھ مہینے ان کے پاس ٹھہرے۔ شہر کے اکثر صاحب ذوق حضرات روزانہ شام کو اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر محمود کے مکان پر جمع ہوتے اور جگر صاحب کی صحبت کا لطف اٹھاتے۔ ادبی گپ اور لطیفہ بازی ہوتی، شعر و شاعری کا دور چلتا اور بالعموم یہ پر لطف اجتماع رات کے نو بجے سے لے کر صبح کے دو دو تین تین بجے تک رہتے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دو ایک دن کی بات تو تھی نہیں، روزانہ پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تک تمام آداب و مکلفات کے ساتھ ایک جگہ بیٹھے رہنا، ہفتوں اس سے کم نہیں تھا، بالخصوص جب کہ ان میں بعض اصحاب اچھے خاصے سن رسیدہ تھے۔ کسی بے فکرے کو سوجھی کہ ایک ایسی انجمن بنائی جائے، جس میں ادب آداب کے سب قیود اٹھا دیئے جائیں، تاکہ سب احباب آزادی اور بے تکلفی سے اپنا وقت گزار سکیں۔ سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔

انجمن کا بنیادی اصول یہ طے پایا کہ آج کل دنیا میں جتنی بے چینی ہے، اس کی علت غائی سرعت رفتار ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ پرانے زمانے میں لوگ بالعموم پیدل جاتے آتے تھے، تو سب طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ شروع میں سواری کا رواج صرف معذوروں اور بیماروں کے لئے تھا۔ اس کے بعد ان چیزوں کا غلط استعمال ہونے لگا۔ اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ان غریبوں کو تو کوئی پوچھتا تک نہیں اور ہر طرح سے چاق چوبند اور ہٹے کٹے لوگ گاڑیوں اور موٹروں اور ہوائی جہازوں میں اڑے پھرتے ہیں۔ اس برق رفتاری نے دنیا میں جنگ و جدال اور ہلاکت و تباہی

آسان کر دی ہے، کیونکہ جب یہ سریع سامان نقل و حرکت معرض وجود میں نہیں آئے تھے، جنگ شاذ و نادر ہی ہوتی تھی، اور اگر کارقضا کہیں ہو بھی گئی تو اس کی تباہ کاری کا میدان بہت محدود رہتا تھا۔ چونکہ فوج، سامان جنگ، اسلحہ، رسد وغیرہ کی حمل و نقل میں بڑی دشواریاں تھیں، اس لئے اگر ملکوں میں آپ میں کوئی اختلاف پیدا بھی ہو جاتا، تو وہ ان مشکلات کے پیش نظر حتی الوسع بات بڑھانے سے اجتناب کرتے اور ایک دوسرے سے مصالحانہ گفتگو کر کے فیصلہ کر لیتے تھے۔ جنگ صرف اس وقت ہوتی، جب اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا تھا۔ پھر چونکہ مسافت طے کرنے میں لامحالہ کافی وقت لگتا تھا، اس لئے حملہ آور فوج کے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے دوسرا ملک بھی کم و بیش تیار ہو جاتا۔ یوں فریقین کی طاقت یکساں ہو جانے سے کسی ملک کو خاص نقصان نہ رہتا اور صلح صفائی پر خاتمہ ہو جاتا۔

لیکن اب کیا ہے؟ فاصلے کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہی۔ صبح کا ناشتہ دلی میں کیا، تو ہوائی جہاز میں بیٹھ کے دوپہر کا کھانا قاہرہ میں، اور رات کا لندن میں کھاؤ۔ اسی طرح لڑائی بھی آسان ہو گئی ہے۔ ابھی الٹی میٹم دیا اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد غنیم کے ملک پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس سے بڑی تباہی آتی ہے۔ شہر اور بستیاں پل بھر میں ویران ہو جاتی ہیں۔ بیگناہ اور ناکردہ کار لوگ گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ سارا عذاب ہم پر اس سرعت رفتار کی بدولت نازل ہوا ہے۔ جب تک دنیا کاہلی جیسی نعمت خداوندی کی قدر کرتی رہی، سب کی زندگی عیش و عشرت اور آرام و آسائش سے معمور تھی۔ جب لوگوں نے کفران نعمت کیا، تو بے چینی اور پریشانی کا شکار ہو گئے۔ اب بنی نوع انسان کو کامل ہلاکت سے بچانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اسے کاہلی جیسی نعمت الٰہی کی طرف واپس بلایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے امن پسند لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سکون اور کاہلی کی تبلیغ کریں تاکہ مخلوق خدا سرعت رفتار کے ہاتھوں لائی ہوئی مصیبت سے نجات پا سکے۔

جب اس اصول پر سب کا اتفاق ہو گیا، تو چند ''امن پسند باشندگان بھوپال'' نے یہ اقدام کیا کہ ایک ''انجمن الکہلا'' (فعلاء کے وزن پر کاہل کی جمع کہلاء) کی بنیاد رکھی اور باقی دنیا کے امن پسندوں کو دعوت دی کہ وہ بھی ہر جگہ اسی طرح کی انجمنیں قائم کر کے اس مقصد اعلیٰ کے حصول میں تعاون کریں۔ بھوپال کی صدر انجمن کا دفتر (دار الکہلاء) محمود صاحب کے سکونتی مکان کا وہی کمرہ قرار پایا، جہاں جگر مقیم تھے۔ فرش پر پوال کی خاصی موٹی تہ اور اس پر ایک دبیز گدا ڈال دیا گیا تھا، جس پر سفید براق چاندنی بچھی رہتی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انجمن میں داخلہ آسان تھا اور ہما شما سب اس کے رکن بن گئے تھے، بلکہ اگر کوئی شخص رکنیت کی درخواست کرتا، تو انجمن کے ''عظیم الشان مقاصد'' پر ایمان اور ان کے مطابق عمل کرنے کی خواہش اور قابلیت معلوم کرنے کے لئے اس کی کاہلی کا امتحان لیا جاتا۔ اگر وہ اس

امتحان میں پورا اترتا، تو اسے بطور رکن قبول کر لیا جاتا۔ داخلے کی فیس ایک تکیہ تھی۔ جس دن کوئی شخص رکن مقرر ہو جاتا، وہ گھر سے ایک تکیہ لے کر آتا اور اسے ''دار الکہلاء'' میں ڈال دیتا۔

انجمن کے صرف چار عہدیدار تھے۔ جناب جگر، صدر، یہ ''صدر الکہلاء'' تھے۔ نائب صدر حسرت لکھنوی تھے۔ انہیں ''نائب الکہلا'' کہتے تھے۔ ان حضرات کو صدر اور نائب صدر اس لئے نہیں چنا گیا تھا کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے، بلکہ انہوں نے اپنی غیر معمولی ''کاہلانہ'' صلاحیتوں سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں اور اس عہدے کی کڑی ذمہ داریاں سرانجام دینے کے پوری طرح اہل ہیں۔ تیسرا عہدہ ''ناظم الکہلاء'' میں ہر طرح کا انتظام کریں، اجلاس کے لئے مطلوبہ اشیاء فراہم کریں، روزانہ کاروائی کا پروگرام بنائیں وغیرہ۔ چوتھے ''نقیب الکہلاء'' کہلائے جنہیں آپ سارجنٹ ایٹ آرمز (Seargent At Arms) کہہ سکتے ہیں۔ اس عہدے پر جناب غلام حسنین عزم بنارسی فائز تھے۔ ان کا فرض تھا کہ یہ صدر انجمن کے مختلف احکام بلند آواز سے حاضرین تک پہنچایا کریں۔ چونکہ وہ بڑے لمبے تڑنگے اور بلند آواز تھے، اس لئے یہ عہدۂ جلیلہ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان عہدہ داروں کے علاوہ اکتیس ارکان تھے، جن میں بھوپال کے بعض مشہور اور معزز اصحاب وقت شامل تھے۔ مثلاً میاں محمد مہدی نائب مہتمم تاریخ، سید علی اکبر کاظمی سپرنٹنڈنٹ صحت عامہ و تعلیمات، جناب احمد اللہ خان شاکی سپرنٹنڈنٹ مجلس واضع قوانین، استاد محمد کریم ذکی بھوپالی، فکری بھوپالی، سروش بھوپالی، محمد عبدالباسط بھوپالی، محمد اصغر شعری بھوپالی وغیرہ۔ ایک اور بات کہ ہر ایک رکن کو اس کی کسی ذاتی خصوصیت کی بنا پر خاص خطاب سے سرفراز کیا گیا اور اجلاس میں وہ اسی نام سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ مثلاً محمد مہدی صاحب اپنی بزرگی اور مشفقانہ رویئے کی وجہ سے ''ام الکہلاء'' کہلاتے تھے۔ محمد شریف خان فکری کی چونکہ چھوٹی سی مگر نمایاں توند تھی، اس لئے انہیں ''قبۃ الکہلاء'' کا خطاب دیا گیا۔ شاکر علی خان چونکہ دراز قد تھے، اس لئے ''طویل الکہلاء'' کہلائے۔ ایک صاحب کا ناک نقشا خوبصورت اور رنگ بھی سانولا سلونا تھا، یہ ''ملیح الکہلاء'' تھے اور ان کے مقابلے میں ایک دوسرے صاحب اپنے سفید شلجمی رنگ کی وجہ سے ''صبیح الکہلاء''۔ محمد اشرف (ایڈیٹر نئی روشنی، کراچی) چائے میں شکر بہت پیتے تھے، بلکہ داؤ لگے، تو دوسروں کی آنکھ بچا کر ایک آدھ چمچہ یوں بھی منہ میں ڈال لیتے تھے، اس لئے انہیں ''قند الکہلاء'' کا خطاب عطا ہوا۔ پھر چونکہ پورا خطاب زبان سے ادا کرنا بھی کاہلی کے خلاف سمجھا گیا، اس لئے تخفیف کر کے یہ حضرات محض ''صدرل''، ''قندل'' وغیرہ ہو کے رہ گئے۔

انجمن کے اجلاس شام کے نو بجے سے صبح کے تین بجے تک ہوتے تھے۔ ''اجلاس'' اس حالت کا نام تھا کہ اراکین عظام اپنے اپنے تکئے پر سر رکھے خاموش لیٹے ہیں۔ کاہلی کے معنی خواب غفلت کے

نہیں تھے، اس لئے اجلاس کے دوران میں سونا ممنوع تھا۔ اگر اجلاس ہو رہا ہو، تو رکن لیٹ سکتا تھا یا پھر کھڑا ہو سکتا تھا، بیٹھنا سخت ترین جرم تھا، کیونکہ یہ فعل کاہلی کے سراسر منافی تھا۔ اگر کوئی صاحب اس جرم کے مرتکب ہوتے، تو انہیں یہ سزا دی جاتی کہ وہ تمام دوسرے اراکین کی خدمت بجالائیں۔ مثلاً پانی پلانا، پان کھلانا، اگالدان اٹھا کر دینا، چلم بھرنا وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی ''کاہل'' اجلاس کے دوران میں ''دارالکہلاء'' میں تشریف لاتے، تو چونکہ بیٹھنا ممنوع تھا اس لئے وہ کھڑے کھڑے جسم تولتے اور دھڑ سے اپنے تکئے پر گر پڑتے۔

روزانہ کاہلی کے عجیب وغریب واقعات پیش آتے تھے۔ ایک دن ''ام الکہلاء'' لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ کسی ''کاہل'' کا ہاتھ جو لگا تو چلم ان کے اوپر الٹ گئی۔ لیکن مجال ہے، جو انہوں نے کسی تشویش کا اظہار کیا ہو۔ بس ایک کروٹ لی، انگارے ان کی چھاتی پر سے نیچے گر گئے اور وہ اسی طرح اطمینان سے لیٹے رہے۔ لیکن جب ''صدرل'' نے دیکھا کہ اس طرح فرش میں آگ لگ جانے کا خطرہ ہے، تو انہوں نے اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس پر لوگ اٹھ دوڑے اور انگارے اٹھا کے بجھا دئے گئے۔

اجلاس میں وہ سب کچھ ہو سکتا تھا، جو تفریح کی ذیل میں آتا، بشرطیکہ اس سے کاہلی کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ اور شعر وشاعری تو روزانہ ہوتی تھی۔ چونکہ لیٹے لیٹے شعر پڑھنا اور داد دینا مشکل تھا، اس لئے جب شعر کی ترنگ اٹھتی، تو کوئی رکن یہ تجویز پیش کر دیتا کہ اب تھوڑی دیر کے لئے شعر و شاعری کا دور ہو جائے، تو ''صدرل'' اجلاس ملتوی کر دیتے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ اب لوگ اٹھ کے بیٹھ سکتے ہیں۔ ماشاءاللہ سب اراکین نحو یا کم از کم سخن سنج تو تھے ہی، ایک دوسرے سے مقابلے کے جوش میں طبیعت پر خوب زور دے کر شعر کہتے۔ ہر ایک شخص روزانہ اپنا تازہ کلام پیش کرتا۔ یہ فضا جگر صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے چمکانے بلکہ ابھارنے میں بھی بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان کی بعض مشہور اور بلند پایہ غزلیں اسی ''دارالکہلاء'' کے دور میں کہی گئی تھیں۔ مثلاً حسب ذیل غزلیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

۱۔ جواب بھی نہ تکلیف فرمایئے گا۔
۲۔ نظر ملا کے، مرے پاس آکے لوٹ لیا۔
۳۔ ہجوم تجلی سے معمور ہو کر۔
۴۔ عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ
۵۔ حسن معنی کی قسم، جلوۂ صورت کی قسم!
۶۔ دل حریف حال بے حالی نہیں۔

۷۔ غم عاشقی کا صلا چاہتا ہوں۔
۸۔ محبت میں یہ کیا ستم دیکھتے ہیں!
۹۔ جب تک شباب عشق مکمل شباب ہے۔
۱۰۔ سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے۔
۱۱۔ تڑپ کر دل انہیں تڑپا رہا ہے۔
۱۲۔ دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے وغیرہ

بھوپال میں برسات کے موسم میں بارش بہت شدید ہوتی ہے۔ یہاں کا سالانہ اوسط غالباً ۱۵۰ سنٹی میٹر ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب موسلا دھار بارش گھنٹوں رہتی اور گھر سے باہر پاؤں رکھنا محال ہوتا، سب کے سب ''کاہل'' وقت کی پوری پابندی سے بلاناغہ ''دارالکہلاء'' میں جمع ہوتے۔ ادھر نو بجے کے قریب ہوئے کہ ہر ایک پانی میں چوہا آ رہا ہے۔ اب یہ ''ناظمل'' کا فرض تھا کہ گیلے کپڑے اتروائے، اور ان کی جگہ خشک کپڑے مہیا کرے۔

یوں چھ مہینے تک ہر رات تین تین بجے تک کی غیر حاضری سے ان لوگوں کے گھروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جو اصحاب متاہل تھے، ان میں سے بعض کی بیویوں نے تو یہ باور کرنے سے انکار کر دیا کہ جگر کوئی شاعر ہے، جس کے پاس یہ حضرت جا کے بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہو نہ ہو، یہ موئی کوئی طوائف ہے، جس کے کوٹھے پر جا کر تم لوگ روزانہ رنگ رلیاں مناتے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد اصحاب کو جگر کو ساتھ لے جا کے ان کی طلعت ہی زیبا اپنی بیویوں کو دکھانا پڑی، تاکہ ان کا اطمینان ہو جائے۔

شہر کے لوگ جگر کو دعوتوں میں بلاتے تھے۔ اس سے نہ صرف انہی کا وقت ضائع ہوتا بلکہ ان کی غیر حاضری سے انجمن کی معمولی سرگرمیوں میں بھی بہت کمی، بلکہ بے لطفی ہو جاتی تھی۔ کاہلوں کو یہ کسی عنوان منظور نہیں تھا۔ اس لئے غور و خوض کے بعد اس کا سد باب یوں کیا گیا کہ انجمن نے یہ قرارداد منظور کی کہ چونکہ دعوتوں سے عام طور پر کاہلی کے جذبے کو نقصان پہنچتا ہے، جس کی قربانی کسی صورت گوارا نہیں کی جا سکتی، اس لئے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ اگر کوئی صاحب ''صدرل'' کو چائے یا کھانے کی دعوت دیں، تو ان کے ساتھ بقیہ سب اراکین کو بھی مدعو کریں۔ یہی نہیں، بلکہ رات کے کھانے کی صورت میں، اس دن رات کا ''اجلاس'' بھی نو سے تین بجے تک میزبان صاحب ہی کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہ صرف ان اصحاب کے اکل و شرب کا انتظام کریں، بلکہ ان کے لیٹنے اور اینڈنے کے لئے اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی خالی کر دیں۔ بے شک، اس پابندی سے دعوتوں میں بہت کمی ہو گئی، لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی منچلا یہ تمام شرائط قبول کر کے دعوت کر ہی دیتا۔

جب رات کے تین بجے اجلاس ختم ہوتا، تو اس سے پہلے بے دودھ کی چائے کا دور چلتا، جو پیالیوں کی بجائے فنجانوں میں پی جاتی تھی۔

اس انجمن کا ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا تھا، جو یقیناً اب بھی اکثر ''کاہلوں'' کے پاس موجود ہوگا۔

اس انجمن کو درہم برہم ہوئے ایک زمانہ ہوگیا۔ جو نیک مقاصد سامنے رکھ کے یہ بنائی گئی تھی، افسوس، وہ تو پورے نہ ہوئے۔ دنیا کی اور بیشمار عمدہ تحریکیں بھی ناکام رہی ہیں اور سچ پوچھیے، تو اس دنیا نے ازل سے نیکوں کی قدر کہاں کی ہے! اس لئے محض ایک انجمن کا ماتم بیکار ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج بھی کوئی اس طرح کی انجمن یا جماعت قائم ہو، جس کا طرۂ امتیاز ''کاہلی'' قرار پائے، تو اسے جگر صاحب سے زیادہ فعال صدر میسر نہیں آسکتا۔ سچ ہے، یہ خدا کی دین ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

جگر کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا۔ بزرگوں کا وطن دراصل دلی تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع، شاہجہان کے استاد تھے۔ نہ جانے کس بات پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ ترک وطن کر کے مراد آباد میں جا مقیم ہوئے۔ جگر کو شاعری گویا ورثے میں ملی۔ دادا حافظ محمد نور شاعر تھے، نور تخلص تھا۔ والد مرحوم مولوی بزرگ علی بھی شاعر تھے، نظر تخلص کرتے اور ناسخ کے شاگرد رشید وزیر لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ خود جگر نے ابتدا میں چندے منشی حیات بخش رسا کو کلام دکھایا، لیکن پھر داغ سے رجوع کیا، جو رسا کے بھی استاد تھے۔ داغ کی وفات (۱۹۰۵ء) کے بعد کچھ دن منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی اصلاح لی۔

جگر کی ایک خصوصیت قابل تعریف ہے۔ انہوں نے غزل کے سوائے کچھ نہیں کہا، بلکہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ کچھ اور کہتے تو اس میں اس حد تک کامیاب بھی نہ ہوتے۔ چونکہ ان کی افتاد طبع تھی بھی غزل کے مناسب حال، اس لئے ان کا کسی اور سخن پر توجہ کرنا گویا اپنی صلاحیتوں کے غلط استعمال کے مترادف ہوتا۔ ان کا اپنے آپ کو غزل سے مخصوص کر لینا، ان کے لئے بھی اچھا رہا، اور غزل کے لئے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو میں غزل اتنی ہی پرانی ہے، جتنی خود یہ زبان۔ بظاہر اب اس میں کوئی جدت اور تازگی ممکن نہیں۔ کیونکہ کونسا وہ مضمون یا موضوع ہے، جسے متقدمین بیان نہ کر گئے ہوں۔ پس اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جگر کا کلام بھی وہی پرانے رنگ کی چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا اسلوب اور لب ولہجہ اور کس بل خاص ان کی چیز ہے۔ اور چونکہ زمانے کا مذاق بدل گیا، خود غزل کی ہیئت، زبان اور موضوع بلکہ مقصد تک سے متعلق نئے نئے

تجربے ہونے لگے ہیں۔ اس لئے اب یہ توقع کرنا کہ پھر کوئی جگر کا سا غزل گو شاعر پیدا ہوگا، امید موہوم سے زیادہ نہیں۔

ان کے کلام میں دو مختلف رنگوں کا امتزاج ہے۔ جرات اور داغ کی مادیت بھی ہے اور مومن کی معنویت بھی۔ جگر کا مزاج ان تینوں سے ملتا جلتا ہے۔ جرات اور داغ نے عشق جسمانی کی جو تصویریں اپنے کلام میں پیش کی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان کے ہاں کوئی پیچیدگی نہیں، وہی روزمرہ کی باتیں ہیں، جو آئے دن ہم میں سے ہر ایک کے تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ جگر نے ان دونوں پر یقیناً ترقی کی ہے، ایسی کہ بسا اوقات پڑھنے والے کا ذہن شعر کی مادیت کا پوری طرح احاطہ بھی نہ کرسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ان دونوں کی سی صاف عریانی نہیں، بلکہ وہ اکثر اپنا مدعا ایسا پردے اور مرک سے بیان کر جاتے ہیں کہ انسان پر اس کی عارضی ہیجانیت اور بیش پا افتادگی تک گراں نہیں گزرتی، اور وہ اس پر خاص توجہ دیئے بغیر آگے گزر جاتے ہے۔

مومن کے ہاں حسن و عشق کی تصویریں زیادہ گہرے رنگ میں ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کے اختیار میں نہیں۔ ان کے کلام سے پوری طرح لذت یاب ہونے کے لئے لازم ہے کہ نہ صرف قاری کے ذہن کی تربیت ایک خاص فکری ماحول میں ہوئی ہو، بلکہ اس نے ''فسق و فجور'' کا کچھ نظری یا عملی تجربہ بھی کیا ہو۔ مومن نے زمانہ ہجر و وصال کی مختلف وارداتوں اور لاگ اور لگاوٹ کی گوناگوں کیفیتوں کا جو نفسیاتی نقشا پیش کیا ہے، اس کا جواب نہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ہاں ایک خاص طرح کا لفظی اشکال ہے، اور اس کا تعلق فی الاصل بیشتر ان کے لہجے سے ہے جس سے بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی لئے قاری اس کی معنویت تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ حقیقت میں یہی وجہ ہوئی کہ مومن نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چونکہ جگر نے مدتوں رندی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خاک چھانی تھی، اس لئے وہ ان مضامین کے ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں، جو مومن کا طرۂ امتیاز ہیں۔ نہ صرف یہی، بلکہ ان کے ہاں لفظی اشکال نام کو نہیں۔ ان کی بات فوراً ہر ایک کی سمجھ میں بھی آجاتی ہے۔

شراب کے مضامین میں جنہیں خمریات کا نام دیا گیا ہے، جیسے کچھ ان کے کلام میں بیان ہوئے ہیں، آپ کو اردو میں بہت کم کسی اور شاعر کے ہاں ملیں گے...... ریاض خیر آبادی کے خمیریات مشہور ہیں۔ لوگ داغ کی بھی اس بات میں تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ ایمان کی بات ہے کہ ریاض اور داغ دونوں کے ہاں حد درجہ سطحیت ہے۔ حالانکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ ریاض اور داغ دونوں کے ہاں حد درجہ سطحیت ہے۔ میں ان دونوں کی قادر الکلامی کا انکار نہیں کر رہا ہوں۔ دونوں استاد ہیں، اور زبان کی رنگینی اور شوخی میں تو ان کا جواب نہیں۔ لیکن یہاں گفتگو خمریات سے ہے۔ فقرہ چست کر دینا، یا پھبتی

کہہ لینا، اور بات ہے، اور سرخوشی کے عالم میں بھی اپنے اندرونی احساسات اور دلی تاثرات کا بیان الگ چیز ہے۔ وہ کیفیت اور سرور جو صرف ایک رند میکش ہی محسوس کر سکتا ہے، نہ ریاض کے بس کی بات ہے، نہ داغ کی۔ کیونکہ کبھی ایک قطرہ بھی ان دونوں کے حلق سے نیچے نہیں گئی۔ اس پہلو سے جو مزہ جگر اور جوش کے کلام میں ہے، وہ آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ غالب بھی شاذ و نادر جب کبھی اس طرح کے مضامین لکھتا ہے، تو ڈوب کر اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ بھی سنی سنائی باتیں نہیں لکھتا، بلکہ ذاتی واردات بیان کرتا ہے۔

بیشک یہ ضروری نہیں کہ انسان جو لذت محسوس کرے، اسے ہمیشہ بیان کر لینے پر بھی قادر ہو۔ کئی لطیف جذبات اور احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ زبان ان کے کامل اظہار سے قاصر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ کی عجز بیان کی مثالیں شراب پینے والوں کے ہاں بھی مل جائیں گی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا کہ انسان نے کسی کیفیت کا سرے سے کبھی تجربہ کیا ہی نہ ہو اور وہ اسے کماحقہ، بیان کر سکے۔

میں نے بارہا جگر کو شعر کہتے، بلکہ پوری پوری غزل کہتے دیکھا۔ آپ نے وہ داغ کا شعر جننے کا لطیفہ تو ضرور سنا ہوگا۔ جگر کو کبھی اس طرح تجربہ نہیں ہوا۔ احباب کا مجمع ہے، مجلس جمی ہوئی ہے، لطیفے اور ہنسی مذاق کی گفتگو ہے، فقرے بازی اور گلچھپ ہو رہی ہے کہ کسی نے کہا: ''جگر صاحب، اس مصرع پر مصرع یا شعر پر شعر تو کہیئے۔'' اگر ان کی طبیعت کسی وجہ سے بالکل ہی غیر حاضر نہیں، تو انہیں گرہ لگانے یا شعر کہنے میں کبھی کوئی تکلف نہیں ہوا اور اگر مجمع واقعی معقول لوگوں کا ہوا، تو انہوں نے غزل بھی پوری کر لی۔ انہیں درست مشورہ تک قبول کر لینے میں بھی عذر نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے:

''عرض غم نہ کر، اے دل!'' دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ اونھ کر کے، سن لیا جواب ان کا!

پہلے مصرع ثانی میں ''اونھ کہہ کر'' تھا۔ ایک دن وہ یہ غزل سنا رہے تھے، تو میں نے ان سے کہا کہ اس کی بجائے ''اونھ کر کے'' بنا دیجئے۔ کہنے لگے: وجہ؟ میں نے جواب دیا کہ ''اونھ'' کوئی مستقل کلمہ نہیں، جس کے لئے ''کہنا'' کہا جائے، بلکہ یہ ایک آواز ہے۔ اس کے لئے ''کرنا'' ہی مناسب ہے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس کے بعد جوش سے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ جوش نے میری تائید کی، اس پر انہوں نے ''اونھ'' کر کے بنا دیا۔

اسی طرح ایک اور موقع پر (شعر اس وقت مجھے یاد نہیں) میرے کہنے پر انہوں نے ''اچھلنا'' کی جگہ ''ابھرنا'' بنا دیا۔ اس ہرزہ گوئی سے خودستائی مقصود نہیں، بلکہ مدعا یہ ہے کہ باوجود صف اول کا غزل گو اور شاعر ہونے کے ان میں وہ غلط پندار نہیں تھا، جو ہمارے بعض ''اساتذہ'' کا نمایاں شعار ہے۔

میں ۱۹۳۸ء کے اوائل میں دلی سے اور اگلے برس ملک ہی سے باہر چلا گیا اور ایک لمبے عرصے تک باہر رہا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم میری غیر حاضری میں عمل میں آئی۔ اس زمانے میں جگر سے براہ راست تعلقات منقطع ہو گئے (یوں بھی وہ خط و کتابت کے زیادہ عادی نہیں تھے) البتہ سنتا رہا کہ اب بفضلہٖ انہوں نے شراب سے توبہ کر لی، اور بہت محتاط زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۱۹۵۲ء کے آغاز میں اچانک مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں منجملہ اور احباب کے محمود صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے: ''جگر آج کل یہیں کراچی میں ہیں۔'' میں نے کہا: ''چلیے، ان سے ملیں۔ شام کا وقت تھا کہ ہم دونوں ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ زینے پر چڑھتے ہوئے میں نے محمود صاحب سے کہا کہ آپ میرا نام نہ لیجئے گا، دیکھیں، پہچانتے ہیں یا نہیں۔ اوپر پہنچے تو دیکھا کہ جگر صاحب کرسی پر براجمان ہیں اور ارد گرد حسب معمول آٹھ دس آدمی کرسیوں اور مونڈھوں اور تخت پر بیٹھے ہیں۔ بجلی کی روشنی اچھی خاصی تیز تھی۔ محمود صاحب سے علیک سلیک ہوئی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ سر کو کوئی (۳۰) درجے داہنی جانب جھکا کر چندھیائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پیشانی کے بل کہہ رہے تھے کہ حافظے کے منفی اور مثبت تار تیزی سے جمع ہو رہے ہیں۔ بارے، دیر نہیں لگی۔ ''ارے، مالک رام ہیں۔'' کہہ کے کھڑے ہو گئے۔ تپاک سے معانقہ کیا اور پوچھا: ''بھائی، بہت دن کے بعد ملے۔ کیسے ہو؟'' میں نے کہا: ''صاحب، داد دیتا ہوں آپ کے حافظے کی کہ چودہ پندرہ برس کے بعد یوں آسانی سے پہچان لیا، حال آنکہ وہ عالم اور تھا اور اب اور ہے'' کہنے لگے۔ ''اس میں کسی حد تک آپ بھی معاون ثابت ہوئے۔ آخر انسان کی شخصیت اتنی جاندار تو ہو، اور وہ اتنا پائیدار اثر تو چھوڑ جائے کہ دوسرا شخص چاہے بھی، تو اسے بھلا نہ سکے۔'' چونکہ میں جانتا تھا کہ جگر تملق کے روادار نہیں اور لوگوں کی بیجا مدح ان کا شعار نہیں، اس لئے ان کی اس بات سے مجھے خوشی محسوس ہوئی۔

میں اواخر ۱۹۵۴ء سے مارچ ۱۹۵۸ء تک ہندوستان میں رہا تھا۔ ان تین برسوں میں ان سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی، یہاں دلی میں بھی اور باہر بھی۔ آخری ملاقات ۱۹۵۷ء میں میرٹھ میں حکیم سیف الدین احمد سلمہ کے مکان پر ہوئی۔ اس زمانے میں میرے ایک بزرگ میرٹھ میں مقیم تھے۔ میں ان سے ملنے کو اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں دوپہر کے کھانے پر حکیم صاحب کے ہاں مدعو تھا۔ کھانے کے بعد حکیم صاحب اور تسکین قریشی مرحوم اور میں بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ جگر صاحب بغیر کسی سابقہ اطلاع کے اچانک پہنچ گئے۔ فرمایا: ''میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے بمبئی گیا تھا۔ واپسی کے لئے جب اسٹیشن پہنچا، تو جی میں آئی کہ آپ سے بھی ملتا جاؤں۔''

بالعموم جگر کے یہاں خیال اور عمل بیک وقت ہوتا تھا۔ یعنی کوئی بات ان کے ذہن میں آئی، تو پھر اس پر فوراً بلا توقف عمل کرتے۔ چنانچہ یہاں بھی ہوا۔ حکیم صاحب سے ملنے کے خیال کا آنا تھا

کہ انہوں نے بڑھ کر کھڑکی سے میرٹھ کا ٹکٹ خرید لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حکیم سیف سے ان کے حد درجہ مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے، اور حکیم صاحب بھی ان کی خدمت کر کے دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔

وہ میرٹھ میں دو دن رکے اور وہاں سے گونڈہ چلے گئے۔ اس کے بعد پھر ان سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔

مارچ ۱۹۵۸ء میں ان پر پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ وہ اس حملے سے جانبر تو ہو گئے لیکن اس کے بعد ان کا کہیں باہر جانا قطعاً بند ہو گیا، اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ دورے پڑتے رہے۔ بالآخر اسی ''بیماریِ دل'' سے وہ ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صبح کے وقت اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے:

دل کو سکون، روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ یار کا پیغام آ گیا

جگر کی شخصیت بڑی پیاری اور دل آویز تھی۔ دل کے صاف، زبان کے کھرے، وہ کسی کے برے میں نہیں تھے۔ میں نے کبھی کسی کی غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی۔ صرف یہی نہیں، وہ دوسرے کے صریح نقص کی جگہ بھی اس کی خوبیوں کا بیان کرنے لگتے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ دوسرے کے نقص کی ایسی توجیہ کرتے کہ وہ نقص ظاہر میں کم دکھائی دینے لگتا۔ ہمارے ایک شاعر دوست عقیدے کے لحاظ سے دہریئے ہیں۔ وہ پوری بیباکی سے جا و بیجا اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور انہوں نے نظم و نثر میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ جگر سے ان سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: ''کاش ان کی زندگی کا کم از کم یہ پہلو ہی درست ہوتا۔'' کہنے لگے: ''بھائی، دلوں کے بھید جاننے والا تو خدا ہے، لیکن جس تحدی اور شدت سے وہ اپنے الحاد کا اظہار کرتے ہیں، اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں چور ہے اور وہ واقعی ایسے نہیں۔ آپ جانتے ہیں، بعض طبیعتیں کسی کے سامنے بھی سر جھکانے میں عار محسوس کرتی ہیں۔ کسے باشد، ان کے لئے کسی کی اطاعت قبول کرنا، ہتک کے ہم معنی ہے۔ وہ جدی پٹھان ہیں، اور ان کے باپ دادا کی سرکشی اور شورہ پشتی کے واقعات آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس، وہ خدا کی خدائی تسلیم کرنے میں بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں، حال آنکہ دل سے وہ ملحد نہیں۔''

اس بات کو جانے دیجئے کہ ان کی تاویل درست ہے کہ نہیں، بلکہ اصلیت یہ ہے کہ غلط ہے۔ کیونکہ میں یقین سے جانتا ہوں کہ ان کا استدلال مضبوط نہیں اور وہ صاحب بھی واقعی ملحد ہیں اور اس کے اعلان میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس کے اس قوت سے خود جگر کی سیرت اور کردار کا جو رخ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ کتنا دلکش ہے۔

اسمائے حسنیٰ میں ستار اور غفار بھی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ انسان کا مطمع نظر یہی ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو خدائی رنگ میں رنگ لے (ومن احسن من اللہ صبغتہ) تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان دونوں خدائی صفات کو بھی اپنی زندگی کا جزو بنانے کی کوشش کرے۔ اگر ہم دوسروں کے عیوب کی بجائے ان کی خوبیوں پر نظر رکھیں، تو یہ دنیا کتنی حسین بن جائے۔

بے عیب ذات خدا کی ہے۔ جگر صاحب میں بھی کمزوریاں تھیں، لیکن ان کی خوبیوں کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اور یہ تو ارشاد خداوندی ہے کہ نیکیاں بدیوں کو محو کر دیتی ہیں۔ پس میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص جگر کا دشمن ہو سکتا ہے۔ بلکہ میرا یقین تھا کہ کوئی شخص انہیں جتنا بھی قریب سے دیکھے گا اتنا ہی ان سے محبت کرے گا:

وہ حلم، وہ تواضع، وہ طرز خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو، لاکھ انسانوں کا انساں تھا

تری یاد کا عالم

(رشید احمد صدیقی)

جگر صاحب وہاں پہنچ گئے جہاں ایک نہ ایک دن ہر اس متنفس کو پہنچنا ہے جو زندگی مرض الموت میں گرفتار ہے۔ اس دنیا میں موت بھی کتنی سستی، یقینی، ہر جگہ ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی کی طرح یہ بھی ہر جاندار کے لئے کتنی ضروری ہے۔

فطرت بہت سے معاملات میں کسی نہ کسی شرط پر انسان سے خوش و ناخوش مفاہمت کر لیتی ہے، صرف موت کے مسئلے پر آج تک کسی طرح کی مصالحت پر تیار نہیں ہوئی۔ انسان اور موت کے دیرینہ رشتے و روایات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بھی یقینی ہے کہ ارضی سطح پر آئندہ بھی مفاہمت نہ ہو سکے گی۔

لیکن اگر انسان موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے تو موت بھی انسان کے ان کارناموں کو نابود یا بے نور نہیں کر سکی ہے جو موت سے زیادہ عجیب و عظیم مانے گئے ہیں۔ وہ انسان کو تسخیر بھی کر سکتی ہے۔ جب انسان روز ازل و ابدی ہونے کے ان صفات سے بھی کسی نہ کسی درجے میں متصف ہے جو خدا کے ہیں جن کے طفیل وہ اس سرزمین پر خدا کا نمائندہ اور نائب ہے اور کیا معلوم بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان خدا میں ازلی اور ابدی بھی ہے۔

موت ماموروِ مجبور ہے۔ وہ کتنا ہی چاہے۔ اپنے کو بدل نہیں سکتی۔ انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ توفیق الٰہی اور استعداد انسانی کے مطابق اپنے کو بہتر و برتر بنا سکتا ہے۔ لاانتہا ہی حد تک بہتر و برتر! موت کی یہ شکست مسلم ہے۔ اگر ہم اس طرح سوچنے کا حوصلہ کر سکیں تو محسوس ہوگا کہ انسان موت کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہے۔ ہم میں ایسے اکابر گزرے ہیں، آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے، جن کے ہاتھ میں موت کی حیثیت کھلونے کی رہی ہے اور رہے گی۔ بڑا انسان اپنی شکست میں زندہ رہتا ہے۔

لیکن اس وقت مرحوم کی وفات سے (کسی عزیز کو پہلی بار مرحوم کہہ کر یاد کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے) ان ساتھیوں اور صحبتوں کی کیسی کیسی یاد تازہ ہو رہی ہے جن سے کبھی اپنی، کبھی ان کی، کبھی دوستوں کی زندگیاں خوشی سے معمور اور امنگوں سے لبریز رہا کرتی تھیں۔ کہیں گہری، کہیں ہلکی، یہ یادیں ماضی کے ۳۰، ۳۵ سال کی وسیع دھوپ چھاؤں پر محیط ہیں۔ جگر صاحب کو میں نے ہر حال میں پایا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے بیان کرنے میں مصلحت تامل کرے۔ غفلت میں چاہے وہ بیماری سے ہو چاہے شراب سے، تنگدستی و درماندگی کا سابقہ ہو یا ثروت و شہوت کا نشہ، انسان کی زبان سے بعض ان غیر مستحسن جذبات اور خیالات کا اظہار ہو ہی جاتا ہے جو اس کے تحت شعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جگر صاحب ان تمام مراحل سے ثابت قدم گذرے۔ ادنیٰ لوگوں میں ادنیٰ درجے کی تیز و تند شراب کثرت سے پی کر مدہوش ہو جانا لیکن زبان سے کسی ناسزا کلمے کا نہ نکلنا معمولی بات نہیں ہے۔ جگر صاحب پر تھوڑی سی اور ہلکی شراب پی لینے کا اثر بہت جلد اور معمول سے زیادہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس شخص کے بطون میں کوئی چور دروازہ ہی نہ ہو جس سے کوئی ناروا خیال یا خواہش داخل ہو جائے یا اس طرح کا کوئی خیال یا خواہش پہلے سے جاگزیں ہو تو موقع پا کر باہر نکل آئے۔ یہ صفت کم لوگوں میں ملے گی!

ہندوستان اور دوسرے ممالک کے بڑے شاعر اور فن کاروں کو ہم میں سے بہتوں نے دیکھا ہو گا یا ان کے حالات سنے اور پڑھے ہوں گے باوجود اس کے کہ ان کا کلام مدتوں سے اشتیاق و احترام سے پڑھا سنا اور سراہا جاتا ہے ان میں ایسے بھی ہیں جن کی سیرت و شخصیت جہاں تہاں سے داغدار ہے۔ لیکن ان شعراء اور فن کاروں کی عظیم الشان شخصیت کی منزلت اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ ان کی سیرت کی خامیوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ ہمارے کتنے بڑے شاعروں کی بعض کمزوریوں کو اجاگر کرنے کی کیسی کیسی کوشش کی گئی، اور اب بھی کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑائی میں مطلق فرق نہ آیا۔ البتہ یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ شاعر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے قابو میں چلا گیا یا بعض تقاضوں کے پیش نظر اس نے ان صلاحیتوں کو اپنے قابو میں رکھا۔ بصورت اول وہ ہمدردی کا، بصورت دیگر ستائش کا مستحق ہوتا ہے۔

ان کے مقابلے میں یہاں اپنے ان چار غزل گویوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اب تک اس صدی میں جدید اردو غزل کی خوبصورت مستحکم اور ایک طور پر کثیر المقاصد، عمارت کے چار عظیم معیار مانے جاتے ہیں۔ یعنی حسرت، اصغر، فانی اور جگر۔ ان کا شعری یا سکونتی تعلق کسی "دلی صفاہان یا سمرقند" سے نہیں تھا۔ ذرا دور سے اور بلندی پر جا کر دیکھیں تو یہ معلوم ہو گا کہ فیضان، سرسید، ان کے رفقائے کرام اور علی گڑھ تحریک کا ہے۔ علی گڑھ نے شعراء ادب کے جغرافیائی دبستان ختم کر دیئے۔

ان چاروں نے نہ تو کوئی مینوفیسٹو شائع کیا، نہ زندگی و ادب کے اسرار و معارف کو الم نشرح کرنے کے لئے کوئی عالمی کانفرنس منعقد کی۔ نہ تشہیر و تبلیغ کا کوئی ادارہ یا محاذ قائم کیا، نہ جلسے جلوس سے کوئی واسطہ رکھا۔ صرف جہاں تہاں مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہے۔ ایسے مشاعروں میں بھی جہاں شعراء اور سامعین دونوں کی آبرو خطرے میں رہتی ہے۔ بایں ہمہ انہوں نے اردو غزل گوئی کی اس طرح تطہیر و توسیع کی اور اس کو ایسا ترفع بخشا اور زندگی و ادب کے صالح تقاضوں کے پیش نظر اس میں توانائی اور دل آویزی پیدا کی کہ اس کے سامنے اردو شاعری کی دوسری اصناف ماند پڑ گئیں۔ یہ کم عجیب بات نہیں ہے کہ یہ شعراء اپنی اعلیٰ تخلیقات سے بھی نہیں بلکہ اعلیٰ سیرت و شخصیت کے اعتبار سے کم و بیش نصف صدی تک باوجود طرح طرح کے موانع کے یکساں طور پر ممتاز و محترم رہے!

غزل کی یہ مقبولیت موسمی، مقامی یا اتفاقی نہ تھی، جیسی فلمی گانوں کی ہوتی ہے جو بالعموم ادنیٰ طبقے کے نوجوانوں، ہر طبقے کی عورتوں اور گلی کوچے میں پھرنے والے کسمپرس نادان بچوں یا ان طالب علموں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں جو خاندان کی روایات سے بے بہرہ، سوسائٹی کی ذمہ داریوں سے نا آشنا ماحول کی خرابیوں کے شکار اور اچھی تعلیم و تعلیم گاہوں کے فیض سے محروم ہوتے ہیں۔ ان چار درویشوں نے سیاست کے سستے نعروں سے بھی اپنی دکان نہیں سجائی تھی لیکن ان کا کلام خواص و عوام کے دلوں میں گھر کر لیتا تھا اور اثر دکھاتا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں جب طبائع پورے طور پر سیاست اور سائنس کی گرفت میں آ چکی تھیں اور پرانی قدروں کا احترام برائے نام باقی رہ گیا تھا، جب دور و نزدیک یکساں ہو گئے تھے، غزل کو ایسی آبرو بخشا کہ وہ دوسرے ملکوں کے شعر و ادب کے سامنے اپنا سر اونچا رکھ سکے اور ہم میں جو صدیوں سے محکوم و منکوب تھے، احساس کمتری نہ پیدا ہونے دے، ان شاعروں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کا یہ تصرف اس صنف کلام پر تھا جو بہت تنگ و محدود اور بعض حلقوں میں نامسعود سمجھا جانے لگا!

مجھے جگر صاحب کے خاندان کا حال نہیں معلوم، کتنی تعلیم تھی، کس بزرگ کے مرید یا کس سلسلہ طریقت یا مسلک سیاست سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح کی باتوں سے کسی کا علم نہیں۔ جس سے جتنا قریب ہوتا ہوں اتنا ہی اس کے بارے میں ان باتوں کی کھوج لگانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ مرحوم کی رحلت سے آج بڑا پرانا گہرا اور مخلصانہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ عمر کی جس منزل پر ہوں وہاں اس طرح کے رشتے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔ فطرت کا یہی تقاضا ہے، لیکن کیا کروں، فطرت کے اس طرح کے تقاضے تسلیم کرنے سے عاجز و قاصر رہتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ میرے اس تصور میں اور کتنے بدنصیب شریک ہوں گے؟

مدت حیات کا حساب کتاب سال اور ماہ کے گزرنے سے نہیں کرتے، عزیزوں کی مفارقت

سے بھی کرتے ہیں۔ وہ اٹھا لئے جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ختم ہوگئی۔ عمر چاہے جہاں تک پہنچے، عمر پانے کو زندہ رہنا نہیں کہتے۔ زندگی اپنی زندگی سے اتنی عبارت نہیں ہوتی جتنی عزیزوں کی زندگی اور خوشی سے ہوتی ہے۔ یہ نہیں تو زندہ رہنا اور نفس کے مطالبے پورے کرتے رہنا ایک مسلسل بے غیرتی اور بڑھتی ہوئی تنہائی اور تاریکی ہے، جس کو نہ چھپا سکتے ہیں، نہ اس سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے حق بجانب بھی نہیں قرار دے سکتے۔

جگر صاحب میرا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اصغر گونڈوی مغفور کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے لئے وہ اتنا اخلاص واحترام ملحوظ رکھتے ہوں جتنا میرے لئے۔ اصغر صاحب سے تو ان کی عقیدت بندگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ شاید ہی وہ کسی اور کے یہاں اس محویت و مسکنت کے عالم میں پائے گئے ہوں جتنا اصغر صاحب کے ''حضور'' میں۔ اصغر صاحب بھی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ جگر صاحب کی مجھ سے وابستگی یہیں سے شروع ہوئی تھی جس کو آخر وقت تک انہوں نے جس طرح نباہا اس کا خیال کرتا ہوں تو دل عجیب عجیب طرح سے بے قرار ہونے لگتا ہے!

جگر صاحب کے اس خلوص ومحبت کو میں نے نباہنے کی برابر کوشش کی، لیکن مرحوم ان غیر معمولی شریف اور فیاض انسانوں میں تھے جن کی مسلسل ''نوازشہائے پیدا و پنہاں'' کا ساتھ دینے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ روپے، پیسے مال و متاع سے کوئی سلوک کرے تو اس کا بدلہ ادا کر دینا آسان ہے، لیکن جو شخص (وہ جگر صاحب جیسا شخص) محبت واحترام کی بیکراں نعمتوں سے کسی کو بہرہ مند کرے اور رکھے اور کسی وقت غافل نہ رہے، اس سے کون عہدہ برا ہو سکتا ہے! جگر صاحب کے پاس جو دولت تھی اور جسے وہ مجھ پر بے دریغ صرف کرتے تھے اس سے مبادلہ کے لئے میری ہر دولت ناقابل التفات تھی۔

جگر صاحب کی محبت بھی عجیب محبت تھی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ میں ان کی مدارات میں کوئی حصہ نہ لوں۔ اس خیال سے کہ مجھے زحمت نہ ہو۔ اس سبب سے ایک طور پر میں جگر صاحب سے اتنا اور اس طرح قریب نہ ہو سکا کہ ان کی ذہنی واردات اور رنج وراحت کے محرکات سے براہ راست اور پورے طور پر واقف ہو سکتا، اس سے شرمندہ ہوں۔ عقیدت ومحبت کا پورے طور پر مستحق نہ ہونا، لیکن اس کا مورد رہنا شریف آدمی کے لئے اتنا ہی باعث خلش رہتا ہے جتنا ایک گناہگار کی لئے جو اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں بے نقاب نہ ہو جائے۔ یاد نہیں آتا انہوں نے اپنی تکالیف یا نجی دشواریوں کا کبھی کسی عنوان مجھ سے تذکرہ کیا ہو۔ مشاعروں میں ان کے کلام کو جس خلوص سے سراہا جاتا اور خود ان کی پذیرائی جس عزت ومحبت کے ساتھ کی جاتی اس کا ذکر بھی کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ ایسے شعراء سے بھی واقف ہوں جن کے کلام سے شاعروں میں دھوم مچ جاتی اور ان کا کلام سننے کے لئے لوگ سراپا شوق وانتظار ہوتے، لیکن فرق یہ ہوتا کہ سامعین جگر صاحب موجودگی سے اور ان

کی دیکھ کر جتنے خوش ہوتے اور فخر کرتے دوسروں کی موجودگی سے نہیں۔ آخر آخر میں معذوریوں کے سبب سے وہ اپنا کلام اچھی طرح سنا بھی نہیں سکتے تھے، جب بھی لوگ خوش ہوتے کہ جگر صاحب نے ان کے لئے مشاعرے میں شرکت کی زحمت گوارا کی۔ انہوں نے جگر صاحب کو دیکھ لیا اور ان کا کلام ان کی زبان سے سن لیا۔ یہ امتیاز اس صدی میں اردو کے شاید کسی غزل گو کو نصیب نہیں ہوا۔

جگر صاحب سے لوگوں کو جیسے مذہبی ارادت وعقیدت ہو۔ میر انیس اور اقبال سے اس طرح کی شیفتگی تو سمجھ میں آتی ہے، جگر صاحب سے اس شغف کو کس چیز پر محمول کروں۔ ان کے یہاں مذہب، سیاست، اخلاق، فلسفہ، تصوف، طنز وظرافت کسی کو بھی تو دخل نہیں۔ ابتدائی عہد کے کلام سے قطع نظر عشق وعاشقی کا بھی وہ رنگ نہیں ملتا جو عام طبائع کے لئے باعث کشش ہوتا ہے۔ پھر اس کے سوا اور کیا کہوں کہ ان کے کلام ہی میں ''ماورائے سخن ایک بات'' نہ تھی، ان کی شخصیت میں ماورائے شخص بھی ایک بات تھی۔

جگر صاحب بحیثیت مہمان تشریف لاتے تو بیک وقت کتنی خوشگوار باتوں کا احساس ہونے لگتا، گویا کوئی بھولی ہوئی لطیف خوشبو آ گئی ہو۔ زندگی کی نعمتیں اچھی، اس کے مصائب گوارا اور آلودگیاں قابل احتراز معلوم ہونے لگتیں۔ جگر صاحب کے چاہنے والے دو ایک دن پہلے سے گھر کا چکر لگانے لگتے تھے۔ وہ آ جاتے تو دن رات ان کو گھیرے رہتے۔ جگر صاحب کے اس ''حلقے'' یا ''دربار'' میں میں کبھی مخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے جانتے تھے۔ اس لئے جب ہجوم ختم ہو جاتا تو صرف یہ اطلاع بھجوا دیتے کہ ملاقاتی رخصت ہو گئے۔ میں پہنچتا تو جیسے سر سے پاؤں تک فرط تکریم وتشکر سے جگمگانے لگے ہوں۔ بے اختیار کھڑے ہو جاتے۔ اسی بے اختیار سے فوراً بیٹھ جاتے، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور آس پاس کی چیزیں بے ضرورت ادھر ادھر رکھنے لگتے۔ بیٹھ جاتا تو وہ بھی بیٹھ جاتے اور مسکرانے لگتے جیسے اپنے اس مسکرانے کی شمیم وشبنم کے تخت رواں پر مجھے بٹھا دینا چاہتے ہوں۔

جگر صاحب شکل وصورت کے اچھے نہ تھے، لیکن اس وقت ان کا مسکرانا اور کبھی رہ رہ کر ہنس پڑنا اور جلد ہی کچھ کہنے لگنا تاکہ میں ان کے اس اضطراب وانبساط کو جان نہ سکوں۔ ایسا دل نشین اور قابل فخر واحترام محسوس ہوتا کہ میں اس وقت اس کو کسی تشبیہ واستعارے سے بھی واضح نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اس کو کسی حسین دوشیزہ یا معصوم سے معصوم تندرست بچے کے مسکرانے اور ہنسنے سے بھی تشبیہ دینا ناکافی سمجھتا ہوں۔ جگر صاحب اچھی صورت کے ہوتے تو شاید اتنے اچھے نہ معلوم ہوتے۔ جگر صاحب ہی پر موقوف نہیں کوئی اور بھی ہوتا تو اتنا دلاویز نہ معلوم ہوتا۔ سیرت کا حسن دنیا کے تمام دوسرے حسن سے افضل ہوتا ہے۔ یہ بات جتنی سچی اور پکی ہے، افسوس ہے کہ اتنی ہی دیر میں اور کبھی کبھی وقت نکل جانے پر اس کا احساس اور یقین ہوتا ہے۔

جگر صاحب جتنے مذہبی آدمی تھے اتنے ہی اخلاقی بھی! ایسا ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے لوگوں کے لئے جو اصلاً نہیں اصطلاحاً مذہبی ہوتے ہیں۔ ہر مذہبی آدمی اخلاقی آدمی نہیں ہوتا۔ خودغرض یا ناواقف مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں مقید رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علیحدہ خانوں میں رکھا نہیں جا سکتا۔ اس لئے حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اس کا آوردہ و پروردہ ہے۔ اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے۔ مذہب سے علیحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب، عورت بغیر شوہر ہے!

خودغرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ گرفت سے بچنے کے لئے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں، جس کی سرحد پھاند کر تہذیب کی قلمرو میں آ جاتے ہیں۔ وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دور نہیں رہ جاتیں۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذہب کے تقاضوں سے بچنے یا مذہب کی بلندی سے اترنے کے لئے جو زینے ہیں ان میں پہلا اخلاق پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست قومیت اور تجارت ہیں۔ موخر الذکر تین کا نامسعود اتحاد آج عالم انسانیت کا سب سے بڑا آشوب ہے!

مذہبی ہونے کا علمی و کتابی تصور واضح کرنے کے لئے خاص طرح کی لیاقت درکار ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ اپنے طور پر پابندی کر پاتا ہوں یا نہیں کوئی ایسی بات سننا اور دیکھنا گوارا نہ کر سکے جو خدا اور اس کے رسول کے خلاف کسی کے منہ سے نکلے یا جس سے شعائر اسلام کی سبکی ہوتی ہو۔

بہت دنوں کی بات ہے علی گڑھ میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ احباب کی ایک صحبت میں ہر طرح کی باتیں بے تکلفی سے ہو رہی تھیں۔ ایک دوست موجود تھے جو مسلمان کہلاتے تھے لیکن خدا رسول اور احکام دین کے قائل نہ تھے۔ ایک دوسرے صاحب بھی تھے جو ہم میں اپنی اول جلول حرکتوں اور بھولے پن کے لئے باعث تفریح رہا کرتے تھے۔ گفتگو کے دوران پہلے کی زبان سے مذہب کے بارے میں کچھ استہزائیہ کلمے نکل گئے۔ باؤلا برافروختہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا توبہ کرو اور معافی مانگو، نہیں تو تمہاری خیر نہیں! انہوں نے سٹ پٹا کر کہا تم بھی تو اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ جوش میں آ کر کچھ رو کر باؤلے نے جواب دیا، میری بات اور ہے خدا رسول تو میرے ماں باپ بھائی بہن ہیں۔ میرے جو جی میں آئے گا کہوں گا، تیرا تو ان سے کوئی رشتہ نہیں۔ تو میرے سامنے میرے ماں باپ بہن بھائی کی کیسے توہین کر سکتا ہے۔

جگر صاحب کا علی گڑھ اور الہ آباد کا وہ زمانہ یاد ہے جب وہ زیادہ تر مخمور اور بدحال رہتے تھے،

لیکن دین یا ائمہ دین کے خلاف کوئی فقرہ کان میں پڑ جاتا تو بدمستی کا پورا زور اس پر صرف کر دیتے جس کی زبان سے وہ کلمہ نکلا ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ان پر شراب کے نشے کے بجائے کوئی اور عالم طاری ہو گیا۔ مذہب ان کی نہاد میں تھا جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی اس طرح کر جاتے کہ بڑی نزاکت کا سامنا ہو جاتا۔ اس سے جگر صاحب نے نقصان اٹھایا ہو یا نہیں وہ لوگ فائدہ اٹھا لیتے تھے جن کی نیتوں میں فتور ہوتا۔

کہیں کا سفر کتنا ہی ضرور ہوتا، علی گڑھ سے گزرتے تو وہ ایک دن میرے ساتھ ٹھہرنے کی گنجائش نکال لیتے۔ حج سے واپس آ چکے تھے۔ ایک دن سہ پہر میں چائے پی رہے تھے۔ حسب معمول کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے فرمانے لگے، مدینہ طیبہ میں ایک دن چائے کی پوری پیالی اوپر آ رہی لیکن کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اتنا کہہ کر چپ ہو گئے حاضرین میں سے ایک صاحب بول اٹھے، جگر صاحب فکر شعر میں غرق رہے ہوں گے خبر نہ ہوئی ہو گی۔ جگر صاحب نے جواب دیا، کیا کیجئے گا آپ کو اس طرح کی تعبیر کی توفیق ہوئی۔ پھر ہنس پڑے اور بولے، پرانا زمانہ کیا برا تھا جب ہر کس و ناکس کو آزادی نہ تھی، اس کے لئے معتمد اور منتخب ہی لوگ ہوتے تھے۔

جگر صاحب پر بعض زمانہ بڑی سختی کا گزرا ہے۔ مالی دشواریوں کے سبب سے پریشان رہتے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے کسی اور سے کیا ہو یا نہیں مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ سیرت میں کہیں کوئی خامی رہ جاتی ہے، تو تنگ دستی میں بالضرور اور بڑی شدت سے ابھر آتی ہے۔ معمولی اشخاص کا تو ذکر کیا وہ تو ذرا سے فشار سے بکھرنے لگتے ہیں، اچھے اچھوں کو اس منزل میں ڈگمگاتے دیکھا ہے۔ ایسے زمانے میں بھی جگر صاحب اچھا کھاتے تھے، اچھا پہنتے تھے۔ اچھی طرح خود رہتے تھے، اپنے مہمانوں کو رکھتے تھے۔ کسی پر برا وقت آ پڑتا تو اپنے اوپر سختی جھیل کر اس کی مدد کرتے۔ دور ابتلا میں بھی لوگ ان کو طرح طرح سے دھوکہ دیتے اور زیر بار کرتے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو دوسروں نے اتنا لوٹا کھسوٹا ہو جتنا جگر صاحب کو۔ اور ایسے لوگ تو شاید ہی ملیں جو اپنے اس طرح لوٹے کھسوٹے جانے کو خاطر میں نہ لاتے ہوں۔

جگر صاحب کسی کی درخواست کو رد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ درخواست کرنے والا جھوٹا ہے۔ آخر آخر میں تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ لوگ مانگنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ جس کا جب جی چاہا جس چیز کو چاہا لے لیا۔ جگر صاحب یہ سب دیکھتے لیکن کسی طرح کا خیال نہ کرتے۔ ایک بار میں نے ذرا تلخ ہو کر پوچھا، جگر صاحب آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ مسکرا کر اور عجیب معصوم انداز میں فرمانے لگے، کیا کروں، نہ کسی سے انکار کر سکتا ہوں اور نہ اس کو شرمندہ دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے ذرا کم شریفانہ انداز میں کہا، اس کے بعد آپ یہ بھی چاہتے ہوں گے کہ میں آپ کی یا

اس کی درازی حیات کی دعا بھی مانگا کروں؟ بڑے مزے سے ہنسے اور جگر صاحب کب نہیں مزے سے ہنستے تھے!

بڑے باوضع آدمی تھے۔ جس سے خلوص کے مراسم ہو گئے تمام عمر کے لئے اس پر مہر لگ گئی۔ علی گڑھ میں تین چار گھرانے ایسے تھے جن سے عزیزانہ اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ آتے تو چاہے کتنے ہی موانع ہوں ان کے گھر ضرور جاتے۔ وہ جس طرح کی فرمائش کرتے قبول کر لیتے خواہ اس میں ان کو کتنی ہی تکلیف ہوتی۔ جہاں جاتے اہتمام سے جاتے۔ نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، کبھی تحفے کے طور پر کچھ لے کر۔ مدت دراز سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ آخر آخر میں جب صحت خراب رہنے لگی تھی تو میں اس طرح کی دید و بازدید سے روکتا۔ ہر طرح کا اہتمام کرنے کے بعد پانوں کی ڈبیا بٹوا لے کر کسی کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتے اور اتفاقاً میں نکل آتا تو ان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جیسی کوئی بچہ قصور کرتا ہوا پکڑ لیا جائے۔ منع کرتا تو فوراً مان جاتے وہ بھی اس طرح جیسے واقعی مان گئے ہوں۔ اندر آ جاتا تو تھوڑی دیر بعد اسی اہتمام کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہو جاتے جیسے بچوں کو کسی کام سے منع کیجئے تو خوش و ناخوش اس وقت تو مان جائیں گے لیکن موقع ملتے ہی وہی کریں گے جو کرنے والے تھے۔ جگر صاحب کا بچوں کا سا یہ انداز بڑا پر لطف معلوم ہوتا تھا، بالخصوص اس وقت جبکہ بعد میں بچوں سے بھی زیادہ معصوم یعنی اپنے انداز میں اس کی ٹوٹی پھوٹی معذرت کرتے!

جگر صاحب جانتے تھے کہ بطیب خاطر میں کسی شاعر سے شعر سنانے کی فرمائش نہیں کرتا اور اس بات سے اور زیادہ بدحظ ہوتا ہوں کہ خود شاعر بے تکلف ہو کر یا بادنی اشتعال جس کا مرتکب بھی اکثر وہ خود ہوتا شعر سنانے لگے! اسے آپ میری بدتمیزی پر محمول کریں، یا شاعر کی، یا دونوں کی کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ بات یہ ہے کہ بعض صوری یا معنوی اعتبار سے (صوری زیادہ معنوی برائے نام) شعر سننے اور داد دینے کے لئے بالعموم میرا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ پورا مصرع درکنار اس کا جزو تک اٹھانے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں الفاظ یا اعراب وغیرہ کا الٹ پھیر نہ ہو جائے۔ جب شاعر دوسرا مصرع پڑھتا ہے اور اکثر بار بار اور دیر تک پڑھتا رہتا ہے پہلا بھول چکا ہوتا ہوں، اس لئے پورے شعر کی داد دینے کے لئے طرح طرح کے سامعین کا منہ تکنا پڑتا ہے اور جلد سے جلد فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کون حلوے مانڈے کی غرض سے آیا ہے، کون میزبان کو ایصال ثواب کرنا چاہتا ہے، کون شاعر کو ضرب شدید یا خفیف پہنچانے کا تہیہ کر رہا ہے اور کون مجھ کو محفل سے باہر نکل جانے کا چیلنج دے رہا ہے۔ اس کے بعد کہیں میرا منہ اس قابل ہوتا ہے کہ شاعر کو دکھا سکوں۔ دوسری اور سب سے بڑی آزمائش یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی میں شعر سے متاثر ایک طرح ہوتا ہوں لیکن داد دوسری طرح دینی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ اس کشمکش میں کہیں مقدم موخر نہ ہو جائے! چنانچہ جہاں کہیں

اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ شاعر اور اس کے کلام دونوں کی کرامات پر سب سے پہلے مجھے ایمان لانا پڑے گا اور اعلان بھی کرنا پڑے گا میں داد دینے والا ساتھ لے جاتا ہوں جس کی مجھے خاصی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ داد دینے والے سے یہ طے رہتا ہے کہ وہ اس طرح داد دے کہ اگر میں دینے لگوں تو کوئی سن نہ پائے یا دینے والا ہوں تو ہمت نہ پڑے۔

غالباً فروری ۱۹۵۹ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ ''آتش گل'' پر جگر صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملا تھا۔ جیسا کہ قاعدہ بنا رکھا تھا دلی سے واپسی پر میرے ہاں ٹھہر گئے۔ یہ ان کا علی گڑھ میں آخری قیام تھا۔ صحت کافی گر چکی تھی لیکن طبیعت بشاش تھی۔ معمولات میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ دوستوں کی آمد و رفت، مقررہ گھرانوں پر حاضری، طالب علموں سے ملاقات، بچوں سے تفریح بدستور تھی۔ صبح کا وقت تھا، صحن میں دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خلاف معمول مجھے اندر سے بلوا بھیجا۔ آیا تو جگر صاحب کو غیر معمولی طور پر شگفتہ پایا۔ جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا مسکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہی سر سے پاؤں تک شوق و شیفتگی کا عالم۔ کچھ رکے۔ پھر بے اختیار بول پڑے آج میں نے آپ کو تکلیف دینے کی جرات کر ہی ڈالی۔ میں نے کہا، جگر صاحب، اچھا کیا مجھے بھی تو یہ کہنے کا فخر حاصل ہوا، کہ آپ نے بلا بھیجا۔ خوش ہو گئے۔ میں بیٹھ گیا۔

جگر صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ میری طبیعت کچھ دنوں سے خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن انہوں نے آج نہ پہلے کبھی یہ پوچھا کہ میں کیا ہوں، کیا کرتا ہوں، کیا کرنا چاہئے، بچے کہاں ہیں، کیا کرتے ہیں، کس کی شادی ہوئی ہے، کس کی نہیں، کون پاکستان میں ہے، کون ہندوستان میں، کتنے بے روزگار ہیں، کتنے نہیں، مشیت الٰہی یا حکومت کی پالیسی کیا تھی، جس پر مجھے صبر کرنا چاہئے یا بغاوت، جیسا کہ اس طرح کی باتیں ملاقات کے وقت کے لئے لوگ عموماً حفظ کر رکھتے ہیں۔ وہ صرف یہ دیکھ کر اس طرح خوش ہو جاتے جیسے یہ تمام باتیں پوچھ لیں اور مطمئن ہو گئے اور مجھے مبارکباد دے ڈالی۔

یاد نہیں آتا کہ کون کون سی غزلیں سنائیں۔ اس صبح کو انہوں نے جس درد اور وارفتگی سے اپنا کلام سنایا اس سے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آج میری تمام عمر کی محبت کا صلہ دینے کی کوشش کر رہے ہوں جس سے بڑا صلہ ان کے پاس دوسرا نہ ہو۔ جیسے سب سے بے تعلق ہو کر میرے لئے اپنے کو اپنے ہی نغمے میں ضم اور ختم کر دینا چاہتے ہوں! سنانا ختم کرتے ہی مسکرا کر اور بات چھیڑ دی۔ جیسے یہ سنانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور یہ سب محض اس احتیاط کے پیش نظر کہ اگر اس کا کوئی غمگین اثر مجھ پر ہوا تو جلد سے جلد زائل ہو جائے۔

اس وقت یہ بحث پیش نظر نہیں ہے کہ ہمارے شعراء مشاعروں میں لحن سے پڑھتے ہیں تو اچھا

کرتے ہیں یا برا۔ یہاں تو صرف جگر صاحب کے پڑھنے کا سوال ہے۔ بعض اصحاب، مرحوم کے کلام کی تاثیر کو کبھی کبھی ان کی خوش الحانی پر محمول کرنے لگتے ہیں۔ لیکن مجھے ان کی آواز اور پڑھنے کا انداز ہمیشہ ان کے کلام کا جز معلوم ہوئے۔ مرحوم کے کلام اور پڑھنے کے انداز و آواز میں غیر معمولی ہم آہنگی ملتی تھی جیسے

ع   بے جام ظہور بادہ نہیں، بے بادہ فروغ جام نہیں

یاد آتا ہے کہیں میں نے اس طرح کی بات لکھی ہے کہ اصغر گونڈوی مرحوم کے کلام کو پڑھتا ہوں تو اصغر صاحب سامنے آجاتے ہیں اور اصغر صاحب کا تصور کرتا ہوں تو ان کا کلام یاد آنے لگتا ہے۔ جگر صاحب کا کلام ان کی آواز ہے اور ان کی آواز ان کا کلام! کہیں یوں بھی سنا ہے کہ آواز کلام اور کلیم کو ایک ہی مانتے ہیں!

جگر صاحب کے جذبات تیز وتند تھے، اسی اعتبار سے وہ سریع الحس بھی تھے۔ کوئی واردات ہو خارجی یا داخلی، دور ہو یا نزدیک، شخصی ہو یا اجتماعی اسے بہت جلد اور بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہ بات دوسرے شاعروں میں بھی مل سکتی ہے، لیکن اکثر اس فرق کے ساتھ کہ جذبات کتنے ہی تیز وتند ہوں جگر صاحب کے شریفانہ شاعرانہ تصرف سے وہ اپنی قباحتیں اور کثافتیں کھودیتے ہیں، زور قائم رہتا ہے اور اثر بڑھ جاتا ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ شاعر میں اکثر اس طرح بھی امتیاز کرتے ہیں کہ کس کے یہاں کون چیز کیا بن گئی۔ اعلیٰ اسفل میں جا گرا یا اسفل کو اعلیٰ کی طرف رہبری ملی۔

شاعر کے ظرف و ذوق کا صحیح اندازہ لگانے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ عورت اور متعلقہ جذبات کا کس طرح اظہار کرتا ہے۔ وہ عورت کو جسم کی لذت کا صرف ایک وسیلہ سمجھتا ہے یا اس کو ایک قدر اعلیٰ اور ایک ذمہ داری بھی مانتا ہے۔ جگر صاحب کے محرکات شعری میں عورت کا عمل دخل کم نہیں ہے، لیکن اتنا ہی عورت کا احترام اور اس سے عشق کا ارتقاع بھی ملتا ہے۔ یوں بھی وہ کسی جذبہ فکر یا خیال کو مرتفع کیے بغیر پیش کرتے۔ شاعری اور شاعر دونوں کی بڑائی اسی میں ہے۔ بعض شاعر ہر طرح کے جذبات وخیالات کو جوں کا توں پیش کردینا شاعری کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی بھول یا بددیانتی ہے۔

ضمناً یہاں ایک بات کا اظہار کردینا چاہتا ہوں۔ ہمارے شعراء اور افسانہ نگار ایسے ہیں جن کی فنی چابک دستی میں شبہ نہیں، لیکن وہ اپنے جذبات و واردات کو ظاہر کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور اس کو اپنی خامی نہیں شاعری کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ شہوت، غصہ، نفرت، خودنمائی کے جذبات بڑے منہ زور ہوتے ہیں اور کم وبیش ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ حیوان اور انسان میں فرق بھی ہے کہ حیوان ان پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ لیکن انسان ان کو بس

ہی میں نہیں رکھتا بلکہ ان کو بہتر مقاصد اور بہتر شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ محسوس تو حیوان ہی کی طرح کرتا ہے، لیکن اظہار انسان کی مانند کرتا ہے جو محسوس کرے، اسی کو ظاہر کرے۔ قرین فطرت یقیناً ہے، قرین انسانیت نہیں ہے۔ اپنی خامی کو شاعری کا تقاضا سمجھنا نالائقی کی علامت ہے۔ انسان کا انا الحق کہنا ایسا غلط نہیں ہے۔ تلاش معرفت میں بعض فقرا یا صوفیاء پر یہ واردات طاری ہوئے ہیں، لیکن ان واردات اور ان کے اظہار کو دلیل کم نظر و کم ظرفی قرار دے کر کہنے والے کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سوا الہام کے جو خدا کی طرف سے صرف اس کے رسول پر نازل ہوتا ہے اور رسول اس کو بجنسہ امت کو پہنچا دیتا ہے، کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو شاعر کے دل میں آتا ہو اور وہ اس میں حسب ضرورت تصرف کے بغیر ہم تک پہنچا دیتا ہو۔ یہ تمام تر شاعر کے ذوق اور ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس خیال کو کس مقصد سے کس شکل میں ہم تک پہنچاتا ہے۔ اگر وہ سرشت کا اچھا، فن سے واقف، زبان کا رمز شناس ہے، کہنے کا سلیقہ رکھتا ہے اور صحیح موقع و محل رکھتا ہے تو اس کی بات موثر مفید اور دیرپا ہوگی۔ اگر اس میں یہ صفات نہیں ہیں تو یہ شاعری نہیں کچھ اور ہوگی جس کو آپ شاعر کی نارسائی یا نالائقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شاعر ڈاک خانہ، تار گھر، ریڈیو نہیں ہوتا جو صرف خبر رسانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ فنکار اور معلم کی حیثیت سے حسن، صداقت کا داعی ہوتا ہے۔ اردو شاعروں کی فہرست پر نظر ڈالئے اور ہر شاعر کے کلام کی عمر اور انجام کو اس پیمانے سے ناپ لیجئے۔ یوں دنیا میں کوئی نالائق یا نالائقی ایسی نہیں ہے جس کے لئے کوئی سند جواز نہ تصنیف کی جا سکے۔

جگر، اصغر اور فانی ان سرآمد غزل گویوں میں ہیں جن کا کلام ان مخصوص صحبتوں میں بھی بے تکلف پڑھا اور لطف سے سنا جا سکتا ہے جہاں رند، پارسا، خورد و بزرگ، ماں، بیٹیاں، بہن، بہو، بیوی بیک وقت موجود ہوں اور محفل ثواب کمانے کے مقصد سے نہیں تفریح و انبساط خاطر کے لئے منعقد کی گئی ہو۔ آج اس طرح کی بات کسی شاعر کی بڑائی میں بیان کرنا خود مجھے اپنے کانوں کو اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے اسے مضحکہ خیز بھی سمجھیں تو کیا عجب! ان میں جگر صاحب کو ایک گونہ اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ اپنے ان ساتھیوں سے زیادہ جذبات کی بعض نزاکتوں کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔

فانی کا جہان ہی دوسرا ہے۔ ان کے ہاں اس طرح کی دشواریاں پیش نہ آتی ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ وہ سرتاپا الم ہیں لیکن اتنے غمگین شخص نہیں ہیں جتنے غمگین شاعر ہیں۔ غم کا ذکر انہوں نے جس رکھ رکھاؤ سے کیا ہے اس سے غم، غم نہیں رہا ایک انداز فکر، آرٹ یا عبادت بن گیا۔ ان کے ہاں غم کا انداز بین و بکا کا نہیں، عرفان و ایقان کا ہے۔ بڑھی ہوئی داخلیت کے سبب سے کہیں کہیں وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے بھی کام لیتے ہیں لیکن یہ شعوری اور شاعرانہ ہوتا ہے اس لئے ذوق پر بار نہیں ہوتا،

اکثر اس کی سیرابی کا باعث ہوتا ہے۔

اصغر کے لہجے میں جیسی شائستگی و شگفتگی، جذبات و افکار کی جو تازگی و تہذیب ملتی ہے، نیز شستہ منتخب اور مترنم الفاظ و ترکیبیں جو مفہوم اور معانی کو زیادہ حسین و دلنشین کر دیتی ہیں، بجائے خود ایسے عوامل ہیں جو غیر صالح خیالات و جذبات کے اظہار کے منافی ہیں۔ اصغر کے یہاں عورت، تصوف، عاشق اور سیاست کا وہ ''روز مرہ اور محاورہ'' نہیں ملے گا جسے عام طور پر دوسرے شعراء کبھی کبھی ''رسم پابندی اوقات'' کے طور پر کام میں لاتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں ان سب کے بڑی دلکش جانی پہچانی، اکثر چونکا دینے والی تصویریں اور تعبیریں ملیں گی! ان پر اور ان کی شاعری پر خود ان کا شعر گواہ ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ باد صبا چمن میں غنچہ و گل کو کس مزے سے چھیڑتی ہے۔ لیکن اس کی پاس دامانی پر حرف نہیں آتا!

معتبر شاعر وہ ہے جو تمام علوم ''سینہ و سفینہ'' کے اسرار و رموز سے کما حقہ واقف ہو یا نہ ہو، اس سے آشنا ہو کہ فلاں خیال، جذبہ یا فکر پر کس علم کا عمل مناسب حال ہوگا۔ مثلاً کسی خاص خیال کو فنون لطیفہ، فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، مذہبیات، کیمیا، طبعیات وغیرہ میں سے کسی علم و فن یا علوم و فنون کے رمز و رعایت کی، و سے سلجھا کر توانائی دے کر اور سنوار کر سامعین تک پہنچایا جائے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مفید و موثر ہو۔ یہاں اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شاعر علم و فن سے واقف ہو (سب سے زیادہ تو اسے اپنے فرض اور فن سے واقف ہونا چاہئے) کہنا صرف اتنا ہے کہ جو علوم انسان کو فطرت کا راز سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں اپنے اپنے طور پر مدد پہنچاتے ہوں، شاعر کو ان کا علم ہونا چاہئے۔ اس کو شاعر کے ان علوم پر قدرت رکھنے سے تعبیر نہیں کریں گے، نہ اس کا مطالبہ کریں گے بلکہ ان علوم پر اس کا شاعرانہ تصرف قرار دیں گے اقبال اس رمز سے خوب واقف تھے، غزل گوئی میں کسی حد تک اصغر مجھے ایسے معلوم ہوئے۔

حسرت عشق مجازی کے پہلو اور بے ساختگی کے انداز کو پیش پیش رکھتے ہیں۔ حسرت عشق مجازی کے مزاج داں اور محتسب دونوں تھے۔ اتنی حسین رچی ہوئی جیتی جاگتی خارجیت صف اول ہی کے شعراء میں ملے گی۔ خارجیت کا نباہنا داخلیت کے نباہنے سے زیادہ مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے۔ میرے نزدیک خارجیت اور داخلیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو جانے بغیر دوسرے کا ہو رہنا نارسائی یا نااہلی کی دلیل ہے۔ خارجیت کے آداب اور موقع و محل سے بے پروا یا بیگانہ رہ کر داخلیت کا صحیح عرفان نہیں ہو سکتا اور داخلیت کے رموز سے ناآشنا رہ کر خارجیت کا کاروبار کرنا سطحیت اور بُلہ پن ہے!

جگر صاحب نے حسن و عشق کے علاوہ سیاسی و سماجی حالات و حوادث پر بھی اظہار خیال کیا

ہے۔ سیاسی تاثرات کو شعوری طور پر غزل کے جام و مینا میں ڈھالنے کی سب سے پہلی وہ کامیاب کوشش سہیل نے کی ہے۔ اس میں ان کے پیش نظر رو حسرت موہانی ہیں۔ لیکن حسرت کی غزلوں میں سیاسی رنگ اتنا داخلی نہیں ہے، جتنا خارجی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فکر سخن کرتے ہوئے ایک آدھ شعر سیاسی رنگ کے آگئے تو ان کو بھی غزل میں ڈال دیا۔ حسرت کی سیاست اور شاعری علیحدہ علیحدہ خیالات میں بٹی ہوئی ہیں۔ سیاسی شعور کے چھینٹے مولانا محمد علی جوہر کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں۔ سیاسی تنگ نظری اور سیاسی تیرہ دلی کے خلاف دونوں کے کلام میں احتجاج کی ایک زیریں لہر ملتی ہے جو رفتہ رفتہ جگر کے یہاں زیادہ قوی اور نمایاں ہوگئی ہے۔ جگر صاحب نے مستقل نظمیں بھی کہی ہیں اور اپنے تاثرات کا اظہار بڑے درد اور دلیری سے کیا ہے۔ سب وشتم اور شور وفتن سے نہیں، بعض معصوم جس سے انقلابی شاعری مراد لیتے ہیں۔

یہاں اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ حسرت اور سہیل دونوں کے سیاسی مسلک تھے۔ ان کے کلام میں اس کا اثر ملے تو تعجب کی بات نہیں۔ جگر صاحب کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں تھے، کم سے کم جہاں تک مجھے اس کا علم ہے۔ اس لئے جگر صاحب جب کسی (ظلم وزیادتی) پر ملول یا برہم ہو کر کچھ کہتے تو ہر طبقے کے لوگ متاثر ہوتے۔ اس لئے کہ ان کی آواز کو کسی سیاسی یا جماعتی نعرے کی صدائے بازگشت نہیں بلکہ انسانی ضمیر کی پکار سمجھتے تھے اور جگر صاحب نے یقیناً وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جہاں ان کی آواز کو یہ حیثیت حاصل تھی!

جگر صاحب کو اعزازی ڈائریکٹریٹ تفویض کرنے کا مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے سامنے آیا تو سب سے زیادہ جس خیال نے اس تحریک کو تقویت پہنچائی وہ یہ تھا کہ جگر صاحب اب شاعری کے دبستانوں اور حریفانہ چشمکوں سے بلند اور شخصیت کے اعتبار سے بھی (غیر متنازعہ فیہ) ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری پر کسی طرح کا لیبل لگا کر مخصوص ومحدود نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شاعری کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں شاعری کے ساتھ ساتھ شاعر کی اہمیت وعظمت کو بھی دیکھتے ہیں۔ یہ پیش کش جگر صاحب کو علی گڑھ کی طرف سے آنی بھی چاہئے تھی، اس لئے کہ علی گڑھ نے ہی اردو ادب کے دبستانوں کو ختم کیا تھا اس کو ایک تنگنائے آب سے نکال کر ''زندہ رود'' کا درجہ حاصل کرنے کی صلاحیت بخشی تھی!

علی گڑھ نے اس طرح جو عزت افزائی کی تھی اس کا جگر صاحب پر بڑا اثر تھا۔ کنووکیشن کے موقع پر آنے کے لئے بے قرار تھے۔ ہر خط میں اس کا ذکر کرتے اور ہر شخص سے کہلا بھیجتے۔ لیکن صحت اتنی گر چکی تھی کہ معالجوں نے سفر کرنے کی اجازت نہ دی۔ جگر صاحب کو علی گڑھ سے عشق تھا۔ یہاں کی دعوت پر ضرور آتے اور آجاتے تو جیسے علی گڑھ کا گوشہ گوشہ ان کی موجودگی سے زمزمہ سنج ہو جاتا!

جگر صاحب ان رسوم و قیود اور اصرار وانکار کے حدود سے آگے نکل گئے تھے جو ہمارے بعض

شعراء کا وطیرہ بن گیا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ علی گڑھ بلائے جاتے تو بڑی خوشی سے چلے آتے تاوقتیکہ کوئی سخت معذوری سے سابقہ نہ ہوتا۔ جو کچھ پیش کیا جاتا خوشی سے قبول کر لیتے۔ طلباء ان کا احترام کرتے تھے اور ان کی پذیرائی کو اپنے لئے سرمایہ افتخار جانتے تھے۔ اس لئے ان سے زیادہ سے زیادہ جو بن پڑتا مدد کرتے۔ دوسرے شعراء کے لئے بھی علی گڑھ میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن جس ''جذبہ بے اختیار شوق'' سے جگر صاحب کے لئے ہوتا دوسروں کے لئے نہیں!

جگر صاحب اس پر بھی اصرار نہیں کرتے تھے کہ ان کے پڑھنے کا نمبر سب سے پہلے آئے۔ کس کے بعد آئے یا سب کے بعد آئے۔ جب کہا گیا، جتنا کہا گیا، پڑھ دیا اور اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ پڑھنے سے پہلے بطور قید یا معذرت نہ انکار کرنے نہ افتخار، فرصت کی کمی، صحت کی خرابی، سفر کی صعوبت وغیرہ کا بھی ذکر نہ کرتے جیسا کہ شعرا بالعموم کیا کرتے ہیں۔ یہاں کہتے بھی کسی نے نہیں سنا کہ یہ شعر ملاحظہ فرمایئے گا یا وہ دوسرے شاعروں کے پڑھنے کے طریقے یا اس کی سج دھج یا اس کے کلام پر نکتہ چینی کا ایک لفظ نہ کہتے، خاموش بیٹھے رہتے۔ آس پاس والوں سے گفتگو یا ہنسی مذاق کرتے۔ سنجیدگی اور خلوص سے شریفانہ نرم لہجے میں داد دیتے، ہر شاعر کا اکرام ملحوظ رکھتے ایک بار تو ایسا ہوا کہ ایک لڑکے نے مشاعرے میں عمداً یا غلطی سے جگر صاحب کی پرانی کوئی غزل پڑھ دی۔ جگر صاحب پاس بیٹھے تھے۔ کسی طرح کا مطلق اثر نہیں لیا۔ لڑکے کی پیٹھ تھپتھپائی اور شفقت کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر کسی اور کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ لڑکے سے تعرض کرتا۔ جیسا کہ بیان کر آیا ہوں علی گڑھ کے طلباء خواہ وہ کسی مسلک و مذاق کے ہوں۔ جگر صاحب کو بڑی عزت و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ امتیاز بہت سے لیڈروں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ میں نے اکثر محسوس کیا جیسے ان سے مل کر طلباء کی صحت مند صلاحیتیں بیدار ہونے لگی ہوں۔ یوں بھی علی گڑھ کے طلباء میں اچھے اثرات کے قبول کرنے کی استعداد نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا سبب وہ روایت اور وہ فضا ہے جس کے قائم کرنے میں ہماری قوم کے بہترین افراد نے اپنی بہترین صلاحیتیں مدتوں صرف کی ہیں۔ جس طرح طلباء میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے اچھے اساتذہ، اچھی لائبریری، اچھا ساز و سامان، اچھا کھانا پینا، رہنا سہنا، باغ، سبزہ زار، صحبت اور تفریحیں اور ورزشیں، کھیل کے میدان، ڈائننگ ہال، یونین کلب وغیرہ سودمند ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح کچھ اس طرح کا انتظام بھی ہونا چاہئے کہ ہماری وہ گراں نمایہ شخصیتیں جو علی گڑھ سے باہر ہوں، خواہ وہ علم و فضل کے شعبے سے تعلق رکھتی ہوں، مسلم یونیورسٹی کے حدود کے اندر فراغت سے مستقلاً آباد ہو جائیں اور ہمارے نوجوان طلباء کے سرچشمہ فیض ثابت ہوں۔

ذہن میں کچھ اسی طرح کی باتیں تھیں کہ چند دن ہوئے بعض احباب نے اس کی کوشش شروع کر دی تھی کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ آرام و یکسوئی کی زندگی گزارنے کے لئے جگر صاحب

مستقل طور پہ علی گڑھ آ جائیں۔ لیکن یہ کوشش آگے نہ بڑھ سکی اور جگر صاحب ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے!

جلیل القدر معاصر شعراء کی طرح جگر صاحب نے مشاعرے کی منزلت اور آخر دم تک بنایا اور اس روایت کو برقرار رکھا جس کی رو سے مشاعرے کا شعار اعلیٰ تہذیبی اداروں میں ہوتا تھا۔ بعض ارباب سخن کی یہاں مشاعروں میں اسی طرح کے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے جو مذہبی یا نیم مذہبی محفلوں کے ہوتے۔ ہماری زبان جس رتبے کو پہنچی اور تہذیب کو جو گراں مائیگی نصیب ہوئی، اس میں ان مشاعروں اور ان کے آداب کو بڑا دخل ہے۔ زبان اور تہذیب اسی طرح کی آزمائش سے گزر کر اپنا مقام پیدا کرتی ہیں۔ نوجوان طلباء کا ہجوم خواہ کسی سلسلے میں اکٹھا ہو، ادنیٰ بہانے یا اشارے پر آج جس طرح بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ سب کر گزرتا ہے جو کسی اور کے مناسب حال ہو یا نہ ہو، طلباء کے شایان شان ہرگز نہیں ہوتا۔ مشاعروں میں آج سے کم وبیش ۲۰، ۲۵ سال پہلے تک کم از کم علی گڑھ میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس میں سامعین کا جا ہے جتنا گناہ ہو، ہمارے شعراء کا بھی کچھ کم نہیں۔

بعض شعراء ایک ایسے مشاعرے یا مواقع کے لئے جہاں نوجوان لڑکیاں اور خواتین موجود ہوتی ہیں، ایسی ناپسندیدہ اور بیباک نظمیں لکھ لاتے ہیں جو نوجوانوں کے حیوانی وشہوانی جذبات کو برانگیختہ و بے قابو کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اسے یہ شعراء اپنا بڑا کارنامہ اور انعام سمجھتے ہیں۔ دیکھا تو یہاں تک گیا ہے کہ مشاعروں میں اس نظم کو سنانے کی کوئی فرمائش نہیں کرتا تو یہ شعراء خود نہایت بے غیرتی کے ساتھ اور اتنے ہی بھونڈے پن سے اشارتاً اس کی یاد دہانی کرتے ہیں! شاید غالب کی پیروی میں جہاں انہوں نے ''غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد'' کہا ہے!

جگر صاحب میں بڑی حیا اور غیرت تھی۔ کہیں کسی محفل میں بیٹھے ہوں ہمیشہ نظر نیچی رکھتے تھے۔ جیسے اس محفل میں نوجوان خواتین اور لڑکیوں کو اپنی ذمہ داری اور امانت سمجھتے ہوں۔ بے تکلف احباب میں بھی بیٹھ کر وہ اس طرح کے فقرے زبان پر نہیں لاتے تھے جن میں عورتوں سے بے راہ روی کے روابط کا اشارہ ملتا ہو، جو خواہ وہ فقری کتنے ہی ''در پردہ'' کہے جا سکتے ہوں۔

ان باتوں کا خیال کرتا ہوں تو جگر صاحب اور ان کے پرانے ساتھی شعراء آج کس حیرت والم سے یاد آتے ہیں جن کو دیکھ کر اس وقت تو اتنا نہیں، جتنا اب محسوس کرتا ہوں کہ تہذیب و شرافت بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے اس لئے ذمہ داری ہے۔

جگر صاحب شعر کہہ سکتے تھے، اپنے شعر پر مضمون نہیں لکھ سکتے تھے۔ اچھے اور بڑے شعراء بالعموم ایسا نہیں کر پاتے۔ بعض ایسا کر سکتے ہیں لیکن ان کا مضمون ان کے شعر سے اچھا ہوتا ہے اور کبھی کبھی بجائے ان کے دوسروں پر صادق آتا ہے۔ اس لئے وہ خارج از بحث ہیں۔ جگر صاحب سے

جب بھی اس طرح کی بات آئی، بڑے شوق سے بحث میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوئے۔ لیکن گفتگو کچھ اس طرح کی کرنے لگتے تھے جیسے شعر کہنے کے طور طریقوں پر بحث نہ کر رہے ہوں، غزل کی اہمیت سے انکار کرنے والے سے لڑائی مول لینے پر تیار ہوں۔ یہ لڑائی بھی کچھ اس طرح کی ہونے والی ہوتی جیسے اس نیک کام کے لئے حربہ کوئی نہ ہو، حوصلہ بہت ہو ظاہر ہے۔ ایسے نبرد آزما کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بایں ہمہ ایک جگہ وہ بڑی جرات اور صفائی سے ایک ایسی بات کہہ گئے ہیں جو ہماری اردو شاعری کے اعتبار و امتیاز کو بڑی خوبی سے واضح کرتی ہے۔ شعر یاد نہیں آتا۔ مفہوم یہ ہے شعر میں ''مشرقیت'' نہ ہو تو وہ مغربیت کی نقالی ہے اور کچھ نہیں۔ یہ بات بظاہر مولویوں جیسی معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ ایسی ہے نہیں۔ مشرقیت کیا ہے، کیا نہیں؟ اس سے یہاں بحث نہیں۔ لیکن نئے انداز کے شاعروں کو اس نکتے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسے شخص کا قول ہے جس کے کلام اور شخصیت سے کافی زمانے تک ہم محظوظ و متاثر رہے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب مغربیت اور عقلیت اپنے منتہا پر تھی اور ہمارے فکر و تخیل پر مغرب سے زیادہ مغربیت طاری تھی۔

جگر صاحب نے براہ راست شاید ہی کبھی مجھے خط لکھا ہو۔ بچوں میں سے کسی کو لکھ دیتے، وہ مجھے بتا دیتے۔ جگر صاحب کا انداز بھی ان کی دوسری اداؤں کی طرح کتنا دلکش تھا۔ وفات سے کچھ دن پہلے لڑکوں میں سے ایک کے نام خط آیا۔ قیاس کرتا ہوں کہ مضمون کیا رہا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ شان خط میں بھی وہ رعنائی اور صلابت نہیں رہ گئی تھی جو پہلے تھی۔ جگر صاحب کا خط شکست نہایت پاکیزہ اور پختہ تھا۔ جس پر التفات خاص ہوتی اس کی اپنی کوئی غزل ہاتھ سے لکھ کر دیتے اور مخصوص طغرا میں اپنے دستخط کر دیتے اور تاریخ لکھ دیتے۔ جگر صاحب کو جس حال میں ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا، اس کے بعد ان کی بیماری کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جس خط کا اوپر ذکر کر آیا ہوں اس میں ایک شعر لکھا تھا جو مجھے سنا دیا گیا۔ کہہ نہیں سکتا اوروں نے بھی کہیں سنایا پڑھا ہے یا نہیں شعر یہ تھا۔

کہیں ایثار غم جاتا ہے ضائع
چمن شاداب ہے شبنم نہیں ہے

جگر صاحب کی زندگی اس طرح کی تھی اور ایسی زندگی کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

میرا کلام میری نظر میں

(جگر مراد آبادی)

جگر نے "شعلہ طور" کے پہلے ایڈیشن میں جو ۱۹۳۲ء میں ناجی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اپنے کلام پر خود اپنے قلم سے اظہار خیال کیا تھا وہ مضمون بطور یادگار شامل کیا جارہا ہے۔

یہ میں فخریہ نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انتہائی درد کے ساتھ کہ میری زندگی کا ہر شعبہ سخت پریشان اور کج مج واقع ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایہ کلام ضائع ہو گیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ حاصل کیا۔
شعر و ادب کے متعلق نثر میں متعدد طویل و مختصر مضامین لکھے جو میرے ذاتی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھے، افسوس کہ سب ضائع ہو گئے۔
اولاً تو میرے لئے لکھنا ہی مصیبت سے کم نہیں۔ اس پر بار بار کی شدید جگر کاویوں کے نتائج کا اس سے آسانی سے محو ہو جانا خصوصاً میرے لئے کس قدر اندوہناک سانحہ ہو سکتا ہے۔
ارادہ تھا "شعلہ طور" پر خود کوئی مقدمہ لکھوں چنانچہ کئی بار لکھا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح ضائع ہی ہوتا چلا گیا۔ مشیت الٰہی شاید مجھ سے یہ کام لینا نہیں چاہتی۔ یا کسی آنے والے وقت تک منتظر رکھنا چاہتی ہے۔
انشاء اللہ العزیز "شعلہ طور" کی دوسری اشاعت میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا۔
سرسری طور پر اپنے کلام کے متعلق کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں۔
"اغلاط" سے نہ میں نے اپنے آپ کو بے پروا رکھا ہے اور نہ انہیں کا ہو کہ رہ گیا ہوں۔ اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے۔ بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جنہیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ اپنی جگہ محاسن ہیں۔
اکثر ایسی بھی ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں یا جن کو ناقدانہ نظر سے دیکھ سکتا۔ اس لئے میں خوش

ہوں گا اگر مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کر دیا جائے۔

(میرے نظریہ شعری کے اعتبار پر) مشاعرے کی غزلوں میں سے بہت کم ایسی غزلیں ہو سکتی ہیں جن پر صحیح معنوں میں غزل کا اطلاق کیا جا سکے۔ تاہم ہر جگہ آپ میری انفرادیت محسوس کئے بغیر نہیں گزر سکیں گے۔

میری شاعری ''غزل'' ہی تک محدود ہے اور چونکہ حسن و عشق میں میری زندگی ہے۔ اس لئے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرات نہیں کر سکا۔

واقعہ کانپور کی متعلق جو نظم ہے وہ بیشک بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے لیکن اس میں ایک لفظ ایسا آ گیا ہے جس کے مفہوم کی محدودیت پر مجھے اکثر تاسف رہا۔ اور وہ لفظ ''مادر وطن'' ہے۔ میں وطنیت اور قومیت دونوں کی سخت ناپسند کرتا ہوں۔ ناظرین میں کسی کو اللہ اگر توفیق عطا فرمائے تو انہیں میری طرف سے قطعاً اجازت ہے کہ وہ اس کو صحیح کر دیں۔

اکثر سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن احباب کے سخت اصرار پر۔ ممکن ہے کہ ان میں بھی کہیں کہیں اجزائے دل پائے جائیں۔ لیکن میرے لئے وہ سرمایہ ناز نہیں۔ اچھا ہوا کہ ضائع ہو گیا۔ البتہ دو نظمیں جن میں سے ایک نظم ''تلک کی موت'' پر ہے اور دوسری اسکول اسٹرائک کے موقع پر ''بچوں سے خطاب''۔ ان دونوں کے تلف ہونے کا مجھے ضرور صدمہ ہے۔ لیکن تلک کی موت پر جو نظم ہے اس میں سے بعض تخ۔ ۔ ا کے متعلق محض اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ ''مورخ ادبی'' میرے عقائد مذہبی کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگے۔ اس لئے یہ ظاہر کئے دیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم پورے شباب کے عالم میں کہی گئی جبکہ نہ مجھے مذہب کی خبر تھی اور نہ اپنی، اس لئے اس میں بیجا غلو اور بعض شدید قسم کی لغزشیں ہو گئی ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ نظم دستیاب ہو جائے لیکن نہیں ہو سکی۔ اس لئے احتیاطاً اس قدر لکھ دیا گیا۔

اپنی خصوصیات شاعری کے متعلق فی الوقت کسی طویل مضمون نگاری کے لئے آمادہ نہیں۔ صرف کچھ کہنے کے لئے کچھ کہتا ہوں۔

مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے۔ تضاد نہیں۔

نقالی اور استادانہ مشاقی میرے لئے ننگ رہی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ ننگ سمجھتا رہوں گا۔

دوسری خصوصیات کی جانب بہت کم حضرات کی توجہ منعطف ہوئی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ میں نے (اول کلام کا کچھ زمانہ چھوڑ کر) حسن کی قصائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل اور رسوا صو ۔ ت میں ہرگز پیش نہیں کیا بلکہ حسن ہو یا عشق ان کے حقیقی تاثرات و واردات کو تا امکان صحیح صحیح شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

محاکات کے اعتبار سے اکثر مقامات آپ کو ایسے ملیں گے کہ مصور کے تمام کمالات ان کی تصویر کشی میں بیکار محض ثابت ہوں گے۔

لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں میں آپ کو اکثر و بیشتر مستقل اضافات و اولیات ملیں گے جنہیں بخوف طوالت چھوڑتا ہوں۔ وقت نہیں کہ اس میں زیادہ کچھ لکھا جا سکے۔ ناظرین نکتہ رس خود ہی اندازہ فرمالیں گے۔

ممکن ہے کہ اکثر حضرات اپنے کلام پر اتنی ہی جنبش قلم کو پسند نہ فرمائیں گے لیکن اگر ازراہ انصاف غور فرمائیں گے تو یقیناً مان لینا پڑے گا کہ شاعر سے زیادہ کسی دوسرے شاعر یا غیر شاعر کو اس کے کلام پر نقد و نظر کا حق نہیں۔ بشرطیکہ احتساب نفس کے ساتھ ہو میں نے جو کچھ لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں نفسیات کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔

میری زندگی گونا گوں انقلابات و تغیرات کا مجموعہ ہے جسے پیہم مصائب آلام کی آمیزش نے خدا جانے کیا۔ ۔ کیا بنا دیا ہے لیکن میں منہ بنا بنا کر رونے بسورنے کو بالطبع سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خود میں نے کہا ہے

جاں ہمہ غم ساختم، رقصم بہ عشق
دل ہمہ خوں کردہ، خنداں میردم

بیشک جس طرح جذبات مسرت و انبساط فطرتی عطیات میں، اسی طرح جذبات غم و الم بھی۔ لیکن سچے رونے والے کہاں؟ الفاظ بیشک رونے والے صرف کیے جاتے ہیں لیکن دل ٹٹولیے تو درد کا نام بھی نہیں۔

مشاقی کی بدولت الفاظ پر قدرت حاصل ہے، یا جو چاہا اور جس طرح چاہا کہہ دیا۔ زندگی کو شعر سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ لیکن اگر سچے رونے والے ہوں بھی تاہم اس قسم کا ''شعر و ادب'' اولاً تو حیات قومی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ دوئم ش کامیاب رونا وہ رونا نہیں جس میں نسائیت و عمومیت پائی جاتی ہے۔ آپ میرے کلام میں بظاہر درد کا عنصر بہت کم پائیں گے۔ لیکن ذرا ٹھہر کر آپ اگر جذبات اور شعر کا جائزہ لیں گی تو ایک بہت ہی نازک سی موج درد ضرور محسوس کریں گے اور جس طرح میری زندگی تازہ بہ تازہ نو بہ نو انقلابات و تغیرات کے ماتحت تبدیل ہوتی گئی۔ بعینہ اسی طرح رنگ کلام بھی تبدیل ہوتا گیا۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکا اور حافظہ نے مدد کی ''شعلہ طور'' کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا۔ تاہم نظر ثانی کا محتاج رہ گیا۔ انشاءاللہ تعالیٰ دوسری اشاعت میں پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

''جگر'' مراد آبادی

آتشِ گل

میں اپنے اس مجموعہ کلام کو قائد ملت مولوی بہادر خاں مرحوم سابق نواب بہادر یار جنگ کے نام نامی سے منسوب کرنا اپنا اخلاقی اور ادبی فرض تصور کرتا ہوں جو سراپا گداز، مجسم اخلاص، فقید المثال مقرر، کامیاب مصلح، اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور ایک جری انسان تھے۔ جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا۔

وہ بیک وقت تمام محاسن شعری کا احاطہ کر لیتے تھے۔ اور اچھے شعر سے اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا خوش مذاق نہیں دیکھا۔ خدائے رحمان و رحیم اُن کی رُوح کو اپنا قُرب خاص عطا فرمائے!

جگرؔ مرادابادی

غزلیات

ہر حقیقت کو باندازِ تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

جستجو میں تری یہ حاصلِ سودا دیکھا
ایک اک ذرہ کا آغوشِ طلب وا دیکھا

آئینہ خانۂ عالم میں کہیں کیا دیکھا
تیرے دھوکے میں خود اپنا ہی تماشا دیکھا

ہم نے ایسا نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا
جو یہ کہہ دے کہ ترا حُسن سراپا دیکھا

دلِ آگاہ میں کیا کہیے جگرؔ، کیا دیکھا
لہریں لیتا ہوا اک قطرے میں دریا دیکھا

کوئی شائستہ و شایانِ غمِ دل نہ ملا!
ہم نے جس بزم میں دیکھا اُسے، تنہا دیکھا



یادش بخیر! جب وہ تصوّر میں آگیا
شعر و شباب و حُسن کا دریا بہا گیا

جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آ گیا
خود بن گیا حسین، دو عالم پہ چھا گیا

جو دل کا راز تھا اُسے کچھ دل ہی پا گیا
وہ کر سکے بیاں، نہ ہمیں سے کہا گیا

ناصح فسانہ اپنا ہنسی میں اُڑا گیا
خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

دل بن گیا نگاہ، نِگہ بن گئی زباں
آج اک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اَے جگرؔ!
وہ مجھ پہ چھا گئے، میں زمانے پہ چھا گیا



کوئی جیتا، کوئی مرتا ہی رہا
عشق اپنا کام کرتا ہی رہا

جمعِ خاطر کوئی کرتا ہی رہا
دل کا شیرازہ بکھرتا ہی رہا

غم وہ میخانہ، کمی جس میں نہیں
دل وہ پیمانہ، کہ بھرتا ہی رہا

حُسن تو تھک بھی گیا، لیکن یہ عشق
کارِ معشوقانہ کرتا ہی رہا

وہ مٹاتے ہی رہے، لیکن یہ دل
نقش بن بن کر اُبھرتا ہی رہا

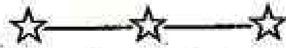
دھڑکنیں دل کی سبھی کچھ کہہ گئیں
دل کو میں خاموش کرتا ہی رہا

تم نے نظریں پھیر لیں، تو کیا ہوا؟
دل میں اِک نشتر اُترتا ہی رہا



گدازِ عشق نہیں کم، جو میں جواں نہ رہا — وہی ہے آگ، مگر آگ میں دُھواں نہ رہا
نہیں کہ دل مرا وقفِ غمِ نہاں نہ رہا — مگر وہ شیوۂ فرسودۂ بیاں نہ رہا
رہے وہ شوق جو پابندِ این و آں نہ رہا! — خوشا وہ سجدہ جو محدودِ آستاں نہ رہا!
حجابِ عشق کو، اے دل، بہت غنیمت جان — رہے گا کیا، جو یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا؟
چمن تو برقِ حوادث سے ہو گیا محفوظ — مری بلا سے، اگر میرا آشیاں نہ رہا
جنونِ سجدہ کی معراج ہے یہی شاید — کہ تیرے در کے سوا کوئی آشیاں نہ رہا

کمالِ قُرب بھی شاید ہے عین بُعد جگرؔ!
جہاں جہاں وہ ملے، میں وہاں وہاں نہ رہا



دل کو سکون، رُوح کو آرام آ گیا — موت آگئی کہ دوست کا پیغام آ گیا
جب کوئی ذکر، گردشِ ایام، آ گیا — بے اختیار لب پہ ترا نام آ گیا
غم میں بھی ہے سُرور، وہ ہنگام آ گیا — شاید کہ دورِ بادۂ گلفام آ گیا
دیوانگی ہو، عقل ہو، اُمید ہو کہ یاس — اپنا وہی ہے، وقت پہ جو کام آ گیا
دل کے معاملات میں ناصح! شکست کیا؟ — سو بار حُسن پر بھی یہ الزام آ گیا
صیّاد شادماں ہے، مگر یہ تو سوچ لے — میں آ گیا کہ سایۂ تہِ دام آ گیا
دل کو نہ پُوچھ معرکہ حُسن و عشق میں — کیا جانئے، غریب کہاں کام آ گیا
یہ کیا مقامِ عشق ہے، ظالم کہ ان دنوں — اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا

احباب مجھ سے قطعِ تعلق کریں جگرؔ
اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا



شعر و نغمہ، رنگ و نکہت، جام و صہبا ہو گیا — زندگی سے حُسن نکلا اور رُسوا ہو گیا
اور بھی آج، اور بھی ہر زخم گہرا ہو گیا — بس کر اے چشمِ پشیماں، کام اپنا ہو گیا
اس کو کیا کیجئے، زبانِ شوق کو چُپ لگ گئی — جب یہ دل شائستۂ عرضِ تمنّا ہو گیا
اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے — جس نے جو عالم بنا ڈالا، وہ اُس کا ہو گیا
ہم نے سینے سے لگایا، دل نہ اپنا بن سکا — مسکرا کر تم نے دیکھا، دل تمہارا ہو گیا
میں نے جس بُت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں — دیکھتا کیا ہوں، وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا
اُٹھ سکا ہم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی — مرحبا، وہ جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا
وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گذرے بےنقاب — دفعتاً ہر ایک گُل کا رنگ گہرا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حُسنِ حقیقت سے جگرؔ
قیس دیوانہ تھا، محوِ روئے لیلیٰ ہو گیا



رُو بروئے دوست ہنگامِ سلام آ ہی گیا
رخصت اے دیر و حرم، دل کا مقام آ ہی گیا
منتظر کچھ رند تھے جس کے وہ جام آ ہی گیا
باش اے گردوں کہ وقتِ انتقام آ ہی گی
ہر نفس خود بن کے میخانہ بہ جام آ ہی گیا
توبہ جس سے کانپتی تھی، وہ مقام آ ہی گیا
اللہ اللہ، یہ مری ترک و طلب کی وسعتیں!
رفتہ رفتہ سامنے حُسنِ تمام آ ہی گیا
اوّل اوّل ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں
آخر آخر اک مقامِ بے مقام آ ہی گیا
التفاتِ چشمِ ساقی کی سُبک تابی نہ پوچھ
میں یہ سمجھا، جیسے مجھ تک دورِ جام آ ہی گیا
عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج
ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آ ہی گیا
ہر نگہ پر بندشیں، ایک اک نفس کی پرسش
ہوشیار اے عشق، وہ نازک مقام آ ہی گیا
اہلِ دنیا اور کفرانِ زمانہ تا بکے؟
خود زمانہ بن کے تیغِ بے نیام آ ہی گیا
شوق نے ہر چند صدہا تفرقے ڈالے، مگر
زندگی کو راسِ دردِ نا تمام آ ہی گیا
صحبتِ رنداں سے واعظ کچھ نہ حاصل کر سکا
بہکا بہکا سا مگر طرزِ کلام آ ہی گیا

بے جگرؔ سُونا پڑا تھا مدّتوں سے میکدہ
پھر وہ دریا نوش، رندِ تشنہ کام آ ہی گیا



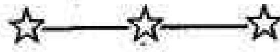
سینے میں اگر ہو دلِ بیدارِ محبت
ہر سانس ہے پیغمبرِ اسرارِ محبت
وہ بھی ہوئے جاتے ہیں طرف دارِ محبت
اچھے نظر آتے نہیں آثارِ محبت
ہُشیار ہو، اے بے خودو سرشارِ محبت!
اظہارِ محبت! ارے اظہارِ محبت!
تا دیر نہ ہو دل بھی خبردارِ محبت
اک یہ بھی ہے اندازِ فسوں کارِ محبت!
توہینِ نگاہِ کرمِ یار کہاں تک؟
دم لینے دے اے لذّتِ آثارِ محبت
سب پھونک دیئے خار و خسِ مذہب و ملّت
اللہ رے، یہ شعلۂ رُخسارِ محبت!
کونین سے کیا اہلِ محبت کو سروکار؟
کونین ہے خود غاشیہ بردارِ محبت
جو عرش کی رفعت کو بھی اُس در پہ جھکا دے
ایسا بھی کوئی جذبۂ سرشارِ محبت
میں نے انہیں تاریک فضاؤں میں بھی اکثر
دیکھے ہیں برستے ہوئے انوارِ محبت
ناصح کو ہے کیوں میری محبت سے سروکار؟
چہرے سے تو کھلتے نہیں آثارِ محبت
میں اور یہ غمگینِ غمِ عشق، ارے توبہ!
تُو، اور یہ احساسِ گراں بارِ محبت!

اب عرضِ محبت کی جگر کیوں نہیں جُرأت
وہ سامنے ہیں، گرم ہے بازارِ محبت



غم ہے کیا زینۂ صفات و ذات — غم نہیں ہے تو آرزو، نہ حیات
نغمۂ آرزو و رقصِ حیات! — مرحبا، عاشقانِ خوش اوقات!
تُو محبت کو لازوال بنا — زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات
ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل — ہم سے پوچھ ستم کے احسانات
آرزو ہر نفس حیات و مرگ — عاشقی بے نیازِ مرگ و حیات
باتوں باتوں میں آج تو سرِ بزم — کہہ گئے وہ ہر ایک دل کو بات
آپ جو کچھ کہیں بجا، لیکن — آپ پر بھی ہیں چند الزامات
حُسن ہی حُسن، جلوہ ہی جلوہ — اللہ اللہ ہجومِ کیفیات!
عِشق وہ تشنہ کام ہے کہ جسے — زہر کا گھونٹ بھی ہے آبِ حیات

اے کمالِ سخن کے دیوانے
"ماورائے سخن بھی ہے اک بات"



تیرا تصور شب ہمہ شب — خلوتِ غم بھی بزمِ طرب
دعویٰ شوق اور شکوہ بلب — شرم! دلِ آرام طلب
باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک — تیری طلب یا اپنی طلب
آ ہی گیا اک مستِ شباب — شیشہ بدست و نغمہ بلب
حُسنِ مکمل، جذب و گریز — عشق مسلسل، ترک و طلب
بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ — ہجر کی شب اور آخرِ شب
ترکِ طلب اور اطمینان — دیکھ تو میرا حُسنِ طلب

ہائے وہ درد دل کہ جگر
کچھ نہیں کھلتا جس کا سبب



پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا؟ — نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا؟
مکان و لامکاں سے بھی گذر جا — فضائے شوق میں پروازِ خس کیا؟

کرم صیاد کے صدہا ہیں، پھر بھی — فراغِ خاطرِ اہلِ قفس کیا؟
محبت سرفروشی، جاں سے پیاری — محبت میں خیالِ پیش و پس کیا؟
اجل خود زندگی سے کانپتی ہے — اجل کی زندگی پر دسترس کیا؟
زمانے پر قیامت بن کے چھا جا — بنا بیٹھا ہے طوفاں در نفس کیا؟
قفس سے ہے اگر بیزار بلبل — تو پھر یہ شغلِ تزئینِ قفس کیا؟
لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک
نہ آئے گی بہار اب کے برس کیا؟



یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا!! — شبنم کو ہنسی آئی، دل غنچوں کا بھر آیا
یہ کون تصور میں ہنگامِ سحر آیا؟ — محسوس ہوا جیسے خود عرش اتر آیا
خیر اس کو نظر آیا، شر اس کو نظر آیا — آئینے میں خود عکسِ آئینہ نگر آیا
اس بزم سے دل لے کر کیا آج اثر آیا؟ — ظالم جسے سمجھے تھے، مظلوم نظر آیا
اس جانِ تغافل نے پھر یاد کیا شاید — پھر عہدِ محبت کا ہر نقش نظر آیا
گلشن کی تباہی پر کیوں رنج کرے کوئی؟ — الزام جو آنا تھا دیوانوں کے سر آیا
یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفلِ ہستی ہے!
جب کوئی اٹھا پردہ، میں خود ہی نظر آیا



دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد — اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد
میں شکوہ بلب تھا، مجھے یہ بھی نہ رہا یاد — شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد
چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے — اب تک ہے، وہ اک نغمۂ بے ساز و صدا یاد
جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش — اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد
کیا جانیے، کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو — مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد
مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو، لیکن — اب تک ہے، ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد
ہاں ہاں، تجھے کیا کام مری شدتِ غم سے؟ — ہاں ہاں، نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد
میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا — کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد؟
کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد



شاہد و ساقی و بہار سے دُور — یعنی ہر کیفِ مستعار سے دُور
تخت سے، تاج و تاجدار سے دُور — دُور، اس دورِ فتنہ کار سے دُور
ہے خزاں اپنی ہر خزاں سے جُدا — ہے بہار اپنی ہر بہار سے دُور
سِتم و جَورِ آسماں سے الگ — کرم و لطفِ غم گُسار سے دُور
خطرۂ موت اب، نہ فکرِ حیات — نشہ ہی نشہ ہے، خُمار سے دُور
پرتوِ حُسن ذات سے نزدیک — سایۂ زلفِ تابدار سے دُور
اک حقیقت، خیال سے برتر — اک جہاں، چشمِ روزگار سے دُور

عِشق ہے اُس مقام پر کہ جہاں
حُسن ہے نقصِ اعتبار سے دُور



نغمہ ترا نفس نفس، جلوہ ترا نظر نظر — اے مرے شاہدِ حیات اور ابھی قریب تر
بن گئی مستقل عذاب، جان خراب شوق پر — خود مری کاوشِ نگاہ، خود مری فکرِ پردہ در
ترا خلوصِ دلبری، جان نہ ڈال دے اگر — نالہ بھی میرا مضمحل، نغمہ بھی میرا بے اثر
معرفتِ جمال میں، کام نہ آئے بال و پر — عقل کہیں پہ گر پڑی، چُھوٹ گئی کہیں نظر
باہمہ ذوقِ آگہی، ہائے رے پستیٔ بشر! — سارے جہاں کا جائزہ، اپنے جہاں سے بے خبر
دیکھا ہے اک جہانِ خاص، میں نے کبھی کبھی جگر — حُسن سے بھی بلند تر، عشق سے بھی لطیف تر
شورشِ درد، الاماں! گردشِ دہر، الحذر! — بھٹکے ہوئے سے قافلے، سہمی ہوئی سی رہ گذر
آ، مری جانِ انتظار، آمرے آفتابِ شوق — تیرے بغیر زندگی، کب سے ہے شام بے سحر
عرضِ نیازِ عشق کا چاہیئے اور کیا صِلہ؟ — میں نے کہا بہ چشم نم، اُس نے سُنا بہ چشمِ تر
لاکھ بیان دردِ دل، اک وہ تبسمِ حزیں — لاکھ فسانہ ہائے شوق، اک وہ نگاہِ مختصر!
مجھ سے کسی کو کام کیا، میرا کہیں قیام کیا؟ — میرا سفر ہے درِ وطن، میرا وطن ہے درِ سفر
حُسن سے جو نہ ہو سکا، کر گئی حسن کی اک آہ — عشق نے توڑ دی کمان، عقل نے ڈال دی سپر

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمتِ شب جہاں جہاں
ایک طلوعِ آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

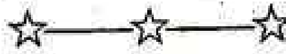


حسینِ دل، متبسم نگاہ پیدا کر — پھر اک لطیف سی خاموش آہ پیدا کر
جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے — قدم قدم پہ وہ اِک شمعِ راہ پیدا کر

خلوصِ عشق و یقینِ حیات کے ہمراہ　　جنونِ شوق و فسونِ نگاہ پیدا کر
رگوں میں بھر کے فروغِ جمالِ اِلّا اللہ　　نظر میں شعلگیِ لا اِلٰہ پیدا کر
یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن
اِسی زمین سے تُو مہر و ماہ پیدا کر!



تری رحمت خطا بخش و خطا پوش　　مری جُرأت خطا کار و خطا کوش
ہوا جاتا ہے دل پیماں فراموش　　کہاں سے، اے جنونِ خانہ بردوش؟
یہ کہہ کر ہو گیا دیوانہ خاموش　　سلامِ آخری، اے جنّتِ ہوش!
خبر لے اپنی اے غارت گرِ ہوش　　ہُوا جاتا ہے تو بھی خود فراموش
نہ پہنچی آنچ دامن تک کسی کے　　بڑا احساں ترا، اَے سوزِ خاموش!
یہ اعجازِ نگاہِ نازِ ساقی!　　مری ہستی ہمہ مستی، ہمہ ہوش!
اسی کو بڑھ کے ہوتا ہے قیامت　　سلامت باکرامت فتنۂ ہوش
ہمیں شکوے تھے کیا کیا اُن سے لیکن
ہمیں ثابت ہوئے احساں فراموش



وہ احساسِ شوقِ جواں اوّلِ اوّل　　وہ اک عالمِ گلفشاں اوّل اوّل
وہ خود ساختہ اک طلسمِ تمنّا　　وہ تالیف و تصنیفِ جاں اوّل اوّل
وہ موہوم سا اک جہانِ محبت　　وہ مُبہم سی اک داستاں اوّل اوّل
تخیّل میں رنگینیاں رفتہ رفتہ　　تصوّر میں تصویرِ جاں اوّل اوّل
وہ اک کُلفتِ شادماں تازہ تازہ　　وہ اک عشرتِ سرگراں اوّل اوّل
مجسّم و تعبیرِ خوابِ محبت!　　وہ نظّارۂ ناگہاں اوّل اوّل
وہ اک پیکرِ حُسن معصوم و سادہ　　وہ اک جلوۂ بے اماں اوّل اوّل
تکلّم میں بے ربط سا اک تسلسل　　خموشی میں حُسنِ بیاں اوّل اوّل
جگرؔ آہ انجام و آغازِ اُلفت
سکوت آخر آخر، فغاں اوّل اوّل



محبت میں جگرؔ گذرے ہیں ایسے بھی مقام اکثر　　کہ خود لینا پڑا ہے اپنے دل سے انتقام اکثر

کہاں حُسنِ تمامِ یار و تکلیفِ کرم کوشی؟ بدل دیتی ہے دُنیا اک نگاہ ناتمام اکثر
مری رندی بھی کیا رندی، مری مستی بھی کیا مستی؟ میری توبہ بھی بن جاتی ہے میخانہ بجام اکثر
محبت نے اسے آغوش میں بھی پالیا آخر تصور ہی میں رہتا تھا جو اک محشر خرام اکثر
جگر ایسا بھی دیکھا ہے کہ ہنگامِ سیہ مستی
نظر سے چُھپ گئے ہیں ساقی و مینا و جام اکثر



اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم! جو صَید کا عالم، وہی صیّاد کا عالم
اُف رنگِ رُخِ بانئِ بیدار کا عالم! جیسے کسی مظلوم کی فریاد کا عالم
پہروں سے دھڑکنے کی بھی آتی نہیں آواز کیا جانیئے، کیا ہے دلِ ناشاد کا عالم!
منصور تو سر دے کے سُبک ہو گیا، لیکن جلاّد سے پُوچھے کوئی جلاّد کا عالم
میں اور ترے ہجرِ مسلسل کی شکایت! تیرا ہی تو عالم ہے، تری یاد کا عالم
کیا جانیئے کیا ہے مری معراجِ مقامی عالم تو ہے صرف اک مری افتاد کا عالم
اربابِ چمن سے نہیں، پوچھو یہ چمن سے کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم
کیوں آتشِ گل میرے نشیمن کو جلائے
تنکوں میں ہے خود برقِ چمن زاد کا عالم



حُسنِ کافرِ شباب کا عالم سر سے پا تک شراب کا عالم
عرق آلود چہرۂ تاباں شبنم و آفتاب کا عالم
وہ مری عرضِ شوقِ بے حد پر کُچھ حیا، کچھ عتاب کا عالم
اللہ اللہ وہ امتزاجِ لطیف! شوخیوں میں حجاب کا عالم
ہمہ نُور و سرور کی دُنیا ہمہ حسن و شباب کا عالم
وہ لبِ جُوئے بار و موسمِ گُل! وہ شبِ ماہتاب کا عالم!
زانوئے شوق پر وہ پچھلے پہر نرگسِ نیم خواب کا عالم!
دیر تک اختلاطِ راز و نیاز یک بیک اجتناب کا عالم
لاکھ رنگیں بیانیوں پہ مری ایک سادہ جواب کا عالم
غم کی ہر موج، موجِ طوفاں خیز دل کا عالم، حُباب کا عالم
دلِ مطرب سمجھ سکے، شاید اک شکستہ رُباب کا عالم

وہ سماں آج بھی ہے یاد جگرؔ
ہاں مگر جیسے خواب کا عالم



جنوں کم، جستجو کم، تشنگی کم ۔ نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم
بحمد اللہ! تو ہے جس کا ہمدم کہاں اس قلب میں گنجائشِ غم؟
توجہ بے نہایت اور نظر کم خوشا یہ التفاتِ حُسنِ برہم!
مری آنکھوں نے دیکھا ہے وہ عالم کہ ہر عالم ہے لغزش ہائے پیہم
خطا کیونکر نہ ہوتی عافیت سوز؟ کہ جنّت ہی نہ تھی معراجِ آدم
خوشا یہ نسبتِ حُسن و محبت! جہاں بیٹھے، نظر آئے ہمیں ہم
وہ اک حسنِ سراپا، اللہ اللہ! کہ جس کی ہر ادا عالم ہی عالم
کہاں پہلوئے خورشیدِ جہاں تاب کہاں اک نازنیں دوشیزہ شبنم!

مسّرت، زندگی کا دُوسرا نام
مسّرت کی تمنا، مستقل غم



رکھتے ہیں خِضر سے، نہ غرض رہنما سے ہم چلتے ہیں بچ کے دُور ہر اک نقشِ پا سے ہم
مانوس ہو چلے ہیں جو دل کی صدا سے ہم شاید کہ جی اُٹھے تری آوازِ پا سے ہم
یا رب! نگاہ شوق کو دے اور وسعتیں گھبرا اُٹھے جمالِ جہت آشنا سے ہم
مخصوص کس کے واسطے ہے رحمت تمام پوچھیں گے ایک دن یہ کسی پارسا سے ہم
او مستِ نازِ حُسن! تجھے کچھ خبر بھی ہے؟ تجھ پر نثار ہوتے ہیں کس کس ادا سے ہم

یہ کون چھا گیا ہے دل و دیدہ پر کہ آج
اپنی نظر میں آپ ہیں نا آشنا سے ہم



یہ ذرّے جن کو ہم خاکِ رہِ منزل سمجھتے ہیں زبانِ حال رکھتے ہیں، زبانِ دل سمجھتے ہیں
جسے سب لوگ حُسن و عشق کی منزل سمجھتے ہیں بلند اس سے بھی ہم اپنا مقامِ دل سمجھتے ہیں
حقیقت میں جو رازِ دُوریٔ منزل سمجھتے ہیں انہیں کو ہم سلوکِ عشق میں کامل سمجھتے ہیں
ہمیں وہ کیوں جفائے خاص کے قابل سمجھتے ہیں؟ یہ رازِ دل ہے، اس کو محرمانِ دل سمجھتے ہیں
اسی اک جُرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

نگاہوں میں کچھ ایسے بس گئے ہیں حُسن کے جلوے
کوئی محفل ہو، لیکن ہم تری محفل سمجھتے ہیں
کوئی مانے نہ مانے اس کو، لیکن یہ حقیقت ہے
ہم اپنی زندگی میں غیب کو شامل سمجھتے ہیں
یہ نرم و ناتواں موجیں خُودی کا راز کیا جانیں؟
قدم لیتے ہیں طوفاں، عظمتِ ساحل سمجھتے ہیں
حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
جگر ہم بمبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں



یہ تو نہیں کہ عرضِ غم در خورِ اعتنا نہیں
حُسن کو لیکن اے جگر فرصتِ ماسوا نہیں
نالۂ جاں فروز با نغمۂ غم فزا نہیں
اے دلِ فتنہ آفریں! تُو ہے اگر، تو کیا نہیں
پیشِ نظر ہے حُسنِ دوست، حُسن کے ماسوا نہیں
عشق میں مبتلا ہوں میں شرک میں مبتلا نہیں
غیر نے کچھ اگر کہا، رنج کرے تری بلا
تو ہی جو باوفا نہیں، کوئی بھی باوفا نہیں
بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گم شدگانِ حُسنِ دوست
عشق ہے اور طلب نہیں، نغمہ ہے اور صدا نہیں
پینے سے کام ہے ہمیں میکدۂ حیات میں
ظرف جُدا جُدا سہی، اصل جُدا جُدا نہیں
پھول وہی، چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے
عہدِ بہار میں تھا کیا، دورِ خزاں میں کیا نہیں؟
پھر یہ جُدائیاں ہیں کیوں، پھر یہ دُہائیاں ہیں کیا؟
عشق سے تُو الگ نہیں، حُسن سے میں جُدا نہیں
اے مرے مقصدِ حیات! گوشۂ چشمِ التفات
ایک نگہ تو ہے بہت، نیم نگہ میں کیا نہیں؟
اُف یہ کرشمہ کاریاں ہائے یہ ربطِ حُسن و عشق!
مجھ پہ کوئی نظر نہیں، تیری کوئی خطا نہیں

خشک نہ لب نہ آنکھ تر، واہ رے حضرتِ جگر!
جیسے کہ دُور کا بھی اب عشق سے واسطا نہیں



مقاماتِ اربابِ جاں اور بھی ہیں
مکاں اور بھی، لامکاں اور بھی ہیں
مکمّل نہیں ہے جُنونِ تجسّس
مسلسل جہاں در جہاں اور بھی ہیں
یہیں تک نہیں عشق کی سیر گاہیں
مہ و انجم و کہکشاں اور بھی ہیں
محبت کی منزل ہی شاید نہیں ہے
کہ جب دیکھئے امتحاں اور بھی ہیں
محبت نہیں صرف مقصودِ انساں
محبت میں کارِ جہاں اور بھی ہیں
قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بُلبل!
قفس صورتِ آشیاں اور بھی ہیں
بہت دل کے حالات کہنے کے قابل
ورائے نگاہ و زباں اور بھی ہیں
نہیں منحصر کچھ مے و میکدہ تک
مری تشنہ سامانیاں اور بھی ہیں
خوشا درسِ غیرت، زہے عشقِ تنہا!
وہاں میں نہیں ہوں، جہاں اور بھی ہیں

صبا! خاکِ دل سے بچا اپنا دامن　　ابھی اس میں چنگاریاں اور بھی ہیں
انہیں جس سے ہے اعتمادِ محبت
وہ مجھ سے جگر بدگماں اور بھی ہیں



دل میں کسی کے راہ کیے جا رہا ہوں میں　　کتنا حسیں گناہ کیے جا رہا ہوں میں
دنیائے دل تباہ کیے جا رہا ہوں میں　　صرفِ نگاہ و آہ کیے جا رہا ہوں میں
فردِ عمل سیاہ کیے جا رہا ہوں میں　　رحمت کو بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں
ایسی بھی اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں　　ذرّوں کو مہر و ماہ کیے جا رہا ہوں میں
مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند　　خود حُسن کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں
دفتر ہے ایک معنیِ بے لفظ و صوت کا　　سادہ سی جو نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
آگے قدم بڑھائیں، جنہیں سُوجھتا نہیں　　روشن چراغِ راہ کیے جا رہا ہوں میں
معصومیِ جمال کو بھی جن پہ رشک ہے　　ایسے بھی کچھ گُناہ کیے جا رہا ہوں میں
تنقیدِ حُسن مصلحتِ خاصِ عشق ہے　　یہ جُرم گاہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں
اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اُس کے رُوبرُو　　نادیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
گلشن پرست ہوں، مجھے گُل ہی نہیں عزیز　　کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر!　　جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں
مجھ سے ادا ہوا ہے جگر جستجو کا حق
ہر ذرّے کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں



بے کیف ہے دل اور جیے جا رہا ہوں میں　　خالی ہے شیشہ اور پیے جا رہا ہوں میں
پیہم جو آہ آہ کیے جا رہا ہوں میں　　دولت ہے غم، زکوٰۃ دیے جا رہا ہوں میں
مجبوریِ کمالِ محبت تو دیکھنا!　　جینا نہیں قبول، جیے جا رہا ہوں میں
وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجیے　　مجبوریاں ہیں، ساتھ دیے جا رہا ہوں میں
رخصت ہوئی شباب کے ہمراہ زندگی　　کہنے کی بات ہے کہ جیے جا رہا ہوں میں
پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے، شراب
کوئی پلا رہا ہے، پیے جا رہا ہوں میں



جو مسرتوں میں خلش نہیں، جو اذیتوں میں مزا نہیں
ترے حُسن کا بھی قصور ہے، مرے عشق ہی کی خطا نہیں
مرے جذبِ عشق پہ رحمتیں، مجھے بے بسی کا گلا نہیں
ترے جبرِ حُسن کی خیر ہو، مرے اختیار میں کیا نہیں؟
مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی، ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی، مرے دردِ دل کی دوا نہیں
جسے میں بھی خود نہ بتا سکا، مرا رازِ دل ہے وہ رازِ دل
جسے غیر دوست سمجھ سکے مرے ساز میں وہ صدا نہیں
مرا نالہ ہوشرُبا ہو کیا، مرا نغمہ رُوح فزا ہو کیوں؟
کہ چمن میں پھُول تو ہیں وہی، مگر ان میں بُوئے وفا نہیں
یہ طریقِ عہد ہے خوب تر، مگر آہ واعظِ بے خبر!
اسے ساز گار ہو زُہد کیا، جسے معصیت بھی روا نہیں؟
مرے درد میں یہ خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں؟
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں
وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں
وہی ربطِ عشق و جمال ہے، ترا اور کچھ جو خیال ہے
یہ سمجھ، تجھی میں ہے کچھ کمی، یہ نہ کہہ کہ جنسِ وفا نہیں
وہی میں ہوں اور وہی انجمن، مگر آج ہے مرا حال کیا
یہ گمان ہے کہ حقیقتاً کوئی اور تیرے سوا نہیں
مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگر! ادبِ کثیف کی جا نہیں



اُس رُخ پہ اِزدحامِ نظر دیکھتا ہوں میں
کانٹوں کی گود میں گُلِ تر دیکھتا ہوں میں
سعیِ مآلِ فکر و نظر دیکھتا ہوں میں!
منزل رواں دواں ہے، جدھر دیکھتا ہوں میں
تاثیرِ التفاتِ نظر دیکھتا ہوں میں
کونین اپنے زیرِ اثر دیکھتا ہوں میں
خود جس میں آرزوئے شکست غرور ہے
ایسی بھی آج ایک نظر دیکھتا ہوں میں

رعبِ جمال و جذبِ محبت تو دیکھنا — اُٹھتی نہیں نگاہ مگر دیکھتا ہوں میں
تنہا نہیں ہے عشق ہی رسوائے جستجو! — خود حُسن کو بھی گرمِ سفر دیکھتا ہوں میں
اللہ رے کمالِ خُودی کی یہ وسعتیں! — میرا ہی سامنا ہے، جدھر دیکھتا ہوں میں
اے عشق شاد باش کہ آج ان کو بار بار — مصروفِ احتیاطِ نظر دیکھتا ہوں میں
محوِ خرامِ ناز ہیں صحنِ چمن میں وہ — گُستاخیِ نسیمِ سحر دیکھتا ہوں میں
میرا مقامِ عشق مقامِ فنا نہیں — دُنیائے زندگی ہے، جدھر دیکھتا ہوں میں
شاید انہیں بھی اس کی خبر ہو نہ اے جگرؔ!
در پردۂ نظر جو نظر دیکھتا ہوں میں



جُز عشقِ معتبر یہ کسی کو خبر نہیں — ایسا بھی حُسن ہے جو بقیدِ نظر نہیں
سنجیدگی ہزار ہو، غم سے مفر نہیں — دریا اسی میں بند ہے، جو آنکھ تر نہیں
دنیا کو دیکھ دیدۂ روشن نگاہ سے — فردوسِ زندگی ہے، وبالِ نظر نہیں
جو ہر نفس کے ساتھ نہ لائے پیامِ دوست — ہرگز وہ میری شام، وہ میری سحر نہیں
یہ شرمگیں نگاہ، یہ انکارِ مضمحل — پھر کیا ہے، اعترافِ محبت اگر نہیں؟
وہ کون سا ہے جلوہ، مکرّر کہیں جسے؟ — وہ کونسی نظر ہے جو پہلی نظر نہیں؟
طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ! — ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں؟
بھوپالؔ اگرچہ خلد بدامن ہے، اے جگرؔ!
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیمِ جگرؔ نہیں



محبت میں یہ کیا مقام آرہے ہیں! — کہ منزل پہ ہیں اور چلے جا رہے ہیں
یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں — وہ اب چل چکے ہیں، وہ اب جا رہے ہیں
وہ از خود ہی نادم ہوئے جا رہے ہیں — خدا جانے، کیا کیا خیال آ رہے ہیں!
ہمارے ہی دل سے مزے اُن کے پوچھو — وہ دھوکے جو دانستہ ہم کھا رہے ہیں
جفا کرنے والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ — وفا کرکے بھی ہم تو شرما رہے ہیں
وہ عالم ہے اب، یارو اغیار کیسے، — ہمیں اپنے دشمن ہوئے جا رہے ہیں

مزاجِ گرامی کی ہو خیر، یا رب!
کئی دن سے اکثر وہ یاد آ رہے ہیں



کہاں کے لالہ و گل، کیا بہارِ توبہ شکن
کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

یہ کس غضب کی محبت نے ڈال دی اُلجھن
نہ ضبطِ شوق کا یارا، نہ تابِ عرضِ سخن

خلوصِ شوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

جمال اس کا چھپائے گی کیا بہارِ چمن
گلوں سے دب نہ سکی جس کی بوئے پیراہن

وطن ہی جب نہیں اپنا تو پھر کہاں کا وطن؟
چمن اُجاڑ رہا ہوں مگر برائے چمن!

غضب ہے، قہر ہے، انسان کی یہ بوالعجبی
خود اپنا دوست بہت کم، زیادہ تر دشمن

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا
بہار میرے لئے اور میں تہی دامن

مرا شعورِ محبت ہے کس لئے ہمہ گوش؟
اگر نہیں مری جانب کسی کا رُوئے سخن

ابھی ہے دل کو مقامِ سپردگی سے گریز
اک اور بھی سہی گیسوئے عنبریں میں شکن

بہ ہوش باش کہ وہ انقلاب آپہنچا
میں سُن رہا ہوں دلِ سنگ و خشت کی دھڑکن

خرد حقیقتِ چالاک و چُست و مست خرام
جنوں صداقتِ بیباک و مصلحت روشن

حضورِ دوست یہی جُرمِ زندگی نکلا!
جنابِ شیخ کو تھا زعمِ پاکیٔ دامن

جنوں کی بے سرو سامانیوں پہ رنج نہ کر
اگر جنوں ہے، سلامت، ہزار ہا دامن

جہانِ حُسن کو بھی جس نے کر دیا بیدار
خوشا وہ سینۂ اہلِ فراق کی دھڑکن!

ہر ایک لحظہ ہے در پیش کارزارِ حیات
سکوں تلاش نہ کر اے دلِ سکوں دشمن

وہی ہے رُوحِ محبت، وہی ہے جسمِ وفا
بدلتا رہتا ہے لیکن مذاقِ پیراہن

مقامِ عشق کی نیرنگیاں نہ پوچھ جگر
کمالِ آگہی و سخت آگہی دشمن



اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں، فیاضیٔ قدرت عام نہیں؟
تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں؟

یارب! یہ مقامِ عشق ہے کیا؟ گو دیدہ و دل ناکام نہیں

تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں
کیوں مست وشرابِ عیش وطرب تکلیف توجّہ فرمائیں؟
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے، آوازِ شکستِ جام نہیں
آنا ہے جو بزمِ جاناں میں، پندارِ خودی کو توڑ کے آ!
اے ہوش وخرد کے دیوانے! ہاں ہوش وخرد کا نام نہیں!
زاہد نے کچھ اس انداز سے پی، ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
مے کش یہی اب تک سمجھے تھے شائستہ دُردِ جام نہیں
عشق، اور گوارا خود کر لے بے شرط شکستِ فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش ہے، تنہا یہ نظر کا کام نہیں
سب جس کو اسیری کہتے ہیں، وہ تو ہے اسیری ہی، لیکن
وہ کونسی آزادی ہے یہاں، جو آپ خود اپنا دام نہیں؟



اب لفظ بیاں سب ختم ہوئے، اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا، اب عشق کا کچھ پیغام نہیں
اللہ کے علم و حکمت کے محدود اگر اکرام نہیں
ہر سانس کے آنے جانے میں کیا کوئی نیا پیغام نہیں؟
ہر خُلدِ تمنا پیشِ نظر، ہر جنّتِ نظّارہ حاصل
پھر بھی ہے وہ کیا شے سینے میں، ممکن ہی جسے آرام نہیں؟
یہ حسن ہے کیا، یہ عشق ہے کیا، کس کو ہے خبر اس کی؟ لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں
زاہد ترے ان سجدوں کے عوض، سب کچھ ہو مبارک تجھ کو مگر
وہ سجدہ یہاں ہے کُفرِ جبیں، جو سجدہ کہ خود انعام نہیں
دنیا یہ دکھی ہے پھر بھی مگر، تھک کر ہی سہی، سو جاتی ہے
تیرے ہی مقدر میں اے دل، کیوں چین نہیں، آرام نہیں
اک شاہدِ معنی وصورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا، لیکن یہ مذاق عام نہیں

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگرؔ میخانۂ فطرت میں، لیکن
محرومِ نگاہِ ساقی ہے، وہ رند جو، درد آشام نہیں



جب تک انساں پاک طینت ہی نہیں
علم و حکمت، علم و حکمت ہی نہیں
وہ محبت، وہ عداوت ہی نہیں
زندگی میں اب صداقت ہی نہیں
سینۂ آہن بھی تھا جس سے گداز
اب دلوں میں وہ حرارت ہی نہیں
آدمی کے پاس سب کچھ ہے، مگر
ایک تنہا آدمیت ہی نہیں
بچ کے رہ جائے، وہ غنچہ ہی کہاں؟
گھٹ کے رہ جائے، وہ نکہت ہی نہیں
حُسن کو سمجھا ہے کیا، اے بُو الہوس!
حُسن معنی بھی ہے، صورت ہی نہیں
صرف نقالی ہے مغرب کی جگرؔ
شعر میں اب مشرقیت ہی نہیں!



بے ربطِ حُسن وعشق یہ کیف و اثر کہاں؟
تھی زندگی عزیز، مگر اس قدر کہاں؟
تیرے بغیر رونقِ دیوار و دَر کہاں؟
شام و سحر کا نام ہے، شام و سحر کہاں؟
کیا جانئے، خیال کہاں ہے، نظر کہاں!
تیری خبر کے بعد پھر اپنی خبر کہاں؟
ہر جلوۂ جمال ہے برقِ گریز پا
اے دل! یہاں تجلّیِ بارِ دگر کہاں؟
مانا کہ محتسب بھی بڑا با شعور ہے
لیکن اسے نزاکتِ غم کی خبر کہاں؟
مل کر ہجوم جلوہ میں خود جلوہ بن گئی
پہنچا ہے کس جگہ سے مقامِ نظر کہاں؟
آج اس کی مہمان ہے، کل اُس کی مہماں
اس خانماں خرابِ محبت کا گھر کہاں؟
کہنے کو اہلِ علم کی کوئی کمی نہیں!
لیکن خود اپنی فکر، خود اپنی نظر کہاں؟
ترکِ تعلقات کو مدّت گذر چکی
ظالم ترے خیال سے پھر بھی مفر کہاں؟
ہر اعتبارِ دوست پہ صدقے ہزار جان
لیکن وہ کیفِ وعدۂ نامعتبر کہاں؟
عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی!
دامن سے وہ معاملۂ چشمِ تر کہاں؟
ہر گام پر ہے منزلِ نو جستجو طلب
جاتا ہے سر اُٹھائے ہوئے بے خبر کہاں؟
صد عشرتِ نگاہِ مسلسل خوشا نصیب!
لیکن لطافتِ نگہِ مختصر کہاں؟
ہر چند کائنات دو عالم میں، اے جگرؔ!
انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں؟



عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں، جنھیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

بے حجابی کو حجابِ درمیاں سمجھا تھا میں
سامنے کی بات تھی، لیکن کہاں سمجھا تھا میں؟

ہر نگہ کو طبعِ نازک پر گراں سمجھا تھا میں
وہ بھی کیا دن تھے، جب اُس کو بدگماں سمجھا تھا میں

شاد باش و زندہ باش اے عشقِ خود سودائے من
تجھ سے پہلے اپنی عظمت بھی کہاں سمجھا تھا میں

کیا خبر تھی، خود وہ نکلیں گے برابر کے شریک؟
دل کی ہر دھڑکن کو اپنی داستاں سمجھا تھا میں

یاد لیآ ہے کہ جب ذوقِ طلب کامل نہ تھا
ہر غبارِ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں

آدمی کو آدمی سے بُعد، وہ بھی کس قدر!
زندگی کو زندگی کا راز داں سمجھا تھا میں

کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے
چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

زندگی نکلی مسلسل امتحاں در امتحاں
زندگی کو داستاں ہی داستاں سمجھا تھا میں

اس گھڑی کی شرم رکھ لے، اے نگاہِ نازِ دوست
ہر نفس کو جب حیاتِ جاوداں سمجھا تھا میں

میری ہی رُودادِ ہستی تھی مرے ہی سامنے
آج تک جس کو حدیثِ دیگراں سمجھا تھا میں

پردہ اُٹھا تو وہی صورت نظر آئی جگر
مُدتوں رُوح القدس کو ہم زباں سمجھا تھا میں



سبھی اندازِ حُسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

اُس کی راتوں کا انتقام نہ پوچھ
جس نے ہنس ہنس کے دن گذارے ہیں

اے سہاروں کی زندگی والو،
کتنے انساں بے سہارے ہیں!

لالہ و گل سے تجھ کو کیا نسبت؟
نامکمّل سے استعارے ہیں!

ہم تو اب ڈوب کر ہی اُبھریں گے
وہ رہیں شاد، جو کنارے ہیں

شبِ فُرقت بھی جگمگا اُٹھی
اشکِ غم ہیں کہ ماہ پارے ہیں

آتشِ عشق وہ جہنّم ہے
جس میں فردوس کے نظارے ہیں

وہ ہمیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے
گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

حُسن کی بے نیازیوں پہ نہ جا!
بے اشارے بھی کچھ اشارے ہیں



یہ صحنِ درویش، یہ لالہ وگل، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

منڈلائے ہوئے جب ہر جانب طوفاں ہی طوفاں ہوتے ہیں
دیوانے کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں

اس جہد و طلب کی دُنیا میں کیا کارِ نمایاں ہوتے ہیں!
ہم صرف شکایت کرتے ہیں، وہ صرف پشیماں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

رندوں نے جو چھیڑا زاہد کو، ساقی نے کہا کس طنز سے آج!
اوروں کی وہ عظمت کیا جانیں، کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں

تُو خوش ہے کہ تجھ کو حاصل ہیں، میں خوش کہ مرے حصّے میں نہیں
وہ کام جو آساں ہوتے ہیں، وہ جلوے جو ارزاں ہوتے ہیں

آسودۂ ساحل تو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اُٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

یہ خون جو ہے مظلوموں کا، ضائع نہ ہو جائے گا، لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر!
جب وقتِ شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں



غم معتبر نہیں ہے، مکمل خوشی نہیں
کیا وقت ہے کہ لُطف محبت میں بھی نہیں

یہ تو نہیں کہ مجھ کو سرِ مے کشی نہیں
لیکن ابھی نہیں، مرے ساقی، ابھی نہیں

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے، مگر
دل میں نہیں اگر، تو کہیں روشنی نہیں

واعظ اب اور کیا کہوں، لیکن خطا معاف!
جو تیرے سامنے ہے، حقیقت وہی نہیں

کیا جانئے یہ کون سا عالم ہے، اے جگر!
دل مضطرب ہے اور کوئی بات بھی نہیں



کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں، ایک نشیمن

کامل رہبر، قاتل رہ زن
دل سا دوست، نہ دل سا دشمن

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے　　عشق ہے کارِ شیشہ و آہن
خیر مزاجِ حُسن کی، یارب!　　تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
آ، کہ نہ جانے تجھ بن کب سے　　رُوح ہے لاشہ جسم ہے مدفن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے　　ہجر کی رات اور اتنی روشن!
عُمریں بیتیں، صدیاں گذریں　　ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
تجھ سا حسین اور خونِ محبت　　وہم ہے شاید سُرخیٔ دامن
برقِ حوادث، اللہ اللہ!　　جُھوم رہی ہے شاخِ نشیمن
تو نے سلجھ کر گیسوئے جاناں　　اور بڑھا دی شوق کی اُلجھن
رحمت ہو گی طالبِ عِصیاں　　رشک کرے گی پاکیٔ دامن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں　　اور وہ ظالم آئینہ دشمن
بیٹھنے میں ہم ہر بزم میں، لیکن　　جھاڑ کے اُٹھے اپنا دامن
ہستی شاعر اللہ اللہ! (قطعہ)　　حُسن کی منزل، عشق کا مسکن
رنگیں فطرت، سادہ طبیعت　　فرش نشیں اور عرش نشیمن!
کام ادھورا اور آزادی　　نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے، لیکن دُھندلی دُھندلی!　　سایہ ہے لیکن روشن روشن
کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر　　کون چھڑائے اپنا دامن؟

چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے
کس کا صحرا، کیسا گلشن؟



ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں　　ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں
بے فائدہ الم نہیں، بے کار غم نہیں　　توفیق دے خُدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں
میری زباں پہ شکوۂ اہلِ سِتم نہیں　　مجھ کو جگا دیا، یہی احسان کم نہیں
یا رب! ہجومِ درد کو دے اور وسعتیں　　دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں
شکوہ تو ایک چھیڑ ہے، لیکن حقیقتاً　　تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں
اب عشق اس مقام پہ ہے جستجو نورد　　سایہ نہیں جہاں، کوئی نقشِ قدم نہیں
ملتا ہے کیوں مزہ ستمِ روز گار میں!　　تیرا کرم بھی خود جو شریکِ ستم نہیں
زاہد کچھ اور ہو نہ ہو میخانے میں، مگر　　کیا کم یہ ہے کہ فتنۂ دیر و حرم نہیں

مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز؟
اِک سانحہ سہی، مگر اتنا اہم نہیں



عشقِ لامحدود جب تک رہ نُما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
بیکراں ہوتا نہیں، بے انتہا ہوتا نہیں
قطرہ جب تک بڑھ کے قلزم آشنا ہوتا نہیں
اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں
سب جدا ہو جائیں، لیکن غم جُدا ہوتا نہیں
زندگی اِک حادثہ ہے، اور کیسا حادثہ
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں
کون یہ ناصح کو سمجھائے بطرزِ دل نشیں
عشق صادق ہو تو غم بھی بے مزا ہوتا نہیں
درد سے معمور ہوتی جا رہی ہے کائنات
اک دلِ انساں مگر درد آشنا ہوتا نہیں
میری عرضِ غم پہ وہ کہنا کسی کا ہائے ہائے!
شکوۂ غم شیوۂ اہلِ وفا ہوتا نہیں
اُس مقامِ قُرب تک اب عشق پہنچا ہے، جہاں
دیدہ و دل کا بھی اکثر واسطا ہوتا نہیں
ہر قدم کے ساتھ منزل، لیکن اس کا کیا علاج
عشق ہی کم بخت منزل آشنا ہوتا نہیں
اللہ اللہ یہ کمالِ ارتباطِ حُسن و عشق!
فاصلے ہوں لاکھ، دل سے دل جُدا ہوتا نہیں
کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں



جو طوفانوں میں پلتے جا رہے ہیں
وہی دُنیا بدلتے جا رہے ہیں
نکھرتا آ رہا ہے رنگِ گلشن
خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں
وہیں مَیں خاک اُڑتی دیکھتا ہوں
جہاں چشمے اُبلتے جا رہے ہیں
چراغِ دیر و کعبہ، اللہ اللہ!
ہوا کی زد پہ جلتے جا رہے ہیں
شباب و حُسن میں بحث آپڑی ہے
نئے پہلو نکلتے جا رہے ہیں



عمر بھر روح کی اور جسم کی یک جائی ہو
کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو
کوئی اتنا بھی نہ مصروفِ خود آرائی ہو
کہ تماشا رہے باقی نہ تماشائی ہو
انجمن ہو، نہ سر انجمن آرائی ہو
میں ہوں اور صرف مرا عالمِ تنہائی ہو
مستیِ حسن غمِ عشق پہ یوں چھائی ہو
دل سے جو موجِ غم اُٹھے، تری انگڑائی ہو

اے غمِ دوست! ترا صبر مجھی پر ٹوٹے — بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو
وہ محبت ہی نہیں ہے، وہ قیامت ہی نہیں — جو ترے پائے نگاریں کی نہ ٹھکرائی ہو

ہو گئی دل کو تری یاد سے اک نسبتِ خاص
اب تو شاید ہی میسّر کبھی تنہائی ہو



داغِ دل کیوں کوئی مجروح پذیرائی ہو — گُل ویرانہ بنے، لالۂ صحرائی ہو
دم اُلٹ جائے کہ دم پر مرے بن آئی ہو — کیوں تری یاد شریکِ غمِ تنہائی ہو
پھر وہی رُت، وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو — پھر ہر اک چوٹ محبت کی اُبھر آئی ہو
نالہ یوں کیجیے، یہ اعجازِ شکیبائی ہو — جیسے بیساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو
حُسن و بیچارگیٔ حُسن، الٰہی توبہ! — میں تو مر جاؤں جو یوں عشق کی بن آئی ہو
عرصۂ حشر کہاں، جلوہ گہِ دوست کہاں؟ — وہ بھی میرا ہی نہ اک گوشۂ تنہائی ہو
بھول جاؤں کہ مرا فرضِ محبت کیا ہے — اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو
گر کے نظروں سے تری اُس کا ٹھکانا ہی کہاں — جس نے ظالم ترے دل میں بھی جگہ پائی ہو
ہائے، اُس حصۂ گلشن کا مقدر ہمدم! — نہ خزاں آئی ہو جس میں، نہ بہار آئی ہو

یوں بھی ہو کاش! غمِ عشق کی تاثیر، جگرؔ
میں تمنا نہ کروں اور وہ تمنائی ہو



ممکن نہیں کہ جذبۂ دِل کارگر نہ ہو — یہ اَور بات ہے، تمھیں اب تک خبر نہ ہو
توہینِ عشق دیکھ، نہ ہو، اے جگرؔ نہ ہو — ہو جائے دل کا خُون، مگر آنکھ تر نہ ہو
دریائے حُسن و کارِ غمِ عشق، ناصح! — یہ کیا کہا، ترا سرِ دامن بھی تر نہ ہو!
لازم خودی کا ہوش بھی ہے بیخودی کے ساتھ — کس کی اُسے خبر، جسے اپنی خبر نہ ہو
وہ بدگمانیاں ہیں، نہ وہ سرگرانیاں — اتنی بھی دل کی دل کو الٰہی خبر نہ ہو
احسانِ عشق اصل میں توہینِ حُسن ہے — حاضر ہیں دین و دل بھی، ضرورت اگر نہ ہو

یا طالبِ دُعا تھا مَیں اِک ایک سے جگرؔ
یا خود یہ چاہتا ہوں، دعا میں اثر نہ ہو



پھول بسر کرتے ہیں خاروں کے ساتھ — کھیلتے ہیں ہم بھی شراروں کے ساتھ
کم نہ ہوئیں اُن سے بھی کچھ ظلمتیں — ربط بڑھایا تھا ستاروں کے ساتھ
عشق کہیں تجھ سے نہ لے انتقام — چھیڑ نہ کر عشق کے ماروں کے ساتھ
ایک نظر، ایک دلِ ناتواں! — معرکہ درپیش ہزاروں کے ساتھ
عشق میں کیا ہے، یہی معراجِ دید — گم ہیں نگاہیں بھی نظاروں کے ساتھ
رقص میں ہے کب سے دل کی کائنات — دیدہ و نادیدہ اشاروں کے ساتھ
لوٹ بہاریں نہ چمن کی بہت — تو بھی نہ لٹ جائے بہاروں کے ساتھ
صبح ہے دُور اور ابھی سے جگر — ڈوب چلی نبضِ ستاروں کے ساتھ

جان فدا اُس پہ کہ جس نے جگر
زیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ



ابھی نہ روک نگاہوں کے پیرِ مے خانہ — کہ زندگی ہے ابھی زندگی سے بے گانہ
فضائے کعبہ ہو یا سرزمینِ بُت خانہ — ترے سوا نہ حقیقت، نہ کوئی افسانہ
سحر ہوئی، وہ بڑھے ہاتھ سُوئے پیمانہ — بنامِ شاہدِ نو خیز و پیرِ مے خانہ
حدیثِ حُسن، نہ شغلِ شراب و پیمانہ — یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا افسانہ!
مذاقِ عشق کی تفریق، اے معاذ اللہ! — ہم ہوئے نہ کبھی عندلیب و پروانہ
ستم بھی ڈھائے کسی نے تو اس توجہ سے — کہ بن گیا دل صد پارہ آئینہ خانہ
جُنونِ عشق کی کافر ادائیاں، توبہ! — نگاہِ زُہد بھی پڑنے لگی حریصانہ
وہیں وہیں سے اُٹھے ہیں ہزارہا فتنے — جہاں جہاں سے میں گزرا ہوں بے نیازانہ
خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع، جلنے دو — پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ
وہ ایک شعرِ مجسّم، وہ ایک پیکرِ حُسن — وہ سبز باغ، یہ اندازِ بے نیازانہ
نظر نظر متبسّم، اگرچہ بے پردا — نفس نفس متوجّہ، اگرچہ بے گانہ

فدائے نیم نقابی تمام نکہت و رنگ
نثارِ نیم نگاہی، تمام مے خانہ



سراپا حقیقت، مجسّم فسانہ — محبت کا عالم، جنوں کا زمانہ
ہمہ شعر و نغمہ، ہمہ رنگ و نکہت — وہ جانِ تمنّا، وہ حُسنِ یگانہ

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم — ادا بے تعلق، نظر محرمانہ
نظر اُٹھتے اُٹھتے، نظر ملتے ملتے — دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ
حیا میں وہ معصوم سی اِک شرارت — شرارت میں موہوم سا اک فسانہ
وہ ہر چھیڑ میں اِک نئی زندگانی — وہ ہر بات میں اِک نیا شاخسانہ
طبیعت شگفتہ، مگر کھوئی کھوئی — ہر اندازِ دل کش نیا شاخسانہ
وہ اخفائے رازِ محبت کی خاطر — کبھی کچھ بہانہ، کبھی کچھ بہانہ
وہ اشک و تبسم کا پُرکیف موسم — وہ شعر و ترنم کا رنگیں زمانہ
کبھی رُوئے زیبا پہ غصے کی لہریں — کہ جیسے کوئی بجلیوں کا خزانہ
وہ باربط سا اِک طلسمِ معانی — وہ بے ربط سا اِک مسلسل فسانہ
جنونِ مکمل کا بھی ایک عالم — سکوتِ مسلسل کا بھی اِک زمانہ

غرورِ تجمل، مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت، مگر فاتحانہ



یہ فلک یہ ماہ و انجم، یہ زمین یہ زمانہ — ترے حُسن کی حکایت، مرے عشق کا فسانہ
یہ ہے عشق کی کرامت، یہ کمالِ شاعرانہ — ابھی مُنہ سے بات نکلی، ابھی ہو گئی فسانہ
یہ علیل سی فضائیں، یہ مریض سا زمانہ — تری پاک ترجوانی، ترا حُسنِ معجزانہ
یہ مرا پیام کہنا تو صبا مؤدبانہ — کہ گذر گیا ہے پیارے تجھے دیکھے اِک زمانہ
مجھے چاکِ جیب و دامن سے نہیں مناسبت کچھ — یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسمِ عامیانہ
تجھے حادثاتِ پیہم سے بھی کیا ملے گا ناداں؟ — ترا دل اگر ہو زندہ، تو نفس بھی تازیانہ
تری اک نمود سے ہے ترے اِک حجاب تک ہے — مری فکرِ عرش پیما، مرا نازِ شاعرانہ
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ — جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتحِ زمانہ
یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ — دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ
کبھی حُسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ — وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ
مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے — مرے دل سے کہہ گئی کیا، وہ نگاہِ ناقدانہ

تجھے اے جگرؔ! ہوا کیا کہ بہت دنوں سے پیارے!
نہ بیانِ عشق و مستی، نہ حدیثِ دلبرانہ



میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے؟ — مرا عشق بھی کہانی، ترا حسن بھی فسانہ
مری زندگی تو گذری ترے ہجر کے سہارے — مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیئے بہانہ
ترے عشق کی کرامت، یہ اگر نہیں تو کیا ہے — کبھی بے ادب نہ گذرا مرے پاس سے زمانہ
تری دوری و حضوری کا ہے عجیب عالم — ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ
مرے ہم صفیر بلبل! مرا تیرا ساتھ ہی کیا — میں ضمیرِ دشت و دریا، تُو اسیرِ آشیانہ
میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں ہے جو فرق مجھ میں تجھ میں — ترا درد دردِ تنہا، مرا غمِ غمِ زمانہ
ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا!
تجھے اے جگر! مبارک! یہ شکست فاتحانہ



محبت کار فرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے — کہ ہر دُنیائے دل شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے
ہر اک صورت، ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے — الٰہی! کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے
زمانہ گرم رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے — مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے
جہاں تک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن — دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے
جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں — یہ محفل اور برہم، اور برہم ہوتی جاتی ہے
نزاکت ہائے احساسِ محبت، اے معاذ اللہ! — کہ اب اک اک گھڑی ایک ایک عالم ہوتی جاتی ہے
غرورِ حُسن، رخصت! الفراق اے نازِ خود بینی! — مزاجِ حُسن سے اب تمکنت کم ہوتی جاتی ہے
یہی جی چاہتا ہے چھیڑتے ہی چھیڑتے رہیئے — بہت دل کش ادائے حُسنِ برہم ہوتی جاتی ہے
ارے توبہ! یہ تکمیل شباب و حُسن ارے توبہ! — کہ ہر ظالم ادا تقدیرِ عالم ہوتی جاتی ہے
تصور رفتہ رفتہ اِک سراپا بنتا جاتا ہے — وہ اک شے جو مجھی میں ہے مجسم ہوتی جاتی ہے
وہ رہ رہ کر، گلے مل مل کے رُخصت ہوتے جاتے ہیں — مری آنکھوں سے یارب! روشنی کم ہوتی جاتی ہے
جدھر سے میں گذرتا ہوں، نگاہیں اُٹھتی جاتی ہیں — مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے؟
جگر! تیرے سکوتِ غم نے یہ کیا کہہ دیا اُن سے؟ — جھکی پڑتی ہیں نظریں، آنکھ پُرنم ہوتی جاتی ہے



کیا کشش حسن بے پناہ میں ہے! — جو قدم ہے، اُسی کی راہ میں ہے
مے کدہ میں، نہ خانقاہ میں ہے — جو تجلی دلِ تباہ میں ہے
ہائے! وہ رازِ غم کہ جو اب تک — تیرے دل میں، مری نگاہ میں ہے
عشق میں کیسی منزلِ مقصود — وہ بھی اِک گرد ہے، جو راہ میں ہے
میں جہاں ہوں، ترے خیال میں ہوں — تو جہاں ہے، مری نگاہ میں ہے

حسن کو بھی کہاں نصیب، جگرؔ !
وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے



کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بُجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی

نہیں جاتی، کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

نگاہوں کو خزاں نا آشنا بننا تو آجائے
چمن جب تک چمن ہے، جلوہ سامانی نہیں جاتی

پشیمانِ ستم وہ دل ہی دل میں رہتے ہیں، لیکن
خوشا حُسن کی طرزِ ناپشیمانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں، واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

مزاج اہلِ دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا
کہ جیسے نکہتِ گُل سے پریشانی نہیں جاتی

بلندی چاہئے انسان کی فطرت میں پوشیدہ
کوئی ہو بھیس، لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

گئے وہ دن کہ دل سرمایہ دارِ دردِ پیہم تھا
مگر آنکھوں کی اب تک میر سامانی نہیں جاتی

جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو، اُس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مرے، لیکن
مری سیرابیوں کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

نہیں معلوم کس عالم میں حُسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو، لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طغیانی نہیں جاتی

جگرؔ ! وہ بھی زِ سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر اُن کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی



تکلف سے، تصنّع سے، بَری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے، وہی ہے زندگی اپنی

نظر سے اُن کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی
حقیقت میں تھی جیسے مدّتوں سے دوستی اپنی

وہ اُن کی بے رُخی، وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی
بھری محفل تھی، لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

جمال اُن کا، مزاج اپنا، غم اُن کا، زندگی اپنی
حیاتِ حُسن ہے گویا حیاتِ عاشقی اپنی

یہاں تک تو جگرؔ ! پہنچی ہے معراجِ خُودی اپنی
کہ حُسن اک مشغلہ اپنا ہے، عشق اک دل لگی اپنی

ہمیں کیوں اب کوئی سمجھائے، دل اپنا، خوشی اپنی
گریباں اپنا، ہاتھ اپنے، جنوں اپنا، ہنسی اپنی

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی، لیکن واقعہ یہ ہے
کہ ترکِ مے کشی پر بھی وہی ہے مے کشی اپنی

جگر! رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی، نہ ایسی زندگی اپنی



اگر شامل نہ در پردہ کسی کی آرزو ہوتی
تو پھر اے زندگی، ظالم، نہ میں ہوتا، نہ تُو ہوتی

اگر حائل نہ اُس رُخ پر نقابِ رنگ و بُو ہوتی
کسے تابِ نظر رہتی، مجالِ آرزو ہوتی؟

نہ اک مرکز پہ رُک جاتی، نہ یوں بے آبرو ہوتی
محبت جستجو تھی، جستجو ہی جستجو ہوتی

ترا ملنا تو ممکن تھا، مگر اے جانِ محبوبی!
مرے نزدیک توہینِ مذاقِ جستجو ہوتی

نگاہِ شوق اسے بھی ڈھال لیتی اپنے سانچے میں
اگر اک اور بھی دنیا ورائے رنگ و بو ہوتی



وہی اِس نظر میں ہیں کھب جانے والے
جو سینوں پہ ہیں برچھیاں کھانے والے

شکن کاش پڑ جائے اپنی جبیں پر!
پریشاں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں
سلامت رہیں اُن کو بہکانے والے

بہ غور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں!
مرے حال پر رحم فرمانے والے

محبت کی باتیں، محبت ہی جانے
معمے نہیں ہیں، یہ سمجھانے والے

ترے حُسن کا راز کیوں کر چھپاؤں
مرے دیدہ و دل پہ چھا جانے والے

مری طاقتِ ضبط کی خیر یا رب!
کرم پر تُلے ہیں ستم ڈھانے والے

جو ہیں خاصِ چشم و چراغِ محبت
وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے



آنکھوں میں بس کے، دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی، جگا کر چلے گئے

حُسنِ ازل کی شان دکھا کر چلے گئے
اک واقعہ سا یاد دِلا کر چلے گئے

چہرے تک آستین وہ لا کر چلے گئے
کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

رگ رگ میں اس طرح وہ سما کر چلے گئے
جیسے مجھی کو مجھ سے چُرا کر چلے گئے

میری حیاتِ عشق کو دے کر جنونِ شوق
مجھ کو تمام ہوش بنا کر چلے گئے

سمجھا کے پستیاں مرے اوجِ کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

اپنے فروغِ حُسن کی دِکھلا کے وسعتیں
میرے حدودِ شوق بڑھا کر چلے گئے

ہر شئے کو میری خاطرِ ناشاد کے لئے
آئینۂ جمال بنا کر چلے گئے
آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے
اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے
آئے تھے چشمِ شوق کی حسرت نکالنے
سرتا قدم نگاہ بنا کر چلے گئے
اب کاروبارِ عشق سے فُرصت مجھے کہاں؟
کونین کا وہ درد بڑھا کر چلے گئے
شکرِ کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول!
اپنا سا کیوں نہ مجھ کو بنا کر چلے گئے
لب تھرتھرا کے رہ گئے، لیکن وہ اے جگر!
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے



وہ جو روٹھیں، یوں منانا چاہیئے
زندگی سے رُوٹھ جانا چاہیئے
ہمتِ قاتل بڑھانا چاہیئے
زیرِ خنجر مُسکرانا چاہیئے
زندگی ہے نام جہد و جنگ کا
موت کیا ہے، بُھول جانا چاہیئے
ہے انہیں دھوکوں سے دل کی زندگی
جو حسیں دھوکا ہو، کھانا چاہیئے
لذّتیں ہیں دشمنِ اوجِ کمال
کلفتوں سے جی لگانا چاہیئے
ان سے ملنے کو تو کیا کہیئے، جگر!
خود سے ملنے کو زمانا چاہیئے



برابر سے بچ کر گذر جانے والے
یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے
نہیں جانتے کُچھ کہ جانا کہاں ہے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے
مرے دل کی بے تابیاں بھی لئے جا
دبے پاؤں مُنہ پھیر کر جانے والے
ترے اک اشارے پہ ساکت کھڑے ہیں
"نہیں" کہہ کے سب سے گذر جانے والے
محبت میں ہم تو جیے ہیں، جئیں گے
وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے



سودا جواب ہے، سر میں، وہ سودا ہی اور ہے
اس کا چمن ہی اور ہے، صحرا ہی اور ہے
لیلائے آب و رنگ تو ہزاروں ہزار میں
مجنوں ہے، جس کی رُوح، وہ لیلیٰ ہی اور ہے
جو حُسنِ شیش جہت سے نہ سیراب ہو سکی
محسوس اب ہُوا، وہ تمنّا ہی اور ہے
خود حُسن استعارہ ہے جس کے جمال کا
وہ جانِ حُسن، حُسن سراپا ہی اور ہے

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرتِ بلند
شاید وہ حُسن و عشق کی دُنیا ہی اور ہے
صورت میں یہ فروغ، یہ جذب و کشش کہاں؟
در پردہ کوئی شاہدِ معنیٰ ہی اور ہے
یہ حسن رنگ رنگ بھی کچھ کم نہ تھا جگرؔ!
کیا کیجئے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے



یوں پرسشِ ملال وہ فرما کے رہ گئے
شکوے مری زبان تک آ آکے رہ گئے
پہلے تو عرضِ غم پہ وہ جھنجلا کے رہ گئے
پھر کچھ سمجھ کے، سوچ کے، شرما کے رہ گئے
آئینہ چُوم چُوم رہے تھے وہ بار بار
دیکھا جو یک بیک مجھے، شرما کے رہ گئے
وہ کون ہے کہ جو سرِ منزل پہنچ سکا
دُھندلے سے کچھ نشان نظر آ کے رہ گئے
نغموں پہ میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے
کُچھ مسکرا کے پھُول سے برسا کے رہ گئے
ہر شکر انتقامِ محبت ہے اے جگرؔ!
شکوہ نہیں ہے اُن سے، جو تڑپا کے رہ گئے



پھر دل ہے قصدِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے
رگ رگ میں نیشِ عشق کو پنہاں کیے ہوئے
پھر عُزلتِ خیال سے گھبرا رہا ہے دل
ہر وسعتِ خیال کو زنداں کیے ہوئے
پھر چشمِ شوق دیر سے لبریزِ شکوہ ہے
قطروں کو موج، موج کو طوفاں کیے ہوئے
پھر جانِ بے قرار ہے آمادۂ فغاں
سو حشر اِک سکوت میں پنہاں کیے ہوئے
پھر کیفِ بیخودی میں بڑھا جا رہا ہوں میں
سب کچھ نثارِ شوقِ فراواں کیے ہوئے
پھر سُوئے خُلدِ حُسن کھنچا جا رہا ہے دل
ہر جنّتِ نظارہ کو ویراں کیے ہوئے
پھر بڑھ چلا ہے جوشِ طلب راہِ دوست میں
سو فتح ہر شکست پہ قرباں کیے ہوئے
پھر بڑھ چلیں جنونِ تمنا کی شورشیں!
برہم نظامِ عالمِ امکاں کیے ہوئے
پھر ہے نگاہِ شوق کو دیدار کی ہوس
مدّت ہوئی ہے جرأتِ عصیاں کیے ہوئے
پھر لے چلی ہے وحشتِ دل شہرِ حُسن میں
جنسِ گرانِ عشق کو ارزاں کیے ہوئے
پھر جی یہ چاہتا ہے کہ بیٹھے رہیں جگرؔ!
اُن کی نظر سے بھی اُنھیں پنہاں کیے ہوئے



آئے ہیں پھر وہ عزمِ دل و جاں کئے ہوئے ۔ پلکوں کی اوٹ، حشر کا ساماں کئے ہوئے
پھر اُٹھ رہی ہے عارضِ پُر نور سے نقاب ۔ نظّارہ و نظر کو پریشاں کئے ہوئے
پھر شام و صبح، زلف و رُخِ یار ہیں بہم ۔ ایماں کو کُفر، کُفر کو ایماں کئے ہوئے
پھر حُسنِ منفعل متبسّم ہے زیرِ لب ۔ یک قطرہ اشک زینتِ مژگاں کئے ہوئے



ہم نے دنیا ہی میں دُنیائے حقیقت دیکھی ۔ یہیں دوزخ نظر آئی، یہیں جنّت دیکھی
عشق کے بھیس میں جب حُسن کی صورت دیکھی ۔ ہر ادا پھر تو قیامت ہی قیامت دیکھی
منفرد رنج، نہ تنہا کوئی راحت دیکھی ۔ یہ تری نیم نگاہی کی شرارت دیکھی
جب تجھے دیکھ کے کونین کی وُسعت دیکھی ۔ حُسن ہی حُسن، محبت ہی محبت دیکھی
نگہِ شوق کی محرومیٔ تقدیر نہ پوچھ! ۔ بن گئی وہ بھی فسانہ، جو حقیقت دیکھی
حُسنِ بے نام نے رکھا تھا چھپا کر جس کو ۔ وہ تجلّی بھی سرِ پردۂ حیرت دیکھی

اُس گنہگارِ محبت کو خدا ہی سمجھے!
جس نے اُس مدھ بھری آنکھوں کی ندامت دیکھی



واعظ نے اور نہ زاہدِ شب زندہ دار نے ۔ مجھ کو جگا دیا مرے دل کی پُکار نے
تُم کو غرورِ حُسن ہے، لیکن یہاں یہ فکر ۔ چھوڑا ہے کس کو عشقِ دو عالم شکار نے
تسکینِ رُوح جب نہ کسی طرح ہو سکی ۔ سب اپنی اپنی دُھن میں لگے کچھ پکارنے
تکلیف و پردہ داری تکلیف، الاماں! ۔ مارا ہے مجھ کو خود مرے صبر و قرار نے
طنزاً وہ دیکھتے ہیں مگر دیکھتے تو ہیں ۔ یہ کام تو کیا دلِ ناکردہ کار نے

وہ عشق ہی نہیں ہے، وہ دل ہی نہیں جگر
لبیک خود کہا نہ جسے حُسنِ یار نے



شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے ۔ کُچھ اس میں اُن کی توجّہ بھی پائی جاتی ہے
یہ عمر عشق یونہی کیا گنوائی جاتی ہے؟ ۔ حیات زندہ حقیقت بنائی جاتی ہے
بنا بنا کے جو دُنیا مٹائی جاتی ہے ۔ ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے
ہمیں یہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے ۔ مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے
خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے ۔ وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے

گنہگار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد	یہیں کہیں تری جنّت بھی پائی جاتی ہے
نہ سوزِ عشق، نہ برقِ جمال پر الزام	دلوں میں آگ خوشی سے لگائی جاتی ہے
کچھ ایسے اب بھی ہیں رنداں پاکباز جگر
کہ جن کو بے مے و ساغر پلائی جاتی ہے



نقابِ حُسنِ دو عالم اُٹھائی جاتی ہے	مجھی کو میری تجلّی دکھائی جاتی ہے
قدم قدم مری ہمّت بڑھائی جاتی ہے	نفس نفس تری آہٹ سی پائی جاتی ہے
وہ اک نظر جو بہ مشکل اُٹھائی جاتی ہے	وہی نظر رگ و پے میں سمائی جاتی ہے
سکوں ہے موت یہاں ذوقِ جستجو کیلئے	یہ تشنگی وہ نہیں جو بجھائی جاتی ہے
خدا وہ دردِ محبت ہر ایک کو بخشے!	کہ جس میں رُوح کی تسکیں بھی پائی جاتی ہے
وہ مے کدہ ہے تری انجمن، خدا رکھے!	جہاں خیال سے پہلے پلائی جاتی ہے
ترے حضور یہ کیا وارداتِ قلب ہے آج؟	کہ جیسے چاند پہ بدلی سی چھائی جاتی ہے
تجھے خبر ہو تو اتنی نہ فرصتِ غم دے	کہ تیری یاد بھی اکثر ستائی جاتی ہے
وہ چیز، کہتے ہیں فردوسِ گمشدہ جس کو	کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے
قریبِ منزلِ آخر ہے، الفراق جگر!
سفر تمام ہوا، نیند آئی جاتی ہے



نہ اب مُسکرانے کو جی چاہتا ہے	نہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے
ستاتے نہیں وہ تو اُن کی طرف سے	خود اپنے ستانے کو جی چاہتا ہے
کوئی مصلحت روک دیتی ہے، ورنہ	پلٹ دیں زمانے کو، جی چاہتا ہے
تجھے بُھول جانا تو ہے غیر ممکن	مگر بُھول جانے کو جی چاہتا ہے
تواضع کر اے عشق! چند آنسوؤں سے	بہت مُسکرانے کو جی چاہتا ہے
بہت دیر تک چُھپ کے تیری نظر سے	تجھے دیکھ پانے کو جی چاہتا ہے
تری آنکھ کو بھی جو بے خواب کر دے	وہ فتنہ جگانے کو جی چاہتا ہے
حسیں تیری آنکھیں، حسیں تیرے آنسو	یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے
جگر اب تو وہ ہی یہ کہتے ہیں مجھ سے
ترے ناز اُٹھانے کو جی چاہتا ہے



جلوہ بہ قدرِ ظرفِ نظر دیکھتے رہے
کیا دیکھتے ہم اُن کو، مگر دیکھتے رہے
اپنا ہی عکس پیشِ نظر دیکھتے رہے
آئینہ روبرو تھا، جدھر دیکھتے رہے
کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل کے لگی تھی آگ!
اندھیر ہے کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے
لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گذر گئے
بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے
اُن کی حریم[1] ناز کہاں، اور ہم کہاں
نقش و نگارِ پردۂ در دیکھتے رہے
ایسی بھی کچھ فراق کی راتیں گذر گئیں
جیسے انہیں کو پیشِ نظر مگر دیکھتے رہے
ہیں دورِ بے دلی کی وہ مجبوریاں بھی یاد
آنکھیں تھیں سوگوار، مگر دیکھتے رہے
ہر لحظہ شانِ حُسن بدلتی رہی جگر
ہر آن ہم جہانِ دگر دیکھتے رہے



یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو، مرنے کے لئے تیار ہو جائے
وہی مے خوار ہے، جو اس طرح مے خوار ہو جائے
کہ شیشہ توڑ دے اور بے پئے سرشار ہو جائے
دلِ انسان اگر شائستۂ اسرار ہو جائے
لبِ خاموشِ فطرت ہی لبِ گفتار ہو جائے
ہر اِک بے کار سی ہستی بہ روئے کار ہو جائے
جُنوں کی رُوحِ خوابیدہ اگر بیدار ہو جائے
سنا ہے حشر میں ہر آنکھ اُسے بے پردہ دیکھے گی
مجھے ڈر ہے، نہ توہینِ جمالِ یار ہو جائے
حریمِ ناز میں اس کی رسائی ہو، تو کیوں کر ہو؟
کہ جو آسودہ زیرِ سایۂ دیوار ہو جائے؟
معاذ اللہ، اس کی وارداتِ غم، معاذ اللہ!
چمن جس کا وطن ہو، اور چمن بیزار ہو جائے
یہی ہے زندگی، تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے
اِک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اُٹھے
نظر تلوار بن جائے، نفس جھنکار ہو جائے
یہ روز و شب، یہ صبح و شام، یہ بستی، یہ ویرانہ
سبھی بیدار ہیں انساں اگر بیدار ہو جائے



محبت صلح بھی، پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گُل بھی ہے، تلوار بھی ہے
طبیعت اس طرف خود دار بھی ہے
اُدھر نازک مزاجِ یار بھی ہے
ادائے عشق ادائے یار بھی ہے
بہت سادہ، بہت پُرکار بھی ہے
یہ فتنے، جن سے اِک دُنیا ہے نالاں
انہی سے گرمیٔ بازار بھی ہے

---

[1] اس لفظ کی "تذکیر" میرے مذاقِ شعری کو پسند نہیں اور میں اس کو ہمیشہ تانیث استعمال کرتا ہوں (جگر)

جنوں کے دم سے ہے نظمِ دو عالم — جنوں برہم زنِ افکار بھی ہے
نفس پر ہے مدارِ زندگانی — نفس چلتی ہوئی تلوار بھی ہے
اِسی انسان میں سب کچھ ہے پنہاں — مگر یہ معرفت دشوار بھی ہے
وہ بُوئے گُل کہ ہے جانِ چمن بھی — قیامت ہے، چمن بیزار بھی ہے
یہی دُنیا ہے بستی آنسوؤں کی!! — یہی دُنیا تبسّم زار بھی ہے
جہاں وہ ہیں، وہیں میرا تصوّر — جہاں میں ہوں، خیالِ یار بھی ہے
خبردار! اے سبک سارانِ ساحِل — یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے
غنیمت ہے کہ اس دورِ ہوس میں — ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے
جو کوئی سُن سکے تو نکہتِ گُل — شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

اِن آنکھوں کی زہے معجز بیانی
بہم انکار بھی، اقرار بھی ہے



نہ تابِ مستی، نہ ہوشِ ہستی، کہ شکرِ نعمت ادا کریں گے
خزاں میں جب ہے یہ اپنا عالم، بہار آئی تو کیا کریں گے؟
ہر ایک غم کو فروغ دے کر یہاں تک آراستہ کریں گے
وہی جو رہتے ہیں دُور ہم سے خود اپنی آغوش وا کریں گے
جدھر سے گذریں گے سرفروشانہ کارنامے سُنا کریں گے
وہ اپنے دل کو ہزار روکیں، مری محبت کو کیا کریں گے؟
نہ شکرِ غم زیرِ لب کریں گے، نہ شکوۂ بر ملا کریں گے
جو ہم پہ گذرے گی، دل ہی دل میں کہا کریں گے، سُنا کریں گے
ترے تصوّر سے حاصل اتنا کمالِ کسبِ ضیا کریں گے
جہاں کچھ آنسو ٹپک پڑیں گے، ستارے سجدے کیا کریں گے
یہ ظاہری جلوہ ہائے رنگیں فریب کب تک دِیا کریں گے؟
نظر کی جو کر سکے نہ تسکیں، وہ دِل کی تسکین کیا کریں گے؟
وہاں بھی آہیں بھرا کریں گے، وہاں بھی نالے کیا کریں گے
جنہیں ہے تجھ سے ہی صرف نسبت، وہ تیری جنّت کو کیا کریں گے؟
نہیں ہے جن کو مجالِ ہستی، سوائے اس کے وہ کیا کریں گے

کہ جس زمیں کے ہیں بسنے والے اُسے بھی رسوا کیا کریں گے؟
یہاں نہ دُنیا نہ فکرِ دُنیا، یہاں نہ عُقبیٰ نہ فکرِ عُقبیٰ
جنہیں سرِ ماسوا بھی ہو گا، وہی غمِ ماسوا کریں گے
ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں، ہم اپنی کیوں وضعِ خاص بدلیں
کہ انقلاباتِ نَو بہ نَو تو ہُوا کئے ہیں، ہُوا کریں گے
یہ سخت تر عشق کے مراحل، یہ ہر قدم پر ہزار احساں
جو بچ رہے تو جنوں کے حق میں، جئیں گے جب تک، دُعا کریں گے
یہ خام کارانِ عشق سوچیں، یہ شکوہ سنجانِ حسن سمجھیں
کہ زندگی خود حسیں نہ ہو گی تو پھر توجہ وہ کیا کریں گے؟
خود اپنے ہی سوزِ باطنی سے نکال اک شمعِ غیر فانی!
چراغِ دیر و حرم تو اَے دِل، جلا کریں گے، بجھا کریں گے



کس کا خیال، کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گذر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے
چہرے پہ برہمی ہے، تبسم نظر میں ہے
اب کیا کمی تباہیٔ قلب و جگر میں ہے
اک روشنی سی آج ہر اک دشت و در میں ہے
کیا میرے ساتھ خود مری منزل سفر میں ہے
تسلیم حُسنِ دوست کی معصومیاں، مگر
شامل تو کوئی فتنۂ شام و سحر میں ہے
صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں!
اِک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے
یا رب! وفائے عذرِ محبت کی خیر ہو
نازک سا اعتراف بھی آج اُس نظر میں ہے
سمجھے تھے دُور تجھ سے نکل جائیں گے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہ گذر میں ہے
کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے، مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے



زندگی ہے، مگر پرائی ہے
مرگِ غیرت! تری دُہائی ہے
جب مسرت قریب آئی ہے
غم نے کیا کیا ہنسی اُڑائی ہے
حُسن نے جب شکست کھائی ہے
عشق کی جان پر بن آئی ہے
عشق کو زعمِ پارسائی ہے
حُسنِ کافر! تری دُہائی ہے
ہائے وہ سبزۂ چمن کہ جسے
سایۂ گُل میں نیند آئی ہے

عشق ہے اُس مقام پر کہ جہاں زندگی نے شکست کھائی ہے
خاکِ منزل کو مُنہ سے ملتا ہُوں یادگارِ شکستہ پائی ہے
اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے
ہجر سے شاد، وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگرؔ نے پائی ہے



اگر جمالِ حقیقت سے ربط محکم ہے نفس نفس میں نئی زندگی کا عالم ہے
نہیں مقابلہ کوئی، مگر یہ کیا کم ہے خود آفتابِ درخشاں حریفِ شبنم ہے
الٰہی خیر! یہ کیا شام ہی سے عالم ہے کہ جیسے آج ستاروں میں روشنی کم ہے؟
نہ کوئی خُلد، نہ زاہد! کوئی جہنّم ہے خود اپنی اپنی نظر، اپنا اپنا عالم ہے
ہر ایک قطرے میں دریائے معرفت ہے رواں مگر نصیب ہو کیونکر کہ پیاس ہی کم ہے
ابھی کمال کو پہنچی نہیں ہے فطرتِ عشق کہ آدمی کو ہنوز انتظارِ آدم ہے
جنوں بھی ساتھ نہ دے اب، تو کچھ نہیں پروا خوشا کہ تیری نگاہوں سے ربطِ محکم ہے!
جو گوشِ دل شُنوا ہو، تو بزمِ ہستی میں سکوتِ ساز بھی اِک نغمۂ مجسّم ہے
خزاں کا رنج کرے عشق میں بلا میری نہیں بہار، تو یادِ بہار کیا کم ہے؟
حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرتِ شاعر ہنسے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے
خوشی میں بھول نہ جانا جگرؔ یہ رازِ حیات
کہ جو خوشی ہے یہاں، اک امانتِ غم ہے



حُسن و صورت کے، نہ حسرت کے، نہ ارمانوں کے
اُف! کہ انسان ہیں مارے ہوئے انسانوں کے!
کیا مقامات ہیں ان سوختہ سامانوں کے
خضر خود بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے!
انہیں ذرّات میں خاموش سے ویرانوں سے
دِل دھڑکتے نظر آئے مجھے اِنسانوں سے
جلوۂ دوست، یہ آہستہ خرامی تاچند؟
ندیاں سوکھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

موجِ مے، رنگِ شفق، لالہ و گل، مطلعِ صبح
چند عنواں ہیں مرے شوق کے افسانوں کے
اسی کشتی کو نہیں تابِ تلاطم، صد حیف!
جس نے منہ پھیر دیئے تھے کبھی طوفانوں کے
حسن کی جلوہ گری سے ہے محبت کا جنوں
شمع روشن ہوئی، پر لگ گئے پروانوں کے
مرحبا! جذبۂ بے باکِ جوانانِ وطن!!
تیغ چم خم ہے، مگر ہاتھ میں نادانوں کے
ناز ہے شلبۂ فطرت کو بھی جن پر، ہمدم!
وہ چمن سب ہیں لگائے ہوئے دیوانوں کے
میں نے دیکھا ہے اسے روپ میں فطرت کے جگر
میں نے پایا ہے اسے بھیس میں انسانوں کے



رگ رگ میں ایک برقِ خراماں لئے ہوئے
دل ہے ہوائے منزلِ جاناں لئے ہوئے
دل ہے تجلّیات کا طوفاں لئے ہوئے
لیکن حجابِ دیدۂ حیراں لئے ہوئے
ناصح! گدازِ عشق کی معراج دیکھنا
ہر قطرہ خوں ہے شمعِ فروزاں لئے ہوئے
وہ سامنے تو آئے مگر اِس ادا کے ساتھ
اِک طرزِ التفاتِ گریزاں لئے ہوئے
دل کو ہے کیوں گلہ کہ بظاہر تو وہ نگاہ
نشتر لئے ہوئے ہے، نہ پیکاں لئے ہوئے
کانٹوں میں جیسے پھول جہنم میں جیسے خلد
آنکھیں ہیں یوں ندامتِ عصیاں لئے ہوئے
اہلِ سلامتی کی طرف سے اُسے سلام
کشتی جو غرق ہو گئی طوفاں لئے ہوئے
دل میں کہاں اُمید و تمنا کا وہ ہجوم؟
پھرتا ہوں ایک جنّتِ ویراں لئے ہوئے
ہونا تھا چاک چاک گریباں کو، اے جنوں!
لیکن کسی کا گوشۂ داماں لئے ہوئے
ہر مرحلہ سے عشق گذرتا چلا گیا
دل میں ادائے حُسنِ گریزاں لئے ہوئے
پھولوں کو نازِ حسن اگر ہے تو ہو جگر
کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لئے ہوئے



کس کا خیال ہے دلِ مضطر لئے ہوئے — آنکھیں ہیں رنگ و بوئے گلِ تر لئے ہوئے
آئی ہے موت جن کا منظر لئے ہوئے — لیکن غمِ حیات مکرّر لئے ہوئے
ہر لحظہ اک سرورِ مضطر لئے ہوئے — خود زندگی ہے بادہ و ساغر لئے ہوئے
ہشیار، اے نگاہِ ستم آشنائے دوست! — دل بھی ہے اک لطیف سا نشتر لئے ہوئے
کونین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل و خوار — کونین اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے
دنیا بھی کیا مقام ہے، جس میں کہ بارہا — ہنسنا پڑا ہے قلبِ مکدّر لئے ہوئے
شرمِ گنہ سے بڑھ کے ہے عفوِ گنہ کی شرم — یارب! کہاں میں جاؤں یہ نشتر لئے ہوئے؟
عصیاں کا بار ہٹ تو گیا سر سے، اے کریم! — لیکن ہوں ایک بوجھ سا دل پر لئے ہوئے
اللہ رے بے بسی کہ غمِ روزگار بھی — بیٹھا ہوں ترے غم کے برابر لئے ہوئے
اُف رے تجلّیِ رُخِ ساقی، کہ بادہ کش — رہ رہ گئے ہیں ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر
چھچھرا کی قتل گاہ کا منظر لئے ہوئے



راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے — سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے
سخت خونریز جب آشوبِ جہاں ہوتا ہے — نہیں معلوم، یہ انساں کہاں ہوتا ہے
جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے — ذرّہ ذرّہ مری جانب نگراں ہوتا ہے
جو نظر کردۂ صاحب نظراں ہوتا ہے — اُسی دیوانے کے قدموں پہ جہاں ہوتا ہے
جب کوئی عشق میں بربادِ جہان ہوتا ہے — مجھ کو محسوس خود اپنا ہی زیاں ہوتا ہے
متزلزل ہے ادب گاہِ محبت کی زمیں — کوئی دیکھے تو یہ ہنگامہ کہاں ہوتا ہے
کہیں ایسا تو نہیں، وہ بھی ہو کوئی آزار — تجھ کو جس چیز پہ راحت کا گماں ہوتا ہے
دلِ غنی ہو تو ہر اک رنج بھی دل کی راحت — ذہن مفلس ہو تو ہر سُود زیاں ہوتا ہے
امتحاں گاہِ محبت میں نہ رکھے وہ قدم — موت کے نام سے جس کو خفقاں ہوتا ہے
یہی وہ منزلِ دشوار ہے، جس منزل میں — ختم ہر مرحلۂ سُود و زیاں ہوتا ہے
ہر قدم معرکۂ کرب و بلا ہے در پیش — ہر نفس سانحۂ مرگِ جواں ہوتا ہے

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ! جگر
اسی جنّت پہ جہنّم کا گماں ہوتا ہے

☆——☆——☆

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے، جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

ہائے وہ وقت کہ جب حسن پہ آتا ہے شباب
اُف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے

کبھی اک زندہ حقیقت نظر آتا ہے جہاں
کبھی ہر علم و یقیں، وہم و گماں ہوتا ہے

دل کو بیدرد محبت میں بتانے والے
دل سا ہمدرد زمانے میں کہاں ہوتا ہے؟

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں کہ جب
دل پہ احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے

ہائے وہ سلسلۂ اشک کو جو تیرے حضور
دل میں رُکتا ہے نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے

عزمِ بیباک اگر ہو تو کہاں کی دُوری؟
حُسن خود منتظرِ عشقِ جواں ہوتا ہے

شرح و تفصیل سے بیگانہ گذر جا، اے دوست!
عقل بڑھتی ہے، مگر دل کا زیاں ہوتا ہے

رُوح بن جاتی ہے خود نغمۂ بے ساز و صدا
ختم جب معرکۂ لفظ و بیاں ہوتا ہے

وسعتِ فکر و نظر بھی نہ مجھے راس آئی!
ہر تبسم پہ جراحت کا گُماں ہوتا ہے

ساز و مُطرب کے کرشموں پہ نہ جانا کہ یہاں
اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

انقلابات سے کیا خوف کہ ہر عزمِ جگر
اسی آغوش میں پلتا ہے، جواں ہوتا ہے



آج بھی یوں تو ہر اک رند جواں ہے ساقی
مگر اک آن جو پہلے تھی کہاں ہے ساقی

زندگی سلسلۂ خوابِ گراں ہے ساقی
لاتو، وہ فتنۂ بیدار کہاں ہے ساقی؟

حرم و دیر کا چھٹنا تو گوارا، لیکن
دل کو آرام وہاں تھا نہ یہاں ہے ساقی

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے!
آدمی ہوں، مرے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

اپنے منصب کا نہ احساس، نہ رندوں کی خبر
دیر سے آج خدا جانے کہاں ہے ساقی!

زیست ہے یا تری نظروں کے اشاراتِ لطیف
موجِ صہبا ہے کہ فردوسِ رواں ہے ساقی!



ہر و حلقہ جو تری کاکلِ شب گیر میں ہے
گوشۂ امن بلا خانۂ زنجیر میں ہے

شاہدِ رُوح کہاں، جلوہ گہِ ناز کہاں
خاک مصروف ابھی خاک کی تعمیر میں ہے

کون سمجھائے یہ قاصد کو دمِ رخصتِ شوق
ربطِ محکم اسی بے ربطیٔ تحریر میں ہے

اپنے سر آپ نہ لیں دل شکنی کا الزام!
مجھ کو معلوم ہے، جو کچھ مری تقدیر میں ہے

خود کھچے آتے ہیں زنداں کی طرف دیوانے
کوئی تو وجہِ کشش نالۂ زنجیر میں ہے

دیکھنا جبرِ مشیت کہ بقیدِ زنداں!
پاؤں زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے

چُھپ کے پہروں اُسے اے دیکھنے والے، یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں، جو مری تصویر میں ہے؟



شرما گئے، لجا گئے، دامن چھڑا گئے
اے عشق! مرحبا، وہ یہاں تک تو آ گئے
دل پر ہزار طرح کے اوہام چھا گئے
یہ تم نے کیا کیا، مری دُنیا میں آ گئے؟
سب کچھ لٹا کے راہِ محبت میں اہلِ دل
خوش ہیں کہ جیسے دولتِ کونین پا گئے
صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے
عقل و جنوں میں سب کی تھیں راہیں جدا جدا
ہر پھر کے لیکن ایک ہی منزل پہ آ گئے
اب کیا کروں میں فطرتِ ناکامِ عشق کو
جتنے تھے حادثات، مجھے راس آ گئے



یوں تو ہونے کو گلستاں بھی ہے، ویرانہ بھی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں کوئی دیوانہ بھی ہے
بات سادہ ہی سہی، لیکن حکیمانہ بھی ہے
یعنی ہر انسان بقدرِ ہوش دیوانہ بھی ہے
ہوشیار، او مستِ صہبائے تغافل، ہوشیار!
عشق کی فطرت میں اک شانِ حریفانہ بھی ہے
ہوش میں رہتا، تو کیا جانے کہاں رکھتا قدم
یہ غنیمت ہے، مزاجاً عشق دیوانہ بھی ہے
کس جگہ واقع ہوا ہے حضرتِ واعظ کا گھر!
دُور مسجد بھی نہیں، نزدیک میخانہ بھی ہے
مِلتا جُلتا ہے مزاجِ حُسن ہی سے رنگِ عشق
شمع گر بے باک ہے، گستاخ پروانہ بھی ہے
زندگانی تا کُجا صرفِ مئے جام و سبو؟
بے خبر، مے خانہ میں اک اور مے خانہ بھی ہے
خیر ہے زاہد، یہ کیسا انقلاب آیا کہ آج
تیرے ہر انداز میں اک کیفِ رندانہ بھی ہے؟
حاصلِ ہر جستجو آخر یہی نکلا جگر
عشق خود منزل بھی ہے، منزل سے بے گانہ بھی ہے



ہر تجلّی یہیں نظر آئی
اُف رے تیری حجاب آرائی!
دل نے لغزش جہاں کوئی کھائی
ایک آواز کان میں آئی
یوں تو وہ شکوہ سنجِ رُسوائی
اور در پردہ ہمّت افزائی
زندگی تُو ہمیں کہاں لائی؟
اک محبت، ہزار رُسوائی
مجھ کو شکوہ ہے اپنی آنکھوں سے
تم نہ آئے تو نیند کیوں آئی؟
نیچی نظروں سے دیکھنے والے
دیکھنا زخمِ دِل کی گہرائی

عشق کی بد حواسیاں توبہ! بار ہا خود مجھے ہنسی آئی
عشق میں عشق کی بلا جانے نا پذیرائی و پذیرائی
دو دل اس طرح مل گئے ناگاہ جیسے برسوں کی ہو شناسائی
پھول بننا تھا، مُسکرانا تھا وہ کلی ہی نہ تھی جو مُرجھائی
کار گاہِ حیات میں، اے دوست! یہ حقیقت نظر آئی
ہر اُجالے میں تیرگی دیکھی ہر اندھیرے میں روشنی پائی

اب یہ محسوس ہو چلا ہے جگر
موت ہے، زندگی کی تنہائی



خود وہ اُٹھے ہیں جام لئے اب وہ کافر ہے جو نہ پیے
اُن کی بلا سے، اُن کے لئے کوئی مرے یا کوئی جیے

ہم بھی گرے سو بار، مگر
اُن کو بھی اپنے ساتھ لئے



جان کر مِن جملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے مدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
ننگِ مے خانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا؟ پینے والے کہہ اُٹھے "یا پیرِ مے خانہ" مجھے
سبزہ و گُل، موجِ دریا، انجم و خورشید و ماہ اک تعلق سب سے ہے، لیکن رقیبانہ مجھے
زندگی میں آ گیا جب کوئی وقتِ امتحاں اُس نے دیکھا ہے جگر بے اختیارانہ مجھے



آ پڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایّام سے زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے
جب کبھی بچ کر چلا ہوں جلوہ گاہِ عام سے بچ گئے ہیں خود مری فکر و نظر کے دام سے
کچھ اُنہیں بھی ربط میری حسرتِ ناکام سے اور کچھ میں بھی گُریزاں التفاتِ عام سے
ہو گیا ہے درہم و برہم نظامِ مے کدہ جب کبھی توبہ مری ٹکرا گئی ہے جام سے
اُن کی محفل کا تو کیا کہنا، مگر اے ہم نشیں! رنگِ محفل کہہ رہا ہے، دل ہیں بے آرام سے

آج کل مے خانہ میں تقسیم ہوتے ہیں جگر
زہر کے ساغر، شرابِ زندگی کے نام سے



جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے
ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے؟
ضد پہ عشق اگر آ جائے
پانی چھڑکے آگ لگائے
دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے لیکن راہ نہ پائے
کیسا مجاز اور کیسی حقیقت؟
اپنے ہی جلوے، اپنے ہی سائے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرّت
رُوح اگر تسکین نہ پائے
کارِ زمانہ جتنا جتنا
بنتا جائے، بگڑتا جائے
ضبطِ محبت، شرطِ محبت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے
حُسن وہی ہے حُسن، جو ظالم
ہاتھ لگائے، ہاتھ نہ آئے
نغمہ وہی ہے نغمہ، کہ جس کو
رُوح سُنے اور رُوح سنائے

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے



صحنِ کعبہ نہ سہی، کوئے صنم خانہ سہی
خاک اُڑانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی
زندگی تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اس میں کچھ چاشنیِ مشربِ رندانہ سہی
آپ سے جس کو ہو نسبت، وہ جنوں کیا کم ہے
دونوں عالم نہ سہی، اِک دلِ دیوانہ سہی
اپنی شوریدہ مزاجی کو کہاں لے جاؤں؟
تیرا ایما نہ سہی، تیرا اشارہ نہ سہی
زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے
اے جنوں! اور بھی اِک لغزشِ مستانہ سہی
یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، یہ بہار
محتسب آج تو شغلِ مے و پیمانہ سہی
حسن خود پردہ کشائے رُخِ مقصود تو ہے
عشق کو حوصلۂ عرضِ تمنا نہ سہی
کون ایسا ہے یہاں، عشق ہے جس کا بے لاگ؟
آپ کی جان سے دُور آپ کا دیوانہ سہی
زندگی آج بھی دل کش ہے انہیں کے دم سے
حسن اِک خواب سہی، عشق اِک افسانہ سہی
تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں؟
کچھ نہیں ہے تو شکستِ خُم و خُم خانہ سہی
میں نہ زاہد سے ہوں شرمندہ، نہ صوفی سے جگر
مسلکِ عشق مرا، مسلکِ رندانہ سہی



یہ راز ہم پر ہُوا نہ افشا، کسی کی خاص اک نظر سے پہلے
کہ تھی ہماری ہی کم نگاہی، ہمیں تھے کچھ بے خبر سے پہلے

یہ زندگی، خاک زندگی تھی، گداز قلب و جگر سے پہلے!
ہر ایک شے غیر معتبر تھی، ترے غمِ معتبر سے پہلے
تجھے ہو سیرِ چمن مبارک! مگر یہ رازِ چمن بھی سُن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی، شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے
کہاں کہاں اُڑ کے پہنچے شعلے، یہ ہوش کس کو، یہ کون جانے؟
ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک، لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے
قفس کی نازک سی تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے، ہم صفیرو!
مگر اُلجھنا پڑے گا شاید، خُود اپنے ہی بال و پر سے پہلے
کہاں یہ شورش، کہاں یہ مستی، کہاں یہ رنگینیوں کا عالم!
زمانہ خواب و خیال سا تھا ترے فسونِ نظر سے پہلے
خوشا یہ بیمارئ محبت، زہے یہ خود دارئ طبیعت!!
وہی ہیں مصروفِ دل نوازی، وہی جو تھے بے خبر سے پہلے
زمانہ مانے نہ مانے، لیکن ہمیں یہی ہے یقینِ کامل
جہاں اُٹھا کوئی تازہ فتنہ، اُٹھا تری رہگذر سے پہلے
اگرچہ ذوقِ نظارہ میں بھی ہزار سرمستیاں بھری تھیں!
مگر یہ بے باکیاں کہاں تھیں، ترے حجابِ نظر سے پہلے؟
اُٹھا جو چہرے سے پردۂ شب، سمٹ کے مرکز پہ آ گئے سب
تمام جلوے جو منتشر تھے طلوعِ حُسنِ بشر سے پہلے
مری طبیعت کو حُسنِ فطرت سے ربطِ باطن نہ جانے کیا ہے!
مری نگاہیں کبھی نہ اُٹھیں طہارتِ چشمِ تر سے پہلے
وہ یادِ آغازِ عشق اب تک انیسِ جان و دلِ حزیں ہے
وہ اک جھجک سی، وہ اک جھپک سی، ہر التفاتِ نظر سے پہلے
ہمیں تھے کیا جُستجو کا حاصل، ہمیں تھے کیا آپ اپنی منزل؟
وہیں پہ آ کر ٹھہر گیا دل، چلے تھے جس رہگذر سے پہلے
بس ایک دل اور کیف و لذّت، بس ایک ہم اور جمالِ فطرت
یہ زندگی کس قدر حسیں تھی، شعور فکر و نظر سے پہلے!
ہمارے شوقِ جنُوں ادا کی، ستم ظریفی تو کوئی دیکھے!

کہ نامہ بر کو روانہ کر کے پہنچ گئے نامہ بر سے پہلے
کہاں تھی یہ رُوح میں لطافت، کہاں تھی کونین میں یہ وُسعت؟
حیات ہی جیسے سو رہی تھی، کِسی کی پہلی نظر سے پہلے
یہ نالہ کیوں ہے؟ یہ نغمہ کیوں ہے؟ یہ آہ کیسی؟ یہ واہ کیسی؟
یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے!



اگر نہ زُہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی، کہاں گذرے؟
جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گذرے
کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گذرے
مجھے یہ وہم رہا مدّتوں کہ جراَتِ شوق
کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گذرے
ہر اک مقامِ محبت بہت ہی دل کش تھا
مگر ہم اہلِ محبت کشاں کشاں گذرے
جنوں کے سخت مراحل بھی تیری یاد کے ساتھ
حسیں حسیں نظر آئے، جواں جواں گذرے
مری نظر سے تری جستجو کے صدقے میں
یہ اک جہاں ہی نہیں، سینکڑوں جہاں گذرے
ہجومِ جلوہ میں پروازِ شوق، کیا کہنا!
کہ جیسے رُوح ستاروں کے درمیاں گذرے
خطا معاف، زمانے سے بد گُماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گُماں گذرے!
مجھے تھا شکوۂ ہجراں، کہ یہ ہُوا محسوس
مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گذرے
رہِ وفا میں اک ایسا مقام بھی آیا
کہ ہم خود اپنی طرف سے بھی بدگُماں گذرے
خلوص جس میں ہو شامل، وہ دورِ عشق و ہوس
نہ رائیگاں کبھی گذرا، نہ رائیگاں گذرے
اسی کو کہتے ہیں جنت، اسی کو دوزخ بھی
وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گذرے
بہت حسین مناظر بھی حُسنِ فطرت کے
نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گذرے!
وہ جن کے سائے سے بھی بجلیاں لرزتی تھیں
مری نظر سے کچھ ایسے بھی آشیاں گذرے
مرا تو فرض چمن بندئ جہاں ہے فقط
مری بلا سے بہار آئے یا خزاں گذرے
کہاں کا حُسن، کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی
رہِ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گذرے
بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ
خدا کرے، نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گذرے!
کوئی نہ دیکھ سکا جن کو، وہ دلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گذرے
کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گذرے
بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی، مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گذرے
ابھی سے تجھ کو بہت ناگوار ہیں، ہمدم!
وہ حادثات جو اب تک رواں دواں گذرے

جنہیں کہ دیدۂ شاعر ہی دیکھ سکتا ہے　　وہ انقلاب ترے سامنے کہاں گذرے
بہت عزیز ہے مجھ کو انہیں کی یاد جگرؔ
وہ حادثاتِ محبت جو ناگہاں گذرے



آدمی، آدمی سے ملتا ہے　　دل مگر کم کسی سے ملتا ہے
بھول جاتا ہوں میں ستم اُس کے　　وہ کچھ اِس سادگی سے ملتا ہے
آج کیا بات ہے کے پھولوں کا　　رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے
سلسلہ فتنۂ قیامت کا　　تیری خوش قامتی سے ملتا ہے
مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا　　ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے
کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں　　ہوش جب بیخودی سے ملتا ہے
رُوح کو بھی مزا محبت کا!
دل کی ہمسائیگی سے ملتا ہے



افشاں

لطیف طبع کو لازم ہے سوزِ غم بھی لطیف — چمن میں آتشِ گل کا کبھی دھواں نہ رہا



ہم نا مرادِ شوق جئے بھی تو کیا جئے! — آنا تھا مفت یہ بھی اک الزام، آ گیا
کیا کیا نگاہِ دوست ہوئی مجھ سے بدگماں! — دم بھر کے واسطے بھی جو آرام آ گیا



کیا کرے گا وہ کسی اور کا شیدا ہو کر — جس نے اپنے کو نہ سمجھا کبھی اپنا ہو کر
طعن کیا کیا نہ فرشتوں نے کیے تھے جس پر — عرش پیما ہے وہی، خاک کا پُتلا ہو کر
ہے جو ملنا ہی مقدر، تو برابر سے ملے — قطرہ دریا میں سمائے بھی تو دریا ہو کر



چھپتا ہے کہیں بانیٔ بیدار کا عالم! — ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ فریاد کا عالم
دیکھ اے نگہِ شوق، یہیں تک نہ ٹھہرنا — اک اور بھی ہے حُسنِ خدا داد کا عالم



بُجھے گی سوزِ غم سے رُوح کی پیاس — اسی شعلہ کو بن جانا ہے شبنم



اُن کی جفا پہ ترکِ وفا کر رہا ہوں میں — سائے کو زندگی سے جُدا کر رہا ہوں میں
میری ادائے شکرِ حضوری تو دیکھنا! — صد شکوۂ فراق نُما کر رہا ہوں میں



اللہ اللہ، آج حُسنِ دوست کی غمازیاں! — عشق ہی کو صرف اپنا رازداں سمجھا تھا میں



ارے غضب، ارے ستم، وہ اِک نگاہِ سحر فن — جُھکے اگر تو بُت کدہ، اُٹھے اگر تو بُت شکن



دیکھا ہے عشق ہی میں یہ عالم بھی بار بار — جس کا معاملہ ہو، اُسی کو خبر نہ ہو



جگر ان حوادث سے گھبرا نہ جانا — یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ



محبت رہ گئی، بن کر مکمل زندگی اپنی — مبارک بیخودی اپنی، سلامت باخودی اپنی
زمانہ تھا کبھی اپنا، یہ دُنیا تھی کبھی اپنی — مگر اب تو نہ شامِ غم، نہ صبحِ زندگی اپنی
نگاہیں چار ہوتے ہی طلسمِ ظاہری ٹوٹا — حقیقت نے حقیقت جان لی، پہچان لی اپنی



وہ کیا گئے بہارِ گلستاں لئے ہوئے — ہر پھول ہے جراحتِ پنہاں لئے ہوئے
دل بھی وہی ہے، غم بھی وہی، پھر یہ کیا آج — ہر اشک ہے تبسمِ پنہاں لئے ہوئے؟



بہ شکلِ ناخدا جس میں ہیں اب تک جعفر و صادق — وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے



تو ہلاکِ ہوش و تمکیں، میں شہیدِ کیف و مستی — تری زندگی بھی مستی، مری زندگی بھی مستی



ڈگمگانے لگے ہیں پائے طلب — دل ابھی ابتدائے راہ میں ہے
میرے پندارِ عشق پر مت جا — یہ ادائے نازِ گاہ گاہ میں ہے



تجدیدِ مُلاقات

مدّت میں وہ پھر تازہ مُلاقات کا عالم — خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم
نغموں میں سمویا ہُوا وہ رات کا عالم — وہ عطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم
اللہ رے، وہ شدّتِ جذبات کا عالم! — کچھ کہہ کے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم
چھایا ہوا وہ نشۂ صہبائے محبت — جس طرح کسی رندِ خرابات کا عالم
وہ سادگیٔ حسن، وہ محجوب نگاہی — وہ محشرِ صد شکر و شکایات کا عالم
نظروں سے وہ معصوم محبت کی تراوش — چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم
عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے دو قطرے — آنکھوں سے جھلکتا ہُوا برسات کا عالم
بے شرطِ تکلف و پذیرائی اُلفت — بے قیدِ تصنّع وہ مدارات کا عالم

ایک ایک نظر شعر و شباب و مے و نغمہ
ایک ایک ادا حسنِ محاکات کا عالم
وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دُنیا
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم
نازک سے ترنّم میں اشارات کے دفتر
ہلکے سے تبسّم میں کنایات کا عالم
پاکیزگی عصمت و جذبات کی دُنیا
دوشیزگی حُسنِ خیالات کا عالم
برہم وہ نظامِ دل و دُنیائے تمنّا
پیہم وہ شکستوں میں فتوحات کا عالم
وہ عشق کی بربادیٔ زندہ کا مُرقّع
وہ حسن کی پائندہ کرامات کا عالم
وہ عارضِ پُر نور، وہ کیفِ نگہِ شوق!
جیسے کہ دمِ صبح مناجات کا عالم
وہ جرأت بے باک، وہ شوخی، وہ شرارت
وہ حسن و محبت کی مساوات کا عالم
تھک جانے کے انداز میں وہ دعوتِ جُرأت
کھو جانے کی صُورت میں وہ جذبات کا عالم
شرمائی لجائی ہوئی وہ حُسن کی دُنیا
وہ مہکی ہوئی، بہکی ہوئی رات کا عالم
دو بچھڑے دلوں کی وہ بہم صُلح و صفائی
پُرکیف وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم
وہ عرش سے تا فرش برستے ہوئے انوار
وہ تہنیتِ ارض و سماوات کا عالم
تا صبح وہ تصدیقِ محبت کے نظارے
تا شام پھر وہ فخر و مباہات کا عالم

عالم مری نظروں میں جگر اور ہی کچھ ہے
عالم ہے اگرچہ وہی دن رات کا عالم



یاد

آئی جب اُن کی یاد تو آتی چلی گئی!
ہر نقشِ ما سوا کو مٹاتی چلی گئی
ہر منظرِ جمال دکھاتی چلی گئی
جیسے انہیں کو سامنے لاتی چلی گئی
ہر واقعہ قریب تر آتا چلا گیا
ہر شے حسین تر نظر آتی چلی گئی
ویرانۂ حیات کے ایک ایک گوشہ میں
جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
دل پھُنک رہا تھا آتشِ ضبطِ فراق سے
دیپک کو میگھار بناتی چلی گئی
بے حرف و بے حکایت و بے ساز و بے صدا
رگ رگ میں نغمہ بن کے سماتی چلی گئی
جتنا ہی کچھ سکون سا آتا چلا گیا
اتنا ہی بے قرار بناتی چلی گئی
کیفیتوں کو ہوش سا آتا چلا گیا
بے کیفیوں کو نیند سی آتی چلی گئی

کیا کیا نہ حسنِ یار سے شکوے تھے عشق کو — کیا کیا نہ شرمسار بناتی چلی گئی
تفریقِ حسن و عشق کا جھگڑا نہیں رہا — تمیزِ قُرب و بُعد مٹاتی چلی گئی
میں تشنہ کامِ شوق تھا، پیتا چلا گیا — وہ مست انکھڑیوں سے پلاتی چلی گئی
اک حسنِ بے جہت کی فضائے بسیط میں — اُڑتی گئی، مجھے بھی اُڑاتی چلی گئی
پھر میں ہُوں اور عشق کی بے تابیاں جگرؔ
اچھا ہُوا، وہ نیند کی ماتی چلی گئی



سراپا

وہ حسنِ کافر، اللہ اکبر! — تخریبِ دوراں، آشوبِ محشر
وہ قدِ رعنا، وہ روئے رنگیں — عالم ہی عالم، منظر ہی منظر
گیسو و عارض، شانہ بشانہ — شامِ معطر، صبحِ منوّر
شرمائیں جن سے ساون کی راتیں — وہ حلقہ ہائے زلفِ معنبر
مینا بدوشے، ساغر بہ چشمے — بربط بدستے، مے خانہ دربر
وہ مست نظریں جب اُٹھ گئی ہیں — ٹکرا گئے ہیں، ساغر سے ساغر
گفتارِ شیریں، رفتارِ نازک — خیّام و حافظ تسنیم و کوثر

کشور کشائے دلہائے خوباں — فرماں روائے جانہائے مضطر
شہکارِ فطرت، اعجازِ قدرت — تعبیرِ خوابِ مانی و آذر
گفتارِ مبہم، اجمالِ ہستی — رفتارِ برہم، تفسیرِ محشر
وہ بزمِ خلوت، وہ طرفِ گلشن — وہ دستِ سیمیں، وہ جامِ احمر
وہ حسنِ رقصاں، وہ جسمِ لرزاں — وہ عشقِ حیراں، وہ شوقِ مضطر
جانِ توجہ، روحِ تغافل — عُریاں تبسم، پوشیدہ نشتر
وہ امتزاجِ شرم و شرارت — وہ احتیاطِ آداب پرور
وہ موسمِ گل، وہ شیشہ و مُل — وہ کیف و مستی، وہ رُت، وہ منظر
نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو — صہبا ہی صہبا، ساغر ہی ساغر

(ناتمام)

قحطِ بنگال!

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دُور، مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن، خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بچّوں کا تڑپنا، وہ بلکنا، وہ سِسکنا
ماں باپ کو مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

بے مہری و بیدردی و افلاس و غلامی
ہے شامتِ اعمال، جدھر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے، مگر دیکھ رہا ہوں

تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ حکومت
تخریب بہ عنوانِ دِگر دیکھ رہا ہوں

ہر چند کہ آثار تو کچھ اور ہیں، لیکن
اِک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں

بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں اُمڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف اِن آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیّاد نے لُوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیّاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اربابِ وطن کو مری جانب سے ہو مُژدہ
اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں

اک تیغ کی چشمک سی نظر آتی ہے مجھ کو
اک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں
ہونے کو ہے اس شب کو سحر، دیکھ رہا ہوں

بیداری و آزادی و اخلاص و محبت
اک خلد در آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں

جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک
اس خواب کی تعبیر جگر دیکھ رہا ہوں



پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

ہندوستاں میں خیر سے اُن کی کمی نہیں
لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے

دیتے ہیں بات بات پر انسانیت کا درس
دل میں ہزار دشنہ و نشتر لئے ہوئے

چہرے جنونِ حبِ وطن سے دھوئیں دھوئیں
سینے خباثتوں کا سمندر لئے ہوئے

ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی
باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لئے ہوئے

کہتے ہیں، بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام — پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے
انسان جس میں بستے ہوں اس طرح کے جگر
بھاگ ایسی سرزمین سے بستر لئے ہوئے



آج کل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل
سازِ حیات، سازِ شکستہ ہے اِن دنوں — بزمِ خیالِ جنّتِ ویراں ہے آج کل
آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں! — سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آج کل
انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی — انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل
دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن — اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل
صحنِ چمن میں بُوئے وفا کا پتہ نہیں — رنگِ رُخِ بہار پُر افشاں ہے آج کل
تحصیلِ علم و کسبِ خطابت کے باوجود — تہذیبِ نفس سربہ گریباں ہے آج کل
کیسا خلوص، کس کی محبت کہاں کا درد؟ — خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آج کل
افسانہ بن گئی ہیں وسیع الخیالیاں — کم ظرفیٔ مزاج نمایاں ہے آج کل
سازش، دغا، فریب، سخن پروری، دروغ — ہر درد کا یہ نسخۂ آساں ہے آج کل
اخلاق ایک فن ہے جو عصرِ جدید میں — اندازِ حُسن بن کے نمایاں ہے آج کل
شائستگی کے بھیس میں یہ رُوحِ زندگی — انسان کے لباس میں شیطاں ہے آج کل
وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل — ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہے آج کل!
دہلی و دہرہ دون، نواکھالی و بہار — انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آج کل
ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں — ہے داغِ زندگی، جو مسلماں ہے آج کل
تعداد ایک فرقے کی جتنی بھی گھٹ سکے — کارِ ثواب و کارِ نمایاں ہے آج کل
وہ دن گئے کہ طائرِ مقصود تھا شکار — انسان کا شکار خود انساں ہے آج کل
کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیٔ وطن! — دراصل ایک پیکرِ بے جاں ہے آج کل
کانٹے کسی کے حق میں، کسی کو گل و ثمر — کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل
سرمایہ داریوں کی طرف داریاں ہیں سب — لیکن مفادِ عام کا عنواں ہے آج کل
ہونے کو یوں تو روز نئی ہیں عنایتیں — اُردو زباں پہ خاص کر احساں ہے آج کل

نسبت اب اس کو شاہدِ مستور سے کہاں؟ — شاعر ہے اور پیکرِ عریاں ہے آج کل
کچھ رہبرانِ قوم، جو مخلص ہیں واقعی — اُن کا چراغ بھی تہہ داماں ہے آج کل
لیکن میں دیکھتا ہوں کہ در پردۂ شہود — فطرت کا انتقامِ خراماں ہے آج کل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے، اے جگر!
وہ مصلحت، جو پیشۂ مرداں ہے آج کل



گاندھی جی کی یاد میں

وہی ہے شور ہائے وہو، وہی ہجوم مرد و زن — مگر وہ حسنِ زندگی، مگر وہ جنّتِ وطن
وہی زمیں، وہی زماں، وہی مکیں، وہی مکاں — مگر سرورِ یک دلی، مگر نشاطِ انجمن
وہی ہے شوقِ نو بہ نو، وہی جمالِ رنگ رنگ — مگر وہ عصمتِ نظر، طہارتِ لب و دہن
ترقیوں پہ گرچہ ہیں تمدّن و معاشرت — مگر وہ حسنِ سادگی، وہ سادگی کا بانکپن
شرابِ نو کی مستیاں کہ الحفیظ والاماں!! — مگر وہ اِک لطیف سا سرورِ بادۂ کہن
یہ نغمۂ حیات ہے، کہ ہے اجل ترانہ سنج — یہ دورِ کائنات ہے، کہ رقص میں ہے اہرمن؟
ہزار دو ہزار ہیں اگرچہ رہبرانِ مُلک — مگر وہ پیرِ نوجواں، وہ ایک مردِ صف شکن
وہی مہاتما، وہی شہیدِ امن و آشتی! — تھا پریم جس کی زندگی، خلوص جس کا پیرہن

وہی ستارے ہیں، مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند؟
وہی ہے انجمن، مگر کہاں وہ صدرِ انجمن!؟



آوازیں

اگرچہ صدیاں گذر چکی ہیں مگر رہے کاروبارِ فطرت!
وہی خزاں کا ہے رقصِ عریاں، وہی ہے جشنِ بہار اب بھی
چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر، چمن سے رُوٹھی بہار اب بھی
نسیم ہے آج بھی طرب زا، درخت ہیں سایہ دار اب بھی
مگر وہ انساں کہ جس کے چُھونے سے جلتے ہیں برگ و بار اب بھی

انہیں خبر کیا نہیں ہے اس کی، انہیں میں ہیں فتنہ کار اب بھی؟
مگر وہ ہیں وقت و مصلحت کے قدیم و تازہ شکار اب بھی
مصیبتوں کو پیامِ عشرت، کہ عقل ہے کج روی کی جانب
صعوبتوں کو نویدِ راحت، جنوں ہے آہستہ کار اب بھی
اگرچہ آزادیٔ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل
مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے نا ساز گار اب بھی
خود اپنی بد نیتی کے ہاتھوں بُرے نتائج بھگت رہے ہیں
صداقتوں سے، حقیقتوں سے، وہی ہے لیکن فرار اب بھی
زمین بدلی، زمانہ بدلا، مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی، وہی ہے بر رُوئے کار اب بھی
یہ زندگی غیر مطمئن سی، شکوک و شبہات کی یہ دُنیا
مگر وہ فرمائے جا رہے ہیں کہ رشتہ ہے استوار اب بھی
کوئی یہ چپکے سے اُن سے پوچھے، کہاں گئے آپ کے وہ وعدے؟
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی!
سفارشیں ظالموں کے حق میں پیامِ رحمت بنی ہوئی ہیں!
نہیں ہے شائستہ سماعت دُکھے دلوں کی پکار اب بھی
اِسی کا ہے نام اگر ترقی، تو اِس ترقی سے باز آئے
کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی
ہمیں مِلا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک

ہماری خاکِ لحد کے ذرّے ہیں اُن کے دامن پہ بار اب بھی
جو محوِ جشنِ نظامِ نو ہیں، پکار کر اُن سے کہہ رہا ہوں
یہ جان ہے سوگوار اب تک، یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی
منافقت کی ہزار باتیں وہ سنتے رہتے ہیں اور خوش ہیں
مگر صداقت کی صاف و سادہ سی بات ہے ناگوار اب بھی
نہ وہ مروّت، نہ وہ صداقت، نہ وہ محبت، نہ وہ شرافت
رہینِ خوف و خطر ہیں یعنی، سکونِ امن و قرار اب بھی

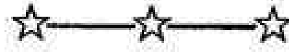
زبان و دل میں نہ ربطِ صادق، نہ باہمی وہ خلوصِ کامل
جو تھے غلامانہ زندگی میں، وہی ہیں لیل و نہار اب بھی
غلط یہ جمہوریت کے دعوے دروغ یہ زندگی کے نقشے
دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ و تار اب بھی
یہ جشنِ آزادیٔ وطن ہے، مگر اسی جشن و سرخوشی میں
بہت ہیں سینہ فگار اب بھی، بہت ہیں بے روزگار اب بھی
یہی جو سادہ سے قہقہے ہیں، یہی جو پھیکے سے ہیں تبسم!
انہیں کی تہ میں بہت سے اشکوں کے ہیں رواں آبشار اب بھی
گرانیاں اُس طرف وہ ارزاں، اِدھر یہ افلاس و تنگ دستی
مگر حکومت کا ہے یہ عالم، ذرا نہیں شرمسار اب بھی
ہزارہا انقلاب دیکھے، ہزارہا تجربوں سے گذرے
خرد میں تنگی، عمل میں لغزش، جنوں ہے ناپختہ کار اب بھی
یہ رشوتوں کی، یہ سازشوں کی، یہ نفع اندوزیوں کی لعنت
وہ خود ہی انصاف سے یہ کہہ دیں نہیں وہ کچھ ذمّہ دار اب بھی
انہیں کے حلقوں سے خود انہیں کی مخالفت عام ہو رہی ہے
ہماری جانب سے لیکن اُن کی نظر ہے بیگانہ وار اب بھی
کہاں کی دلداری و محبت، تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا؟
حقوق پامال کر رہے ہیں، حقوق کے پہرہ دار اب بھی
کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی، مسرّت آزادیوں کی حاصل
کہ عام انسانیت کا عالم ہے تشنہ و بے قرار اب بھی

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوصِ ایماں، خلوصِ نیّت
انہیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی
زمانہ کیا کیا نہ کہہ چکا ہے، زمانہ کیا کیا نہ کہہ رہا ہے
مگر وہ ہیں وضع دار ایسے، ذرا نہیں شرمسار اب بھی
خلوصِ نیّت سے صرف اپنی ہی زندگی پر کریں توجہ
خلوصِ نیّت کی منتظر ہے سعادتِ کردگار اب بھی

کبھی کبھی غور کرتے رہیئے، جگرؔ کا مصرع یہ پڑھتے رہیئے

چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

جگرؔ کی ہے زندگی محبت، نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگرؔ کے دل میں ہے سب کی عزت، جگرؔ ہے یاروں کا یار اب بھی



گذر جا!

بازیچۂ اربابِ سیاست سے گذر جا
اس کار گہ مکر و ضلالت سے گذر جا

ہر عشرتِ بے وقت و محنت سے گذر جا
جنت بھی میسّر ہو تو جنّت سے گذر جا

جرأت ہے تو ہر نیم صداقت سے گذر جا
ہمّت ہے تو محدود محبت سے گذر جا

ہر تنگ نظر اہلِ صحافت سے گذر جا
ہر سادہ و پُر کار عبادت سے گذر جا

الفاظ نہیں دام ہیں یہ مکر و دغا کے
زورِ قلم و جوشِ خطابت سے گذر جا

خود داریٔ بیباک شرافت کا ہے جوہر
اظہارِ وفا، جوشِ عقیدت سے گذر جا

تاچند یہ توہینِ حقوقِ رعیّت
اُٹھ اور اب اس قعرِ مذلّت سے گذر جا

سرتا بقدم پیکرِ ایثار و عمل بن!
ہر مرحلۂ شکر و شکایت سے گذر جا

کرنا ہے اگر کارِ نمایاں کوئی تجھ کو
اُٹھ اور ہر آسانیٔ لذّت سے گذر جا

قسمت تری خود ہے ترے کردار میں مضمر
قسمت کو بنانا ہے تو قسمت سے گذر جا

جینا جو ہے منظور تو جینے کی نہ کر فکر
راحت کی تمنا ہے تو راحت سے گذر جا

جو صبر و قناعت تجھے مفلوج بنا دے
بہتر ہے کہ اس صبر و قناعت سے گذر جا

پیدا نہ کرے تجھ میں جو پاکیزگیٔ رُوح!!
اس فلسفۂ دانش و حکمت سے گذر جا

نادار کی مجبوری و پستی کی طرف دیکھ
ہر قصر فلک بوس کی رفعت سے گذر جا

جھلسے ہوئے اجسام، سسکتی ہوئی رُوحیں
کچھ سوچ کے اس منظرِ عبرت سے گذر جا

ہر لمحہ یہاں جہدِ مسلسل کا ہے پیغام!
اے تنگِ طلب! وقفۂ راحت سے گذر جا

دنیا کے ہے رزم گہِ شیطنت و حق
لڑتا ہُوا ہر کفر و ضلالت سے گذر جا

سیدھی سی بس اک راہِ صداقت پہ چلا چل
پُر پیچ گذر گاہِ سیاست سے گذر جا

انسانیتِ عام کے مرکز کی بِنا ڈال
ہر ناقص و محدود جماعت سے گذر جا

اَوروں کے لئے چھوڑ یہ تاریک مقامات
نفرت سے، عداوت سے، شقاوت سے گذر جا

لیتا ہوا اک درسِ حیاتِ ابدی کا — ہر تازہ غم و رنج و مصیبت سے گذر جا
حق پر ہے اگر تُو تو شہادت کا مزہ چکھ — بچ کر نہ اس آشوبِ ہلاکت سے گذر جا
ہے خدمتِ مخلوق ہی نعم البدل اپنا — کر خدمتِ مخلوق، تجارت سے گذر جا
مِلّت کی بقا ہے تری اس موت میں پنہاں — سر دے کے تُو میدانِ شہادت سے گذر جا
سرمایہ و سازش کے یہ مردُود عزائم! — تو صرف اِک اندازِ حقارت سے گذر جا
توحید کی طاقت کو بنا اپنا مُعاون — ہر واہمۂ قلّت و کثرت سے گذر جا
حائل ہو قیامت بھی اگر راہ میں تیری! — ٹھکرا کے قیامت کو، قیامت سے گذر جا
بیباک گذر رزم گہِ دہر سے، لیکن! — مقصد یہ نہیں فہم و فراست سے گذر جا
تُو حُسن کے اِک دائرہ کُل کی طرف آ — ہر جزوی و محدود حقیقت سے گذر جا
کونین تری وسعت و رفعت میں ہے خُود محو — کونین کی ہر وسعت و رفعت سے گذر جا
تجھ پر جو گروہِ جُہلا طنز کرے کچھ! — بارعب و دل آویز متانت سے گذر جا
ہوتی ہے یونہی نشوونما فکر و عمل کی — ہنستا ہُوا ہر جبرِ حکومت سے گذر جا
انسان بن انسان، یہی ہے تری معراج — رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گذر جا

تیرے یہ پیامات جگر ہم کو مبارک!
تو بھی تو اب اس پستیِ عزلت سے گذر جا



نوائے وقت!

اُٹھو اُٹھو! کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے — بڑھو! بڑھو! کہ چار سُو پُکار ہی پُکار ہے
وہ وقت ہے کہ علمِ حق ہے علمِ شیطنت میں گم — وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے
کہاں کے مطرب وغزل، کہاں کے شاہد وچمن — کہ زندگی تمام تر بساطِ کار زار ہے
غضب کہ چھائی جارہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں — ستم کہ، زد میں آندھیوں کی شمع روزگار ہے
زمیں کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے — بڑھے چلو، بڑھے چلو! یہ وقت کی پُکار ہے



زمانے کا آقا، غُلامِ زمانہ

کدھر ہے تو اے جُراَتِ باغیانہ
بدل دے مقدر، پلٹ دے زمانہ
کُھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل
کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ
محبت اُڑی جا رہی ہے دلوں سے
حقیقت بنی جا رہی ہے فسانہ
شرافت کا معیار افراطِ دولت
صداقت کی معراج، لفظی ترانہ
زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے
مگر طینتیں بیشتر مُفسدانہ
غریبوں پہ جو کُچھ گذرتی ہے، گذرے
سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ
مُجسّم خود اِک پیکرِ مادّیت
مگر درسِ رُوحانیت عارفانہ
دلائل کی ہنگامہ آرائیوں میں
کہیں رُوح بسمل، کہیں دل نشانہ
نتائج سے بھی آنکھ کُھلتی نہیں ہے
ہر اقدام اب تک ہے نامنصفانہ

بشر کی یہ پستی، ارے توبہ توبہ!
زمانے کا آقا، غُلامِ زمانہ!!



دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر!

پہلے تو حُسنِ عمل، حُسنِ یقیں پیدا کر
پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر
یہی دُنیا کہ جو بُت خانہ بنی جاتی ہے
اسی بُت خانے سے کعبے کی زمیں پیدا کر
رُوحِ آدم نگراں کب سے ہے تیری جانب
اُٹھ اور اِک جنّتِ جاوید یہیں پیدا کر
خس و خاشاکِ توہم کو جلا کر رکھ دے
یعنی آتش کدۂ سوزِ یقیں پیدا کر
غم میسّر ہے تو اس کو غمِ کونین بنا
دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر
آسماں مرکزِ تخئیل و تصور کب تک؟
آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر
دل کے ہر قطرہ میں طوفانِ تجلّی بھر دے
بطنِ ہر ذرّہ سے اِک مہرِ مبیں پیدا کر
بندگی یوں تو ہے انسان کی فطرت لیکن
ناز جس پر کریں سجدے وہ جبیں پیدا کر
پستیِ خاک پہ کب تک تری بے بال و پری
پھر مقام اپنا سرِ عرشِ بریں پیدا کر

عشق زندہ و پایندہ حقیقت ہے جگرؔ
عشق کو عام بنا، ذوقِ یقیں پیدا کر!

☆—☆—☆

اعلانِ جمہوریت

(۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء)

خدا کرے کہ یہ دستور ساز گار آئے
جو بے قرار ہیں اب تک، انہیں قرار آئے

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے
کہ پھول ہی نہیں، کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

وہ سرخوشی ہو کہ خود سرخوشی بھی رقص کرے
وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے

کھلے جو پھول تو دے جسمِ ناز کی خوشبو
کلی اگر کوئی چٹکے، صدائے یار آئے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں
کہیں بہار نہ آئے، کہیں بہار آئے

یہ میکدے کی، یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف، کوئی شرمسار آئے

خلوص و ہمّتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخِ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

جنونِ عشق ہو صالح اگر، تو ممکن ہے
کہ پھر اس اُجڑے گلستاں میں بھی بہار آئے

مذاقِ عشق بدل دے، مزاجِ کون و فساد
دلوں تک آئے جو غم بھی، تو خوشگوار آئے

نظامِ خُلق و مرّوت کبھی جو برہم ہو
نگاہِ لطف و محبت بڑھے، سنوار آئے

دلوں پہ نقش نہ رہ جائے کوئی نفرت کا
یہ فتنہ بن کے نہ آشوبِ روز گار آئے

بُرائی کرنے سے ہی کاش ہر ایک انسان کو
نظر ہر ایک بدی کا مآلِ کار آئے

وہ حادثات زمانے سے محو ہو جائیں
کہ جن کے ذکر سے انسانیت کو عار آئے

نمائشی ہی نہ ہو، یہ نظامِ جمہوری
حقیقتہً بھی زمانے کو ساز گار آئے

خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر کر لیں
نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

ضمیر صاف ہو اپنا تو غیر ممکن ہے
کسی کے آئینۂ قلب پر غبار آئے

محبت آج بھی مشعل فروز منزل ہے
اگر نہ کور نگاہی بروئے کار آئے

دلوں کی کھوٹ ہو جس کے ضمیر میں شامل
نہ آئی ہے وہ سیاست، نہ ساز گار آئے

زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا
کہ جو زبان کہے، دل کو اعتبار آئے

بنا دیا ہے محبت نے آگ کو گلزار
مگر جو آج کے انساں کو اعتبار آئے

نہ ہو جو عام مسرت، محال ہے، اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے



ساقی سے خطاب

ساقی اور رند دونوں میخانہ روحانیت سے وابستہ ہیں۔ دونوں میں شدید محبت ہے۔ جہاں ساقی عظیم المرتبت ہے وہاں رند بھی معمولی رند نہیں، بلکہ ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ عصرِ جدید کے حالات سے متاثر ہو کر رندِ میخانہ کی زندگی ترک کرنا اور جدوجہدِ دُنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے اور ساقی سے اجازت کا طالب ہوتا ہے۔ ساقی کو خیال ہوتا ہے کہ عملی دُنیا میں خدا جانے رند سے کیا کیا لغزشیں ہوں۔ لیکن رند پر ساقی کا احساس منکشف ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہہ کر ساقی کو مطمئن کرنا چاہتا ہے۔

نہ لاؤ سوا اس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

اسی کے ساتھ نظم میں معیارِ جنوں، تنظیمِ میخانہ، انسان اور انسانیت، وطن اور وطنیت وغیرہ وغیرہ کے متعلق بھی رند یعنی شاعر کے نظریات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔!!



کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں، کہاں تک علم و فن ساقی!
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی، نہ من ساقی
یہ سُنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ! چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی
سلامت تو، ترا میخانہ، تری انجمن ساقی!
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی!
رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی
کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل، تو بہ شکن، مے کش
مگر بننا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

نہ لا وسواس دل میں، جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

جو دُشمن کے لئے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں
دلِ خوباں میں چبھتا ہے انہیں کا بانکپن ساقی

ترے جوشِ رقابت کا تقاضا کچھ بھی ہو، لیکن
تجھے لازم نہیں ہے ترکِ منصب دفعتہً ساقی

ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں، تنظیمِ مے خانہ
ابھی نامعتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی

وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حُریّت کے اُڑ رہے ہیں ہر طرف پُرزے
بساطِ آدمیّت ہے شکن اندر شکن ساقی

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

کہیں مُلحد نہ بن جائیں مرے افکارِ سنجیدہ
کہیں مُرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سُخن ساقی

کہیں خود حُسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر
کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدُودِ وطن ساقی

کہاں ہیں رندِ سرگشتہ، کہاں یہ دعوئے تمکیں
سمجھ لے اس کو بھی میرا اک اندازِ سُخن ساقی

عجب کیا ہے، یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں!
بہت باہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی

نمودِ صُبحِ کاذب ہی دلیلِ صُبحِ صادق ہے
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ اُبھری کرن ساقی

بدہ جامِ مئے باقی کہ درجنّت نخواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ چمن ساقی!



شُعلۂ طُور

ہجومِ تجلّی سے معمُور ہو کر
نظر رہ گئی شعلۂ طُور ہو کر

میں اپنی ادبی کاوشوں اور جگر پاروں کو مولائی و آقائی حضرت مولانا اصغر حسین صاحب اصغرؔ گونڈوی قبلہ مرحوم و مغفور کے اسمِ گرامی پر، جن کے فیضانِ توجہ اور برکات تربیت کا نتیجہ وہ سب کچھ ہے جو ''شعلۂ طور'' کی صورت میں حاضر کیا جا رہا ہے...... اور...... مخدوم و محترم صفی الدولہ حسام الملک، شمس العلماء، نواب علی حسن خان صاحب طاہرؔ مرحوم کے نامِ نامی پر، جن کی سعی بلیغ کا یہ کرشمہ تھا کہ ''شعلۂ طور'' مکمل تہذیب و ترتیب کے ساتھ پیش کیا جا سکا...... اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ معنون کرتا ہوں۔

جگرؔ مرادآبادی...........

نغماتِ جگر

یعنی

انتخابِ داغِ جگر

(دورِ اوّل)

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا
جس رنگ میں دیکھا تجھے یکتا نظر آیا
جب اُس رُخِ پُر نور کا جلوہ نظر آیا
کعبہ نظر آیا نہ کلیسا نظر آیا
یہ حُسن، یہ شوخی، یہ کرشمہ، یہ ادائیں
دنیا نظر آئی مجھے، تو کیا نظر آیا
اِک سرخوشیٔ عشق ہے، اک بیخودیٔ شوق
آنکھوں کو خدا جانے، مری کیا نظر آیا
قربان تری شانِ عنایت کے دل و جاں
جب آنکھ کھلی، قطرہ بھی دریا نظر آیا
جب دیکھ نہ سکتے تھے، تو دریا بھی تھا قطرہ
اس کم نگہی پر مجھے کیا کیا نظر آیا
ہر رنگ ترے رنگ میں ڈوبا ہوا نکلا
ہر نقش ترا نقشِ کفِ پا نظر آیا
آنکھوں نے دکھا دی جو ترے غم کی حقیقت
عالم مجھے سارا تہ و بالا نظر آیا
ہر جلوے کو دیکھا ترے جلووں سے منوّر
ہر بزم میں تو انجمن آرا نظر آیا

☆——☆——☆

پیوست دل میں جب ترا تیرِ نظر ہوا
کس کس ادا سے شکوۂ دردِ جگر ہوا
کچھ داغِ دل سے تھی مجھے امیدِ عشق میں
سو رفتہ رفتہ وہ بھی چراغِ سحر ہوا
تھم تھم کے اُن کے کان میں پہنچی صدائے دل
اُڑ اُڑ کے رنگِ چہرہ مرا نامہ بر ہوا
سینے میں پھر بھڑکنے لگی آتشِ فراق
دامن سے پھر معاملۂ چشمِ تر ہوا
رگ رگ نے صدقے کر دیا سرمایۂ شکیب
اللہ! کس کا خانۂ دل میں گذر ہوا
فریاد کیسی؟ کس کی شکایت؟ کہاں کا حشر؟
دُنیا اُدھر کو ٹوٹ پڑی وہ جدھر ہوا

وارفتگی شوق کا اللہ رے کمال! جو بے خبر ہوا، وہ بڑا با خبر ہوا
حسرت اُس ایک طائرِ بیکس پر، اے جگر
جو فصلِ گل کے آتے ہی بے بال و پر ہوا



تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا
دل کو نہ چھیڑ، اے غمِ فرقت! کہ اب یہ دل تیرے بھی التفات کے قابل نہیں رہا
اُٹھتے ہیں تیری راہ میں جب سے مرے قدم
احساسِ قرب و دوریٔ منزل نہیں رہا



تجھ کو تسلیم حسیں ساری جماعت نے کیا دیکھ، کیا کام مرے دردِ محبت نے کیا
اللہ اللہ، یہ تاثیرِ فغانِ شبِ ہجر
خیر مقدم مرے نالوں کا قیامت نے کیا



ستم کا عدو مستحق ہو گیا مرا دل سراپا قلق ہو گیا
سُنانے چلے تھے اُنہیں حالِ دل نظر ملتے ہی رنگ فق ہو گیا
جو کچھ بچ رہا تھا مرا خونِ دل وہی آسماں پر شفق ہو گیا
چھپائے ہوئے تھے ترا رازِ عشق مگر اب تو سینہ بھی شق ہو گیا
مری موت سُن کر، کیا اُس نے ضبط
مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا



گھڑی بھر میں نا آشنا ہو گیا نہ جانے مرے دل کو کیا ہو گیا
دھڑکنے لگا دل، نظر جھک گئی کبھی اُن سے جب سامنا ہو گیا
مرے سر پر احسان تھا عشق کا مرا رنگ ہی دوسرا ہو گیا
نمایاں ہیں چہرے سے آثارِ عشق جگر آج سے با خُدا ہو گیا



تری یاد کی اُف یہ سرمستیاں کوئی جیسے پی کے شراب آ گیا
مرا ان کا بنتا بگڑتا ہی کیا نگاہیں ملیں اور حجاب آ گیا

اداؤں میں شوخی چھلکنے لگی قیامت کو لے کر شباب آ گیا
اُدھر جوشِ مستی، اِدھر چشمِ شوق مصیبت میں بندِ نقاب آ گیا
جگر یہ قیامت کی بے ہوشیاں
اُٹھو سر پہ اب آفتاب آ گیا

☆——☆——☆

بغور دیکھ لو انداز میرے مٹنے کے یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گزرے گا
قریب سرحدِ حرماں، جگر، ٹھہر جاؤ!
سُنا ہے قافلۂ غم اِدھر سے گزرے گا

☆——☆——☆

تصویر اُمیدوں کی آئینہ ملالوں کا انساں جسے کہتے ہیں، محشر ہے خیالوں کا
کیا خاک جواب اُن کو دُوں اُن کے سوالوں کا لب خشک ہیں زخموں کے، منہ بند ہے چھالوں کا
ہاں ٹھیس نہ لگ جائے، اے دردِ غمِ فُرقت!
دل آئینہ خانہ ہے آئینہ جمالوں کا

☆——☆——☆

دل پہ طاری بے حسی وضعف کا عالم ہوا گھٹ گئی اتنی ہی طاقت، درد جتنا کم ہوا
آہ رو لینے سے بھی کب بوجھ دل کا کم ہوا
جس کسی کی یاد آئی، پھر وہی عالم ہوا

☆——☆——☆

حشر کے دن وہ گنہگار نہ بخشا جائے جس نے دیکھا تری آنکھوں کا پشیماں ہونا
پردہ رکھنا تھا جو منظور تو عاشق کے لئے دامنِ یار کو لازم تھا گریباں ہونا
سُن کے افسانۂ غم باغ میں کُملا گئے پھول شاق گذرا مجھے بلبل کا غزل خواں ہونا
جس کو نعمت یہ ملے، کیوں وہ رہے آزردہ
سو خوشی، ایک ترے غم میں پریشاں ہونا

☆——☆——☆

پریشاں ہو کے زلفوں کا وہ اُس رُخ پر بکھر جانا وہ سوتے سوتے چونک اُٹھنا، وہ لیٹے لیٹے ڈر جانا
ہر اک لرزش پہ چیخ اُٹھنا ہر اک جنبش پہ ڈر جانا قفس تک، ہائے میرا اس طرح بے بال و پر جانا

☆——☆——☆

نقشِ وفا کا رنگ مٹایا نہ جائے گا　　مل بھی گیا جو زہر، تو کھایا نہ جائے گا
سر سے جنونِ عشق کا سایا نہ جائے گا　　تم سے بھی یہ طلسم مٹایا نہ جائے گا
دل نے اگر چھپا بھی لیا داغِ آرزو　　آنکھوں سے تو یہ راز چھپایا نہ جائے گا
مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا　　دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

ان کو بُلا کے اور پشیماں ہوئے جگر
یہ کیا خبر تھی، ہوش میں آیا نہ جائے گا



جان ہے بے قراری سی، جسم ہے پائمال سا　　اب نہ وہ داغ، وہ جگر، صرف ہے اک خیال سا
چاہیئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا　　داغ ہر ایک بدر سا زخم ہر اک ہلال سا
جس نے بنا دیا مجھے وحشی وخستہ حال سا　　ہائے! وہ شکل چاندنی ہائے وہ قد نہال سا
دل پہ مرے گرائی تھیں تم نے ہی بجلیاں، مگر　　آؤ نظر کے سامنے، مجھ کو ہے احتمال سا
ہائے رے وہ عتاب میں اُن کی ادائیں اُن کی شکل　　آنکھیں بھی سُرخ سُرخ سی، چہرہ بھی لال لال سا
اُٹھتے ہی پائے یار کے باغِ گُلاغ اُجڑ گیا　　پھول بھی ہیں تباہ سے سبزہ بھی پائمال سا
حُسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھیئے　　وصل کبھی ہے ہجر سا، ہجر کبھی وصال سا
گُم شدگانِ عشق کے شان بھی کیا عجیب ہے!　　آنکھ میں اک سرور سا چہرے پہ اک جلال سا

یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ
کچھ اُنہیں اجتناب سا، کچھ مجھے احتمال سا



ہم اسیرانِ جنوں سے کوئی پُوچھے آ کر　　جیتے جی قیدِ تعلق سے رہا ہو جانا
نالۂ دل جو سلامت ہے تو کیا مشکل ہے؟　　روز اس کوچے میں ایک حشر بپا ہو جانا
خاکِ مجنوں سے یہ آتی ہیں صدائیں اب تک　　زندگی ہے غمِ دلبر میں فنا ہو جانا
نگہِ شوق نے سب کھول دیئے بندِ نقاب　　سہل سمجھے تھے وہ پابندِ حیا ہو جانا
ہائے وہ ضبطِ محبت کی جفائیں سرِ بزم　　دل میں گھٹ گھٹ کے وہ آہوں کا فنا ہو جانا

رشک آتا ہے شہیدانِ وفا پر مجھ کو
اُن کی قسمت میں تھا کیا جلد شفا ہو جانا



حسرت سے دیکھتا ہوں ہر اک شاخِ گل کی سمت — یہ ضُعف، اور ہائے! یہ عالم بہار کا
جس پر برس گئی کبھی برقِ جمالِ یار — ہر ذرّہ آفتاب ہے اُس کے مزار کا



آج کیا حال ہے، یا رب! سرِ محفل میرا — کہ نکالے لئے جاتا ہے کوئی دل میرا
سوزِ غم، دیکھ، نہ برباد ہو حاصل میرا — دل کی تصویر ہے ہر آئینۂ دل میرا
صبح تک ہجر، میں کیا جانئے کیا ہوتا ہے — شام ہی سے مرے قابو میں نہیں دل میرا
مل گئی عشق میں ایذا طلبی سے راحت — غم ہے اب جان مری، درد ہے اب دل میرا
پایا جاتا ہے تری شوخیٔ رفتار کا رنگ — کاش پہلو میں دھڑکتا ہی رہے دل میرا
ہائے! اُس درد کی قسمت، جو ہوا دل کا شریک — ہائے! اُس دل کا مقدر جو بنا دل میرا

کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر
اب خدا جانے، تری یاد ہے یا دل میرا



لاکھوں میں انتخاب کے قابل بنا دیا — جس دل کو تم نے دیکھ لیا، دل بنا دیا!
ہر چند کر دیا مجھے برباد عشق نے — لیکن اُنہیں تو شیفتۂ دل بنا دیا
پہلے کہاں یہ ناز تھے، یہ عشوہ و ادا — دل کو دعائیں دو، تمہیں قاتل بنا دیا



آنکھوں کا تھا قصور، نہ دل کا قصور تھا — آیا جو میرے سامنے، میرا غرُور تھا
تاریک مثلِ آہ جو آنکھوں کا نُور تھا — کیا صبح ہی سے شام بلا کا ظہُور تھا
وہ تھے نہ مجھ سے دُور، نہ میں اُن سے دُور تھا — آتا نہ تھا نظر کا قصور تھا
ہر وقت اک خمار تھا، ہر دم سرُور تھا — بوتل بغل میں تھی کہ دل ناصبُور تھا
کوئی تو درد مندِ دل ناصبُور تھا! — مانا کہ تم نہ تھے، کوئی تم سا ضرُور تھا
لگتے ہی ٹھیس ٹوٹ گیا سازِ آرزو — ملتے ہی آنکھ شیشہ دل چُور چُور تھا
ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش — شامل کسی کا خونِ تمنا ضرُور تھا
ساقی کی چشمِ مست کا کیا کیجئے بیاں — اتنا سرُور تھا کہ مجھے بھی سرُور تھا
پلٹی جو راستہ ہی سے، اے آہِ نامُراد! — یہ تو بتا کہ بابِ اثر کتنی دُور تھا
جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا — اس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرُور تھا
اُس چشمِ مے فروش سے کوئی نہ بچ سکا — سب کو بقدرِ حوصلۂ دل سرُور تھا

دیکھا تھا کل جگرؔ کو سرِ راہِ میکدہ
اس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چُور تھا



اللہ رے، وارفتگیٔ شوق کا عالم
میرا بھی اب پتہ سرِ منزل نہیں ملتا
کیا قیس کی پُرشوق نگاہوں نے کیا سحر
محمل میں بھی اب صاحبِ محمل نہیں ملتا



رگ رگ میں دل تھا، دل میں نہاں سوز و ساز تھا
وہ دن بھی کیا تھے، جب میں سراپا گداز تھا
وہ تھے، بہار تھی، دلِ حسرت طراز تھا
پیہم اُدھر سے ناز، اِدھر سے نیاز تھا
تاثیرِ جذبِ عشق کو لیلےٰ سے پوچھئے
جو ذرّہ خاکِ عشق کا تھا، دل گداز تھا
پہلے جو ختم ہو گئی یہ داستانِ غم!
تو میں کہوں گا عرصۂ محشر دراز تھا
کیا کہہ دیا کسی نے؟ کہ ملتے ہی چشمِ شوق
دونوں طرف سے دستِ تمنّا دراز تھا
وہ ناز آفریں تھے، انہیں اس پہ تھا غرور
میں تھا نیاز مند، مجھے اِس پہ ناز تھا



اِس عشق میں پُورا کبھی اُن سا نہیں دیکھا
دامن پہ نظر کی تو گریباں نہیں دیکھا
تازہ اثر، اے جذبۂ پنہاں نہیں دیکھا
مدّت ہوئی شمشیر کو عریاں نہیں دیکھا
اللہ ری، مجبوریٔ آدابِ محبت
گلشن میں رہے اور گلستان نہیں دیکھا
بے کار گئی سعیٔ محبت بھی ہماری
حاصل بجز اک دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
اللہ ری! مری تیز روی جوشِ جنوں میں
مڑ کر جو نظر کی تو بیاباں نہیں دیکھا



دل نہ تھا، جان نہ تھی، سوز نہ تھا، ساز نہ تھا
میں ہی میں تھا مرے ہمراہ کوئی راز نہ تھا
دم بخود رہ گئی بُلبُل ہی چمن میں، ورنہ
کون سا پھول تھا، جو گوش بر آواز نہ تھا
ہم تھے اور سامنے اک جلوۂ حیرت افزا
پردہ تھا، اور کوئی پردہ بر انداز نہ تھا
حسرت اس طائرِ مایوس کی حالت پہ کہ جو
قید سے چھوٹ کے بھی مائلِ پرواز نہ تھا



شریکِ نالہ میرا بھی جو اندازِ فغاں ہوتا　　چمن میں ہرلبِ خاموش وبلبل کی زباں ہوتا
دمِ بسمل اگر تم چھیڑ دیتے دل کے زخموں کو　　لہو کا قطرہ قطرہ دردِ دل کی داستاں ہوتا
بہت روکا تمہارے وعدۂ دیدار نے ورنہ
وہاں ہوتی نہ میری بیخودی بھی، میں جہاں ہوتا



خلوت میں غمِ فُرقت اس طرح بیاں ہوتا　　وہ میری زباں سُنتے میں اُن کی زباں ہوتا
تھی سیر، اگر میں بھی ساتھ اُن کے وہاں ہوتا　　آنسو بھی رواں ہوتے، دریا بھی رواں ہوتا



یوں رازِ غمِ اُلفت سینے میں نہاں ہوتا　　ہم خود بھی عیاں کرتے، تو بھی نہ عیاں ہوتا
اے کاش! نہ ہم اُٹھتے در سے ترے جیتے جی
جینا بھی یہاں ہوتا، مرنا بھی یہاں ہوتا



آنکھوں میں اس طرح سے ترا شوقِ دید تھا　　گویا مری نظر میں دلِ نا اُمید تھا
اللہ ری نشترِ غمِ فُرقت کی تیزیاں!　　رگ رگ میں شور وشیونِ قطع و برید تھا



کمالِ عشق بھی کیا کیا فریب دار ہوا　　کہ اپنے پر مجھے اکثر گمانِ یار ہوا
جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے　　خبر نہیں کہ گریباں بھی تار تار ہوا
کہاں کے غمزہ وشوخی، کہاں کی ناز و ادا　　وہ تیرا اور ہی تھا جو جگر کے پار ہوا
اب اس سے بڑھ کے طلسمِ خیال کیا ہوگا　　کہ ذرّہ ذرّہ تو تصویرِ حُسنِ یار ہوا
خزاں نہ تھی چمنستانِ دہر میں کوئی　　خود اپنا ضُعفِ نظر پردۂ بہار ہوا



راز اس حُسن کا ہندو نہ مسلماں سمجھا　　کچھ جو سمجھا تو مرا دیدۂ حیراں سمجھا
زخم کو مرہمِ دل، درد کو درماں سمجھا　　چارہ گر خوب علاجِ غمِ پنہاں سمجھا
عشق کا راز وہی سوختہ ساماں سمجھا　　جس نے دامن بھی جانا نہ گریباں سمجھا
حشر میں بھی نہ اُٹھا آنکھ سے غفلت کا حجاب　　اس کو بھی سلسلۂ خوابِ پریشاں سمجھا



اس عشق کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا — اتنی ہی بڑھی حسرت جتنا ہی اُدھر دیکھا
تھا کھیل سا پہلے عشق، لیکن جو کھُلیں آنکھیں — ڈوبا ہوا رگ رگ میں وہ تیرِ نظر دیکھا
سب ہو گئے اُٹھ اُٹھ کے اک بار نثارِ شمع — پروانوں نے کیا جانے، کیا وقتِ سحر دیکھا
وہ اشک بھری آنکھیں اور درد بھرے نالے — اللہ نہ دکھلائے جو وقتِ سحر دیکھا
قرباں ری آنکھوں کے، صدقے تری نظروں کے — تھا حاصلِ صد ناوک، جو زخمِ جگر دیکھا
جاتے رہے دم بھر میں سارے ہی گلے شکوے — اُس جانِ تغافل نے جب ایک نظر دیکھا
عہدِ غمِ فُرقت میں دل اور جگر کیسے؟ — اک زخم اِدھر پایا، اک داغ اُدھر دیکھا
تھا باعثِ رُسوائی ہر چند جنوں میرا — ان کو بھی نہ چین آیا جب تک نہ اُدھر دیکھا
اُس چشمِ غزالیں کو میخانۂ دل پایا — اُس روئے نگاریں کو فردوسِ نظر دیکھا
یوں دل کے تڑپنے کا کچھ تو ہے سبب آخر — یا درد نے کروٹ لی، یا تم نے ادھر دیکھا
کیا جانئے کیا گذری، ہنگامِ جنوں، لیکن — کچھ ہوش جو آیا تو اُجڑا ہوا گھر دیکھا
ماتھے پہ پسینہ کیوں؟ آنکھوں میں نمی کیسی؟ — کچھ خیر تو ہے، تم نے کیا حالِ جگر دیکھا



کانٹا تھا چشمِ یاس میں اک ایک برگِ گُل — میرے لئے چمن بھی بیاباں نکل گیا
دستِ جنوں کا ضعف سے اُٹھنا محال تھا — کیا جانے کس طرح سے گریباں نکل گیا
دل میں تو آگ ہے وہی اب تک لگی ہوئی — مانا کہ چشمِ شوق کا ارماں نکل گیا
جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبطِ عشق کی — سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا



مجھ کو وہ لذت ملی احساس مشکل ہو گیا — رہتے رہتے دل میں تیرا درد بھی دل ہو گیا
اے نگاہِ یاس! یہ کیا رنگِ محفل ہو گیا — میں نے جس دل کی طرف دیکھا، مرا دل ہو گیا
لے کے پہنچی بیخودیِ شوق بزمِ یار تک — گو مجھے اک اک قدم اک ایک منزل ہو گیا
ابتدا وہ تھی کہ تھا جینا محبت میں محال — انتہا یہ ہے کہ اب مرنا بھی مشکل ہو گیا
جب تو کچھ ظرف ہے اے دل! ترے پیمانے کا — راز میخانے سے باہر نہ ہو میخانے کا
عرصۂ حشر کہاں، یہ دلِ برباد کہاں — وہ بھی چھوٹا سا ہے ٹکڑا اِسی ویرانے کا
اس کی تصویر کسی طرح نہیں کھنچ سکتی — شمع کے ساتھ تعلق ہے جو پروانے کا
جُرعۂ مے کی ادائیں نگہِ ناز میں ہیں — چشمِ مخمور میں کُل راز ہے میخانے کا
جذبۂ شوق نے دم لینے کا موقع نہ دیا — شمع منہ دیکھتی ہی رہ گئی پروانے کا

قدم اُٹھتے بھلا کیا قیس کے بے چارہ حیراں تھا
کہ ہر ذرّہ دیارِ نجد کا تصویرِ جاناں تھا
خزاں کا دَور، وہ پژمردہ غنچے، گل وہ افسردہ
چمن لٹتا تھا یا رب! یا کوئی خوابِ پریشاں تھا
انہیں کی اک نگاہِ ناز کے سارے کرشمے تھے
نہ حسرت میری حسرت تھی نہ ارماں میرا ارماں تھا
وہ حلم اور وہ تواضع اور وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو، لاکھ انسانوں کا انساں تھا!



فروغِ حُسنِ رُخِ نکو نے کیا یہ کیا انقلاب پیدا!
حجاب پر ہے حجاب طاری، نقاب پر ہے نقاب پیدا
حیا میں آئے تو رنگِ ہستی، ادا میں ہو تو حجاب پیدا
وہ آنکھ خود ہی بنے گی ساقی، نظر کرے گی شراب پیدا
سُنیں تو وہ میرا قصۂ غم، نہیں تو وہ دردِ دل کے محرم
کرے گا ایک ایک اشکِ حسرت ہزار چشمِ پُر آب پیدا
کہاں کا میخانہ، کس کا ساقی، کچھ اور بڑھنے دو بیخودی کو!
یہی بنائے گی جام و ساغر، یہی کرے گی شراب پیدا
نظر کی ناکامیوں نے مجھ پر، یہ راز ظاہر کیا بالآخر
کہ بے حجابی میں بھی ہے تیری ہزار رنگِ حجاب پیدا
تڑپ یہ دل کی کہ بے حسی بھی ہزار جاں سے نثار جس پر
سکون ایسا کہ جس کی ہر ہر ادا سے لاکھ اضطراب پیدا



یہی ہے سب سے بڑھ کر محرمِ اسرار ہو جانا
میسّر ہو اگر اپنا ہمیں دیدار ہو جانا
محبت میں کہاں ممکن ذلیل و خوار ہو جانا
کہ پہلی شرط ہے انساں کا خود دار ہو جانا
کھلے گا چارہ گر پر رازِ غم کیا درد کے ہوتے
کہ آتا ہے اسے خود نبض کی رفتار ہو جانا
ہوا کا اُس طرف اُن کا نقابِ رُخ اُلٹ دینا
اِدھر اک اک لہو کی بوند کا سرشار ہو جانا
اثر لینا تھا ہم کو ہر ادائے حسن سے اُن کی
مگر لازم نہ تھا رُسوا سرِ بازار ہو جانا
گریں ہر ہر قدم پر بجلیاں راہِ محبت میں
بڑی مشکل سے آیا طالبِ دیدار ہو جانا
ادھر دامن کسی کا جھاڑ کر محفل سے اُٹھ جانا
ادھر نظروں میں ہر ہر چیز کا بے کار ہو جانا
وصال و ہجر کے جھگڑوں نے فرصت ہی نہ دی، ورنہ
مآلِ عاشقی تھا رُوح کا بیدار ہو جانا
زباں گو چُپ ہوئی، دل میں تلاطم ہے وہی برپا
نہ آیا آج تک محوِ خیالِ یار ہو جانا

جگرؔ وہ خاک ہی تو سرمۂ چشمِ دو عالم ہے
میسّر ہو جسے صرفِ جمالِ یار ہو جانا



کہاں ممکن تھا اُس چشمِ عنایت کا اِدھر ہونا
مگر کام آ گیا میری فغاں کا بے اثر ہونا



گرتے گرتے ایک طوفاں پھر قیامت زا ہوا
وہ جو اک آنسو مری مژگاں پہ تھا ٹھہرا ہوا

اب تو آنکھیں کھول، او رافتادۂ کوئے حبیب!
جھانکتا ہے کوئی دروازے سے شرماتا ہوا

دیدۂ حق بیں میں ہے کیا فرق، کیسا امتیاز
ایک ہی جلوہ کہیں مجنوں، کہیں لیلا ہوا

ذرّے ذرّے میں تھی ساری ایک موجِ انقلاب
منظرِ فطرت کو میں دیکھا کِیا سہما ہوا

اللہ اللہ! یہ کمالِ جذبۂ پنہانِ عشق!
جو گرا آنکھوں سے آنسو حُسن کا دریا ہوا

بڑھتے بڑھتے آفتاب روزِ محشر بن گیا
دل کی خاکستر میں اک شعلہ تھا جو بھڑکا ہوا

لے چلا ہوں میں بھی نذرِ حُسنِ جاناں کو، جگر
ساتھ دل کے ایک سازِ آرزو ٹوٹا ہوا



صیّاد مجھ سے دُور ہے، خوش باغباں ہے اب
جس شاخ پر نظر میں کروں، آشیاں ہے اب

نازک لبوں پہ شکوۂ دردِ نہاں ہے اب
اُن کا دہن ہے اور ہماری زباں ہے اب

چشمِ طلب میں اور کوئی آشیاں ہے اب
میرے لئے قفس مجھے سارا جہاں ہے اب



دل کی کیا تاب کہ پہنچے صفِ مژگاں کے قریب
جلوے خود لوٹ رہے ہیں رُخِ تاباں کے قریب

خون ہو ہو کے بہے جاتے ہیں سب قلب و جگر
کوئی نشتر نہ ہو پوشیدہ رگِ جاں کے قریب

داغِ فُرقت کے دہکتے ہوئے انگارے میں
ہاتھ لانا تو مرے سینہ سوزاں کے قریب

تابِ دیدارِ رُخِ یار کہاں سے لاؤں؟
گر پڑی جا کے نظر گوشۂ داماں کے قریب

گر نہیں خارِ محبت کی کرم فرمائی
پھر یہ کیا چیز کھٹکتی ہے رگِ جاں کے قریب

شوق نے توڑ ہی ڈالے تھے محبت کے قیود
ہوش آیا ہے پہنچ کر درِ جاناں کے قریب

ہو چکے حسرت و امید والم سب رخصت
اب نہیں کوئی مریضِ شبِ ہجراں کے قریب

جب ہمیں مٹ گئے ارمان میں پابوسی کے
خاک پہنچی بھی تو کیا گوشۂ داماں کے قریب

عشق میں سیرِ گل ولالہ ہے تمہیدِ جنوں
چاہیئے ایک بیاباں بھی گلستاں کے قریب

میں، جگر، لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ، مگر
دل ہر اک حال میں ہے حضرتِ احساں[1] کے قریب

---

[1] جناب مرزا احسان احمد صاحب بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی (علیگ) ایڈووکیٹ اعظم گڑھ ۱۲

صبر کے ساتھ مرا دل بھی لئے جائیں آپ
اس قدر رحم مرے حال پہ فرمائیں آپ

دیکھیے میری تمناؤں کا احساس رہے
باغِ فردوس میں تنہا نہ چلے جائیں آپ

میری رگ رگ میں سما کر بھی یہ پردہ مجھ سے
ظلم ہے ظلم ہے آئینے سے شرمائیں آپ

کر دیا دردِ محبت نے مرا کام تمام
اب کسی طرح کی تکلیف نہ فرمائیں آپ

نالے کرتے ہوئے رہ رہ کے یہ آتا ہے خیال
کہ مری طرح نہ دل تھام کے رہ جائیں آپ



لب پہ نالہ ہے مرے اور نہ فریاد ہے آج
کچھ عجب طرح سے بے چین تری یاد ہے آج

کیا قیامت نگہِ یاس کی بیداد ہے آج
کہ نشیمن بھی مجھے خانۂ صیّاد ہے آج

بر سرِ رحم وہ شوخ ستم ایجاد ہے آج
نالہ بھی نالہ ہے، فریاد بھی فریاد ہے آج

حسرتِ قید بھی اب دل سے نکل جائے گی
مژدہ، اے شوق! کہ خالی کفِ صیّاد ہے آج

ایک اک حرفِ غمِ دل کا سُنانا ہے اُنہیں
کل اگر بھول نہ جاؤں، جو مجھے یاد ہے آج



اور ہی کچھ کہہ رہا ہے رنگِ بیتابانہ آج
اُڑ نہ جائے شمع کو لے کر کہیں پروانہ آج

کام آخر کر گئی وہ نرگسِ مستانہ آج
بھر گیا بے منّتِ ساقی مرا پیمانہ آج

جھک گیا اک ایک میکش اُس نگاہِ مست سے
تم اُدھر دیکھا کیے اور لُٹ گیا میخانہ آج



نظر بھی ساتھ رہی ہے قدم قدم پہ مری
پھرا ہے صحنِ چمن میں جہاں جہاں صیّاد

سناؤں آہ! کسے سرگزشتِ سیرِ چمن؟
نہ ہم خیال فلک ہے، نہ ہم زباں صیّاد



ذرّے ذرّے سے نمایاں شانِ قُدرت دیکھ کر
کھل گئیں آنکھیں طلسمِ حُسنِ فطرت دیکھ کر

یہ ہجومِ غم، یہ اندوہ و مصیبت دیکھ کر
اپنی حالت دیکھتا ہوں اُن کی صُورت دیکھ کر

کپکپی سارے بدن میں، زرد چہرہ، دل اُداس
چپ کھڑے ہیں دُور میری خاکِ تُربت دیکھ کر

عمر بھر کا ساتھ رنج و غم میں دے سکتا ہے کون
شمع بھی رخصت ہوئی میری مصیبت دیکھ کر

گوشے گوشے میں ہے پنہاں جلوۂ برقِ جمال
پاؤں رکھنا میرے گھر، اے شامِ فُرقت! دیکھ کر

چارہ سازوں سے مریضِ غم کو فُرصت مل گئی
ہو چکے مایوس آثارِ طبیعت دیکھ کر



لالہ و گل کو دیکھتے کیا یہ بہار دیکھ کر
رہ گئے بیخودی میں ہم صورتِ یار دیکھ کر
ہائے، وہ جوشِ ربط وضبط، ہائے، یہ بے تعلّقی!
اشک بھر آئے آنکھ میں کوچۂ یار دیکھ کر
یاد کسی کی آہ، کیا کہہ گئی آ کے کان میں
زورِ جنوں سوا ہوا جوشِ بہار دیکھ کر
شوق نے چٹکیاں سی لیں، حسرتِ دل مچل گئی
میری طرف بڑھا ہوا دامنِ یار دیکھ کر
اُن سے بھی ہو سکا نہ ضبط، اُن کو بھی رحم آ گیا
پائے برہنہ دیکھ کر، جسم فگار دیکھ کر
تھی یہ ہوس کہ دیکھتے خال و خطِ بہارِ حسن
آنکھیں ہی چوندھیا گئیں جلوۂ یار دیکھ کر



وہ چمن میرا چمن ہے، وہ قفس میرا قفس
جس کے گوشے گوشے میں صدہا چمن، صدہا قفس
ہائے! کس بُلبل نے اے صیاد! پھر دیکھا قفس
بال و پر بکھرے پڑے ہیں آشیاں سے تا قفس
عشق میں کیا لالہ و گل، کیا چمن، کیسا قفس
میں ہی خود اپنا گلستاں ہوں میں خود اپنا قفس
سو بہاروں کی ہے جاں اک میری چشمِ خونچکاں!
سارے گلشن کی حقیقت اک مرا تنہا قفس
خاک ہو اپنی رسائی جلوہ گاہِ یار تک
حُسن کا عالم گلستاں، عشق کی دُنیا قفس
عشق میں آزاد ہو کر کیا کروں سیرِ بہار
اس گلستاں کا نظر آتا ہے ہر تنکا قفس
اضطرابِ دل کے ہاتھوں سب برابر ہیں مجھے
کیا بیاباں کیا گلستاں، کیا نشیمن کیا قفس
کچھ تو ایسی بات ہے جی بیٹھا جاتا ہے مرا
ورنہ اب سے پہلے کیا میں نے نہیں دیکھا قفس
رکھ دیئے ہیں سامنے لا کر کمالِ عشق نے
اک طرف صدہا گلستاں، اک طرف صدہا قفس
تم جدھر نکلے اُدھر اک چھا گئی تازہ بہار
ہم جہاں بیٹھے وہیں اک کر لیا پیدا قفس
کیا چمن کا حال مجھ سے پوچھتا ہے ہم نشیں!
میرا گل حاصل اسیری، میری گل دُنیا قفس
باغباں مجھ سے ہے خوش صیاد مجھ پر مہرباں
اب چمن میرا چمن ہے، اب قفس میرا قفس!
دو ہی دن میں ہو گیا، اے دل یہ کیسا انقلاب
کل تھا گُل عالم گلستاں، آج گُل دنیا قفس
میں وہ غیرت مند بُلبل تھا، دکھایا پھر نہ منہ
بُوئے گُل آ آ کے ڈھونڈا کی قفس سے تا قفس



وہ مست مانندِ رند آنکھیں، وہ سُرخ مثلِ گلاب عارض
جو ہیں مجسّم شراب آنکھیں، تو ہے سراپا شباب عارض
دلوں کو بے چین کر رہی ہے بنی ہوئی برق اُن کی شوخی!
نظر کو تیرہ بنا رہا ہے لئے ہوئے آفتاب عارض

برس رہا ہے یہ رنگِ مستی کہ ہوش باقی نہیں کسی کو
نگاہیں اُن کی جھکی ہوئی ہیں، پلا رہا ہے شرابِ عارض



فرصت کہاں کہ چھیڑ کریں آسماں سے ہم
لپٹے پڑے ہیں لذّتِ دردِ نہاں سے ہم
اس درجہ بیقرار تھے دردِ نہاں سے ہم
کچھ دُور آگے بڑھ گئے عمرِ رواں سے ہم
کب تک رہیں گے دُور ترے آستاں سے ہم
اب پہنچے شرط باندھ کے عمرِ رواں سے ہم
اے چارہ ساز! حالتِ دردِ نہاں نہ پُوچھ
اک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم
تقدیر نے اسے بھی نظر سے چھپا دیا
روئے لپٹ کے گردِ پسِ کارواں سے ہم
سو جانیں ہوں تو لذّتِ آزار پر نثار
باز آئے چارہ سازیٔ دردِ نہاں سے ہم
بیٹھے ہی بیٹھے آ گیا کیا جانے، کیا خیال
پہروں لپٹ کے رُوئے دلِ ناتواں سے ہم
پوچھیں گے سرگزشتِ مصیبت کی ابتدا
اب کے اگر ملے دلِ حسرت نشاں سے ہم
بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا
آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم
اللہ ری حسن و عشق کی سحر آفرینیاں
خوش ہو رہے ہیں گھر کا گھروندا بنا کے ہم
کس کس پہ جان دیجیے، کس کس کو چاہیے
گم ہو گئے ہیں بزمِ تمنّا میں آ کے ہم
اتنے حجابوں پر تو یہ عالم ہے حُسن کا
کیا حال ہو، جو دیکھ لیں پردہ اُٹھا کے ہم
یہ بے دلی کا زور ہے ساقی کے ہجر میں
جی چاہتا ہے پھینک دیں ساغر اُٹھا کے ہم
تاثیرِ جذبِ عشق کا اللہ رے، کمال!
آئینہ بن گئے تری اک اک ادا کے ہم



سرور کم نہ کبھی ہو گا اب قیامت تک
خُمِ حجاز کی پی کر شراب آتے ہیں
کوئی یہ جا کے درِ پاک پر خبر کر دے
خراب حال بحالِ خراب آتے ہیں
کہو یہ حضرتِ موسیٰؑ سے اب سنبھل جائیں
حضور آتے ہیں اور بے نقاب آتے ہیں
وہ رند ہُوں کہ صبوحی کے واسطے ہر روز
فرشتے لے کے خُمِ آفتاب آتے ہیں



اے کاش! وہ حسرت زدۂ طور کو ملتی!!
جس آنکھ سے ہم حُسنِ بُتاں دیکھ رہے ہیں
ہر چند کہ تھمتے نہیں آنسو صفتِ شمع!
بارے تری محفل کا سماں دیکھ رہے ہیں
پھر آپ نے چھیڑی وہی گیسو کی شکایت
ہر چند کہ زورِ خفقاں دیکھ رہے ہیں
تا چند کریں ضبط مرے آبلۂ پا
سوکھی ہوئی کانٹوں کی زباں دیکھ رہے ہیں



غم سے چھوٹوں، تو اِدھر دیکھوں میں
دل کو رولوں، تو جگر دیکھوں میں

نگہِ یاس اثر دیکھوں میں!
دامنِ یار بھی تر دیکھوں میں

آشیاں کے جو اُٹھالوں تنکے
اپنے ٹوٹے ہوئے پر دیکھوں میں

داغ ہی داغ نظر آتے ہیں!
کس طرح قلب و جگر دیکھوں میں

دم گھٹا جاتا ہے، اے دستِ جنوں!
چاکِ دامانِ سحر دیکھوں میں

نہ وہ محفل ہے، نہ وہ پروانے
خاک، اے شمعِ سحر، دیکھوں میں

نزع میں ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
کاش! انہیں ایک نظر دیکھوں میں

دلِ دیوانہ، یہ قسمت میری
کہ تجھے خاک بسر دیکھوں میں

چھوٹ جاؤں جو غمِ ہستی سے
بھول کر بھی نہ اُدھر دیکھوں میں



عرش سے ہو کے جو مایوس دعائیں آئیں
میں یہ سمجھا کہ مرے گھر میں بلائیں آئیں

میں نے جب شرم سے محشر میں جھکالی گردن
بخشوانے کو مجھے میری خطائیں آئیں

کیجئے اور کوئی ظلم، اگر ضد ہے یہی!
لیجئے اور مرے لب پہ دعائیں آئیں

مدّتوں یاد دلایا گیا افسانۂ غم!
دل اگر خاک ہوا دل کی صدائیں آئیں

کسی بیکس کا پڑا صبر کسی پر شاید!
آج اُس سمت سے ناساز ہوائیں آئیں

پوچھو افسانۂ غم، شام سے لے کر تا صبح
کیا بھیانک مرے کانوں میں صدائیں آئی

میں نے جب مرحلۂ عشق کیا ختم، جگر
مرحبا کی مرے کانوں میں صدائیں آئیں



اُس کوچے میں ہوں صورتِ یک نقشِ وفا میں
دُنیا نے مٹایا مجھے، لیکن نہ مٹا میں

بن بن کے مٹاؤ نہ مرا نقشۂ ہستی
مٹ مٹ کے بنا ہوں ہمہ تن نقشِ وفا میں

اے اہلِ حقیقت! مجھے آنکھوں پہ بٹھاؤ
طے کر کے چلا آتا ہوں میدانِ وفا میں



سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، داغِ تمنا ہوں
مجھے دُنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دُنیا ہوں

کبھی کیفِ مجسّم ہوں، کبھی شوقِ سراپا ہوں
خدا جانے کہ کس کا درد ہوں کس کی تمنا ہوں

مجھے جنبش میں کیا لائے گی موجِ صرصرِ عالم
حریمِ قدس کہتے ہیں جسے، میں اُس کا پردہ ہوں

مجھی میں حُسن کا عالم، مجھی میں عشق کی دُنیا
نثار اپنے پہ ہو جاؤں، اگر سو بار پیدا ہوں



لب پہ نالہ نہیں، شکوہ نہیں، فریاد نہیں — پھر بھی کہتے ہیں کہ تو لائقِ بیداد نہیں



ضبطِ غم کا متحمل دلِ مجبور نہیں — اب یہ جی سے بھی گزر جائے تو کچھ دور نہیں
طلبِ خُلد نہیں، آرزوئے حُور نہیں — تم جو مل جاؤ تو پھر کچھ مجھے منظور نہیں
اللہ اللہ ری یہ رنگِ حقیقت کی بہار! — کون سا خون کا قطرہ ہے جو منصُور نہیں؟
سخت مشکل سے پڑا آج گریبان پہ ہاتھ — میں سمجھتا تھا کہ یہ فاصلہ کچھ دُور نہیں
دل کے ہوتے ہوئے جاتے ہو کہاں، اے موسیٰ! — اس میں کچھ جلوے ہیں ایسے کہ سرِ طور نہیں



کیا آ گیا خیال دلِ بے قرار میں — خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں
محشر میں عرضِ شوق کی اُمید کیا کروں — دل ہی تو ہے رہا نہ رہا اختیار میں
دستِ جُنونِ عشق کی گل کاریاں نہ پوچھ — ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک. بہار میں
صُورت دکھا کے پھر مجھے بیتاب کر دیا — اِک لُطف آ چلا تھا غمِ انتظار میں
رگ رگ میں دل ہے، دل میں تڑپ دردِ عشق کی — محشر بنا ہوا ہوں تمنائے یار میں
تھم تھم کے دل سے چھیڑ ہو، تیرِ نگاہِ یار! — کیا لُطف، جب ہمیں نہ رہے اختیار میں



چھوڑا نہ تپِ عشق نے کچھ بھی کسی گھر میں — دل سے جو لگی آگ، بجھی جا کے جگر میں
اب شمع بھی بجھتی ہے، مرا دم ہے لبوں پر — کیا دیر ہے، یارب! شبِ فُرقت کی سحر میں
پھر برق سے مجھ کو نہ رہے کوئی شکایت — ایسی ہی لگے آگ جو صیّاد کے گھر میں



یہی کہہ کے تسلّی دلِ ناشاد کرتے ہیں — کہ ایسا بھی کبھی ہوتا ہے، وہ خود یاد کرتے ہیں
بنا کر اپنے ہاتھوں آشیاں برباد کرتے ہیں — جو تیرا کام تھا، وہ بھی ہم اے صیاد کرتے ہیں



اچھا ہے پاس اگر کوئی غم خوار بھی نہیں — اب میرا حال لائقِ اظہار بھی نہیں
حسرت سے اب نگہ طرفِ یار بھی نہیں — یعنی کہ ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
دامان و جیب ہو گئے نذرِ جنوں تمام — باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں
صیّاد میرے دم سے ہیں سارے یہ چہچہے — جب میں نہیں تو رونقِ گلزار بھی نہیں
کچھ یہ کہ عرضِ شوق کی طاقت نہیں مجھے — اور کچھ یہ ہے کہ مصلحتِ یار بھی نہیں

وہ دل کہ جس پر حرفِ تمنا بھی بار تھا
اب صرف شکوہ سنجِ اغیار بھی نہیں

دل میں ہجومِ شوق کا عالم نہ پوچھیے
گنجائشِ خیالِ رُخِ یار بھی نہیں



خوفِ صیاد سے عالم ہے یہ بیتابی کا
کہ ابھی ہوں، تو ابھی صحنِ گلستاں میں نہیں

بچ رہا ہو جو کوئی جوشِ جنوں کے ہاتھوں
تار ایسا کوئی اب جیب و گریباں میں نہیں



عنایت کی جس پر نظر دیکھتے ہیں!
ہم اُس کا دل، اُس کا جگر دیکھتے ہیں

وہی راہ عُشاق چلتے ہیں ان کے
کہ جس راہ کو پُر خطر دیکھتے ہیں

فلک کے ستم، آشیاں میں ہم اپنے
سمٹتے ہوئے بال و پر دیکھتے ہیں



ڈوب کر دل میں وہ نظریں تیر و پیکاں ہو گئیں
رہ گئیں جو دل کے باہر نشترِ جاں ہو گئیں

حُسن کی شانیں تھیں جتنی سب نمایاں ہو گئیں
جو ترے رُخ سے بچیں، رنگِ گلستاں ہو گئیں

اور بھی میرے لئے آفت کا ساماں ہو گئیں
ہائے! وہ مخمور آنکھیں جب پشیماں ہو گئیں

دھجیاں باقی ہیں جتنی اب مرے کس کام کی
جو گریباں ہونے والی تھیں، گریباں ہو گئیں

ہو چلی تھیں عرضِ غم پر وہ نگاہیں تیز تیز
پھر نہ جانے، کیا خیال آیا پشیماں ہو گئیں

عرصہ گاہِ عشق میں آزادیاں کس کو نصیب
خود مری آہیں مجھے دیوارِ زنداں ہو گئیں

اب کہاں دل کی تمناؤں کی بزم آرائیاں
آنکھ جھپکی تھی کہ سب خوابِ پریشاں ہو گئیں

اِن جنوں سامانیوں پر کیا رہائی کی اُمید
حسرتیں بھی دفن زیرِ خاکِ زنداں ہو گئیں

عشق کی بے تابیاں کب چھوڑ سکتی ہیں مجھے
فرق اتنا ہے کہ اب آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں

دل کی تسکیں کے لئے دو پھول دامن میں نہیں
اس طرح ہوں آج گلشن میں، کہ گلشن میں نہیں

چین اسیرانِ قفس کو یادِ گلشن میں نہیں
دوڑتی ہیں بجلیاں، سیلابِ خوں تن میں نہیں

وہ گلوں پر تازگی، رونق وہ گلشن میں نہیں
خاک سی اڑتی ہے جب سے میں نشیمن میں نہیں

چھوٹنا قیدِ قفس سے کیا قیامت ہو گیا
اب برائے نام بھی راحت نشیمن میں نہیں

اُس طرف صیاد کی نظریں، اِدھر نالے مرے
یا وہ گلشن میں نہیں اب، یا میں گلشن میں نہیں

دید کے قابل ہے یہ رنگِ سبک رُوحی مرا
ڈھونڈتی ہے برق مجھ کو میں نشیمن میں نہیں

کیوں خزاں میں سر جھکائے مضمحل بیٹھا رہوں
میری نظروں میں تو ہیں جو پھول گلشن میں نہیں

رک گئی کنجِ قفس میں خود بخود میری زباں!
شاید اک تنکا بھی باقی اب نشیمن میں نہیں



جوش وہ رنگینیوں کا اُن کے پیکاں میں نہیں — کیا کوئی قطرہ لہو کا اب رگِ جاں میں نہیں
کوئی دیوانہ ہی اس عہدِ پریشاں میں نہیں — ورنہ جو صحرا میں قیدی ہیں، وہ زنداں میں نہیں
فیضِ سوزِ عشق سے، اے دل! سراپا داغ ہوں — جو بہار اب مجھ میں ہے، سارے گلستاں میں نہیں
نالۂ پُر درد، بُوئے سوزِ دل، داغِ جگر — یہ بہاریں ہیں قفس کی، جو گلستاں میں نہیں
بھر نہ دی ہو رُوح جس میں وحشتِ دل نے مری — ایک ذرّہ بھی کوئی ایسا بیاباں میں نہیں



جو اب اُن کا کہاں سارے جہاں میں — دبی ہیں بجلیاں جو آشیاں میں
لبوں تک جان بھی کھچ آئی، یا رب! — توقف کیا ہے مرگِ ناگہاں میں
جگہ پر اپنی چھوڑ آیا ہوں، صیاد — لہو کے چند قطرے آشیاں میں
اشارہ ہے کسی کی اِک نظر کا — وگرنہ کیا ہے جانِ ناتواں میں
بتا دے بے خودیٔ عشق! اتنا — قفس میں ہوں کہ ہوں میں آشیاں میں
حقیقت کھول کر اِک دن رہیں گے — وہ آنسو، جو ہیں چشمِ راز داں میں
بڑھی جاتی ہے وحشت ہر قدم پر — چُھپا جاتا ہوں گردِ کارواں میں
یہ رنگِ اتحاد، اللہ اکبر! — شبیہ دل ہے ہر اشکِ رواں میں
جرس کے بھی جو اُٹھ کر ہوش کھو دیں — وہ نغمے ہیں مرے سازِ فغاں میں
رہی لرزاں ہمیشہ اُن سے بجلی! — جو تنکے بچ رہے تھے آشیاں میں
کیے جا نالے اے بُلبُل! کیے جا — قفس بھی مل رہے گا آشیاں میں



کسی نے پھر نہ سُنا درد کے فسانے کو — مرے نہ ہونے سے راحت ہوئی زمانے کو
اب اس میں جان مری جائے یا رہے، صیاد! — بہار میں تو نہ چھوڑوں گا آشیانے کو
چلا نہ پھر کوئی مجھ پر فریب ہستی کا — لحد تک آئی اجل بھی مرے منانے کو
فلک! ذرا مری اس بے بسی کی داد تو دے — قفس میں بیٹھ کے روتا ہوں آشیانے کو
وفا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا — ترے سلوک نے چونکا دیا زمانے کو
قفس کی یاد میں پھر جی یہ چاہتا ہے، جگر — لگا کے آگ نکل جاؤں آشیانے کو



جب کبھی چھیڑا جنوں نے دیدۂ خونبار کو — بھر دیا پھولوں سے ہم نے دامنِ کہسار کو
ٹھیس لگ جائے نہ اُن کی حسرتِ دیدار کو — اے ہجومِ غم! سنبھلنے دے ذرا بیمار کو

فکر ہے زاہد کو حور کوثر و تسنیم کی
اور ہم جنّت سمجھتے ہیں ترے دیدار کو

دیکھنے والے نگاہِ مست ساقی کی کبھی
آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں ساغرِ سرشار کو

ہر قدم پر، ہر روش پر، ہر ادا پر، ہر جگہ
دیکھنا پڑتا ہے اندازِ نگاہِ یار کو

لاکھ سمجھایا جگر کو ایک بھی مانی نہ بات
دُھن لگی تھی کوچۂ قاتل کو میرے یار کو



واقف غمِ اُلفت سے نہ دل ہو، نہ جگر ہو
یوں مجھ سے ملو تم کہ مجھے بھی نہ خبر ہو

یہ سر ہو اور اُس شوخِ ستم گار کا در ہو
اس طرح بسر ہو، تو بہت خوب بسر ہو

اس قہر و غضب پر تو فدا دیدہ و دل ہیں
کیا حال ہو میرا، جو عنایت کی نظر ہو

سر رکھ ہی دیا سنگِ درِ یار پہ میں نے
اب حشر بھی اُٹھے، تو مجھے کچھ نہ خبر ہو

حالت دلِ مایوس کی دیکھی نہیں جاتی
اللہ کرے، جلد شبِ غم کی سحر ہو!

رہ رہ کے تڑپ جاتی ہے سینے میں کوئی چیز
ایسا نہ ہو، بیتاب تمہاری ہی نظر ہو



وفورِ کیف سے دل اتنا بے قرار نہ ہو
میں ڈر رہا ہوں کی مضطر نگاہِ یار نہ ہو

شریکِ عشق اگر عقلِ پردہ دار نہ ہو
نظر کے سامنے کچھ بھی سوائے یار نہ ہو

نگاہِ یار کا ممکن نہیں کہ وار نہ ہو
خود اپنا عیب ہے، سینہ اگر فگار نہ ہو

دکھاؤں داغِ محبت جو ہو قصور معاف
سُناؤں قصۂ فُرقت، جو ناگوار نہ ہو

کہاں کے سرو صنوبر، کہاں کے لالہ و گل
نگاہ ہی میں جو کیفیتِ بہار نہ ہو

انھیں تو دیکھ کے آئینہ وہم کرتا ہے
کہ یہ کسی کی کہیں چشمِ انتظار نہ ہو

عجب زمانہ ہے، کرتا نہیں اسے تسلیم
کسی سبب سے بظاہر جو بے قرار نہ ہو

بس اِک نگاہِ محبت سے دیکھ لینا ہے
مگر جو خاطرِ نازک پہ کوئی بار نہ ہو

نصیب دل کو ہو یوں محوِ آرزو ہونا
کہ خود بھی چاہیں اگر وہ تو ہوشیار نہ ہو

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حُسن کے جلوے
یہ کیا مجال، جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

خیالِ وصل سے کرتو رہا ہوں کچھ باتیں
قریب ہی کہیں لیکن نگاہِ یار نہ ہو

میں سُن کے حضرتِ اصغر کے، اے جگر اشعار
وہ مست ہوں کہ کوئی پی کے بادہ خوار نہ ہو



نہ چھیڑ اُن کے تصور میں، اے بہار! مجھے
کہ بُوئے گُل بھی ہے اس وقت ناگوار مجھے

تڑپ کے رُوح نکل جائے گی ابھی صیاد
سُنا قفس میں نہ کیفیتِ بہار مجھے

نگاہِ یاس! ذرا تو ہی کام کر اپنا — کہاں وہ چھوڑ کر جاتے ہیں بے قرار مجھے
کسی کا وعدۂ دیدار، میرا جذبۂ شوق — بنا، نہ دے کہیں تصویرِ انتظار مجھے
ہجومِ یاس میں کوشش نہ کوئی کام آئی — تسلّیوں نے کیا اور بے قرار مجھے
کہیں مرا دلِ گُم گشتہ ہو نہ خاک بسر — کہ دُور تک نظر آتا ہے اِک غبار مجھے
جنوں کی خیر ہو، یاربّ! کہ ضعف کے ہاتھوں — رہا نہ جیب و گریباں پہ اختیار مجھے



رخ پہ جھونکوں سے جو زلفِ دوتا پھرتی ہے — کیسی بل کھائی ہوئی بادِ صبا پھرتی ہے
پاس جانا، دلِ بیتاب، سنبھل کر، شبِ وصل — نیچی نظروں میں چھری بن کے حیا پھرتی ہے
کچھ ہمیں جانتے ہیں لُطف ترے کوچے کے — ورنہ پھرنے کو تو مخلوقِ خدا پھرتی ہے
مدد، اے جذبۂ دل! حوصلہ اے دردِ فراق! — مجھ سے مل کر نگہِ ہوش رُبا پھرتی ہے
بھول سکتا ہوں کہیں اُن کی محبت کے مزے — میری آنکھوں میں وہ ایک ایک ادا پھرتی ہے



دِل کو مٹا کے داغِ تمنا دیا مجھے — اے عشق! تری خیر ہو، یہ کیا دیا مجھے
محشر میں بات بھی نہ زباں سے نکل سکی — کیا جھک کے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے
میں اور آرزوئے وصالِ پری رُخاں — اس عشقِ سادہ لوح نے بہکا دیا مجھے
ہر بار یاس ہجر میں دل کی ہوئی شریک — ہر مرتبہ اُمید نے دھوکا دیا مجھے
اللہ رے، تیغِ عشق کی برہم مزاجیاں! — میرے ہی خونِ شوق میں نہلا دیا مجھے
خوش ہوں کہ حُسنِ یار نے خود اپنے ہاتھ سے — اک دل فریب داغِ تمنا دیا مجھے
دنیا سے کھو چکا تھا مرا جوشِ انتظار — آوازِ پائے یار نے چونکا دیا مجھے
دعویٰ کیا تھا ضبطِ محبت کا، اے جگر! — ظالم نے بات بات پہ تڑپا دیا مجھے

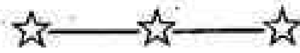


ہم اور ان کے سامنے عرضِ نیازِ عشق — لیکن ہجومِ عشق سے مجبور ہو گئے
آئی ہے موت منزلِ مقصود دیکھ کر — اتنے ہوئے قریب کہ ہم دُور ہو گئے



کچھ بات بن پڑی نہ دلِ داد خواہ سے — کیا جانے کیا وہ کہہ گئی نیچی نگاہ سے
کوئی نہ بچ سکا، تری قاتل نگاہ سے — ذرّے بھی صدقے ہو گئے اُٹھ اُٹھ کے راہ سے

یہ جانتا ہوں، جانتے ہو، میرا حالِ دل یہ دیکھتا ہوں، دیکھتے ہو کس نگاہ سے



اس درجہ محوِ لذّتِ رنج و محن ہوئے ناوک بھی اس نگاہ کے جزوِ بدن ہوئے
ہر وقت تازہ چاہئیں غم کی نشانیاں جو داغ بھی پڑے تھے وہ داغِ کہن ہوئے
غربت کا رشک بھی نہ گوارا ہوا، جگر کہتے ہیں میرے بعد غریب الوطن ہوئے



کیا خبر تھی خلشِ ناز نہ جینے دے گی یہ تری پیار کی آواز نہ جینے دے گی
قہر کی لاکھ نگاہوں کی ضرورت کیا ہے؟ لطف کی اِک نگہِ ناز نہ جینے دے گی
چین آتا ہی نہیں مجھ کو قفس میں، یا رب! کیا مری حسرتِ پرواز نہ جینے دے گی؟
مسلکِ عشق مرا مجھ کو نہ مرنے دے گا تیری شوخی، ستمِ ناز! نہ جینے دے گی



کیا چیز تھی، کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی اُف کر کے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی
ہوتی ہی نہیں کم شبِ فرقت کی سیاہی رخصت ہوئی کیا شام کے ہمراہ سحر بھی؟
یہ مجرمِ اُلفت ہے اور وہ مجرمِ دیدار دل لے کے چلے ہو، تو لئے جاؤ نظر بھی!
کیا دیکھیں گے ہم جلوۂ محبوب کہ ہم سے دیکھی نہ گئی دیکھنے والے کی نظر بھی
مایوس شبِ ہجر نہ ہو، اے دلِ بیتاب! اللہ دکھائے گا تو دیکھیں گے سحر بھی
جلووں کو ترے دیکھ کے جی چاہ رہا ہے اب آنکھوں میں اُتر آئے مرا کیفِ نظر بھی
واعظ، نہ ڈرا مجھ کو قیامت کی سحر سے دیکھی ہے ان آنکھوں نے قیامت کی سحر بھی
اس دل کے تصدّق، جو محبت سے بھرا ہو اُس درد کے صدقے، جو اِدھر بھی ہو اُدھر بھی
ہے فیصلۂ عشق ہی منظور تو اُٹھئے! اغیار بھی موجود ہیں، حاضر ہے جگر بھی



گر چشمِ آرزو کی حالت یہی رہے گی پردے میں بھی کسی کی بے پردگی رہے گی
تم خاک میں ملا دو دل کو، جگر کو، لیکن ارماں یہی رہیں گے حسرت یہی رہے گی
جا، اے فلک! نہ خوش ہو برباد کر کے مجھ کو تیرے مزاج میں بھی آشفتگی رہے گی



اُداسی طبیعت پہ چھا جائے گی اُنہیں جب میری یاد آ جائے گی
شبِ غم کرشمے دکھا جائے گی کمی آنسوؤں کی رُلا جائے گی

میرے بعد ڈھونڈو گے میری وفا
مرے ساتھ میری وفا جائے گی

مجھے اُس کے در پر ہے مرنا ضرور
مری یہ ادا اُس کو بھا جائے گی



چیخی ہے کس انداز سے، کس کرب و بلا سے
دل ٹوٹ گیا نالۂ بُلبُل کی صدا سے

انسان کو لازم ہے رہے دُور ریا سے
یہ چیز جُدا کرتی ہے بندے کو خُدا سے

جی سیر ہو کس طرح مئے ہوش رُبا سے
مستی کو ہے بیعت مری رندانہ ادا سے

اُٹھے نہ قدم جادۂ تسلیم و رضا سے
آواز یہ آتی ہے مزار شُہدا سے

پھر حُسن کے جلوؤں نے بنایا مجھے بے خود
ہشیار ہوا تھا جرسِ دل کی صدا سے

گزرا ہے دلِ و جاں سے اسی راہ میں کوئی
سجدوں کے نشاں پوچھ لو نقشِ کفِ پا سے

بیتابئ دل تھی وہ مری آہِ جنوں خیز
کانٹے بھی کھٹکتے رہے مجھ آبلہ پا سے



صدموں کی جان، درد کا قالب دیا مجھے
جو کُچھ دیا کسی نے، مناسب دیا مجھے

دی جان بھی تو سوز و الم سے جلی ہوئی
دل بھی دیا تو جان کا طالب دیا مجھے

دیتی تھی میرے دل کو جو شوریدگئ عشق
پھر کیوں خیالِ حفظِ مراتب دیا مجھے



اُٹھا نہ دیدۂ بُلبل سے پردۂ غفلت
ہلاک ہو گئی کم بخت رنگ و بُو کے لئے

ہجومِ شوق میں دل کے بھی ہو گئے ٹکڑے
مکان تنگ تھا، دُنیائے آرزو کے لئے

خیالِ یار! کہاں تک خموشیاں تیری!
زبان دہن میں ہے بیتاب گفتگو کے لئے



آہ! میری یہ فغاں اب نہ سُنی جائے گی!
اب نہ سنو داستاں، اب نہ سُنی جائے گی

پھر گئی اُن کی نظر، پھر گئے دُنیا سے وہ
دوستئ جسم و جاں اب نہ سُنی جائے گی

یاس بھرا دردِ دل اب نہ کہا جائے گا
درد بھری داستاں اب نہ سُنی جائے گی

قصہ غم کہہ کے مَیں لیجئے خاموش ہُوں
میرے دہن میں زباں اب نہ سُنی جائے گی

بزم سے باچشمِ تر اُٹھ گئے کہتے ہوئے
”ہم سے تری داستاں اب نہ سُنی جائے گی“

رحم انہیں آگیا میرے دلِ زار پر
یہ روشِ آسماں، اب نہ سُنی جائے گی

کہہ کے بُرا غیر کو اُن کو خفا کر دیا!
بات جگر کی وہاں اب نہ سنی جائے گی



یہ نہیں، تیری آرزُو نہ کرے — دل مگر خالی ہائے و ہُو نہ کرے
گُم ہوا ہوں خیالِ جاناں میں — بے خودی میری جستجُو نہ کرے
ختم سرمایۂ شکیب ہُوا — چھیڑ اب تیری آرزو نہ کرے
ناز کرتے ہیں پُھول گلشن میں — کہیں رُسوا یہ رنگ و بُو نہ کرے
خاک ہے جذبِ عشق کی تاثیر — خامشی بھی جو گفتگو نہ کرے
ڈر ہے مجھ کو میری حیرانی — آئینہ اُن کے رُوبرُو نہ کرے
یاد بھی اُن کی اے جگر! صد حیف — پرسشِ داغ آرزُو نہ کرے



برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے — کیا اُٹھ کے کہہ دیا مری خاکِ مزار نے
اے شوقِ مرگ! پھر وہی میں ہوں، وہی قفس — آسان کر نہ دی مری مشکل بہار نے



سر میں پھر لہر جنوں کی صفتِ تیر چلی — اے فلک روک مرے پاؤں سے زنجیر چلی
صدقے اُن ہاتھوں کے، مجھ کو بھی خبر تک نہ ہوئی — اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی
اب مری لاش پہ کیوں سوگ لئے بیٹھے ہو — تم نے شمشیر چلائی تھی، تو شمشیر چلی



عاشقی یاس کی محکوم ہوئی جاتی ہے — بے کسی اب مرا مفہوم ہوئی جاتی ہے
دل ہوا خاک تپ غم سے مگر دل کی جگہ — اک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے
وائے ایذا طلبی! شدّتِ غم کے ہاتھوں — طاقت گریہ بھی معدوم ہوئی جاتی ہے
ہم تو سمجھے تھے، غمِ عشق فنا کر دے گی — اب یہ اُمید بھی موہوم ہوئی جاتی ہے
وہی دل ہے، جو چُھٹا جاتا ہے دامن سے ترے — وہی قسمت ہے، جو محروم ہوئی جاتی ہے
دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فُرقت میں — کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے
اے جگر! بات یہ کیا ہے کہ مری نظروں میں — آج جو چیز ہے، معدوم ہوئی جاتی ہے



نازک ترے مریضِ محبت کا حال ہے — دن کٹ گیا، تو رات کا کٹنا محال ہے
آنکھوں سے جان جائیے فُرقت کا ماجرا — اشکوں سے پوچھ لیجئے، جو دل کا حال ہے



نظر ملتے ہی دل کو وقفِ تسلیم و رضا کر دے
جہاں سے ابتدا کی ہے، وہیں پر انتہا کر دے
وفا پر دل کو صدقے، جان کو نذرِ جفا کر دے
محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو، فنا کر دے
چمن دُور، آشیاں برباد، یہ ٹوٹے ہوئے بازو
مرا کیا حال ہو صیاد اگر مجھ کو رہا کر دے
چُنے ہیں میں نے بھی کچھ پھولِ تیرے باغِ معنی سے
الٰہی! تو اگر حُسنِ قبول اُن کو عطا کر دے
تری مجنوں ادائی سے جگر یہ خوف آتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو، اُن کو بھی عالم آشنا کر دے



شبِ وصل کیا مختصر ہو گئی
ذرا آنکھ جھپکی سحر ہو گئی
نگاہوں نے سب رازِ دل کہہ دیا
اُنھیں آج اپنی خبر ہو گئی
بُری چیز ہے طرزِ بیگانگی
یہ ترکیب اگر کارگر ہو گئی
الٰہی! بُرا ہو غمِ عشق کا
سنا ہے کہ اُن کو خبر ہو گئی
کئے مجھ پہ احساں غمِ یار نے
ہمیشہ کو نیچی نظر ہو گئی
نمایاں ہوئی صبحِ پیری، جگر
بس اب داستاں مختصر ہو گئی



کیا لُطف پوچھتے ہو پُر شوق زندگی کے
جی جی اُٹھا ہوں مر کے، مر مر گیا ہوں جی کے
بے حکمِ عشق مر کے، بے اذنِ عشق جی کے
کرتے ہیں مُفت ضائع اوقات زندگی کے
دیکھا تو اس جگہ پر لاکھوں ہیں زخم تازہ
حاصل ہوئی تھی فرحت جس زخمِ دل کو سی کے
فیضِ بہار سے ہے عالم یہ تازگی کا
گویا برس رہے ہیں انوار زندگی کے
اک اک سے پوچھتے ہیں وہ میری حالتِ دل
قُربان اِس ادا کے، اِس بے تعلقی کے



فلک کے جور، زمانے کے غم اُٹھائے ہوئے
ہمیں بہت نہ ستاؤ کہ ہیں ستائے ہوئے
نہ جانے دل میں وہ کیا سوچتے رہے پیہم
مرے جنازے پہ تا دیر سر جھکائے ہوئے
نگاہِ شوق نے محشر میں صاف تاڑ لیا
کہاں وہ چھپتے کہ آنکھوں میں تھے سمائے ہوئے
انھیں میں رازِ محبت کسی کا پنہاں تھا
جو خشک ہو گئے آنسو مژہ تک آئے ہوئے
حدودِ کوچۂ محبوب ہیں وہیں سے شروع
جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگائے ہوئے



چلے گا کام تمہارا نہ اب گواہوں سے
کہ ٹپکی پڑتی ہے شرمندگی نگاہوں سے
اثر کو بھی نہ رہا ربط دل کی آہوں سے
خدا پناہ میں رکھے تری نگاہوں سے

کہیں تمہیں بھی نہ پڑ جائے کام آہوں سے / بچے ہو تم مری حسرت بھری نگاہوں سے
مریضِ ہجر کے چہرے پر آ گئی رونق / ابھی تو کہہ گئے، کیا جانے کیا نگاہوں سے
زمیں بھی نہ اُٹھائے گی، میری خاک کا بار / گرا دیا مجھے تم نے اگر نگاہوں سے
جگر، بتایئے کچھ حالِ زار، خیر تو ہے / یہ کیوں برستی ہیں مایوسیاں نگاہوں سے



دل کی خبر نہ ہوش کسی کو جگر کا ہے / اللہ، اب یہ حال تمہاری نظر کا ہے!
اس سمت دیکھتی بھی نہیں، رُخ جدھر کا ہے / سب سے جُدا اُصول تمہاری نظر کا ہے
دل رکھ دیا ہے سامنے لا کر خلوص سے / آگے اب اس کے کام تمہاری نظر کا ہے
سب رفتہ رفتہ داغِ الم دے گئے، مگر / محفوظ ہے وہ زخم جو پہلی نظر کا ہے
میرے دلِ حزیں میں کہاں تابِ اضطراب / جو کچھ کمال ہے وہ تمہاری نظر کا ہے
کس طرح دیکھوں جلوۂ جاناں کو بے حجاب / پردہ پڑا ہوا مرے آگے نظر کا ہے
پیہم ہجومِ یاس سے آتا نہیں یقیں / تم میرے سامنے ہو کہ دھوکا نظر کا ہے



ہاں چلے دَور میں، ساقی، مئے گلفام چلے / دن چلے، رات چلے، صبح چلے، شام چلے
خاک بیمارِ غمِ عشق کا اب کام چلے / پاؤں دکھنے لگے، جب اُٹھ کے وہ دو گام چلے
جُھک گئے سر تری دہلیز پہ سب آپ سے آپ / کچھ کسی کی نہ چلی جب ترے احکام چلے
کعبۂ دل کی حقیقت سے تو واقف ہی نہیں / باندھ کر شیخ کہاں جامۂ احرام چلے؟
نقد کچھ پاس نہیں، فکر ہے مے خواری کی / قرض مل جائے کہیں سے تو بڑا کام چلے
پاؤں لٹکائے ہوئے قبر میں بیٹھے ہیں، جگر / دیر چلنے میں نہیں، صبح چلے، شام چلے



کیا قیامت تھا کسی کا شکوۂ بیداد بھی / لب تک آئی ٹکڑے ہو ہو کر مری فریاد بھی
پہلے تھی کچھ اس سے تسکینِ دلِ ناشاد بھی / اب کلیجہ کھائے جاتی ہے تمہاری یاد بھی
جسم ہے زنداں ہیں، لیکن رُوح بزمِ یار میں / بیڑیاں بھی پاؤں میں ہیں اور ہوں آزاد بھی
آتے ہی کنجِ قفس میں چپ سی مجھ کو لگ گئی / لے اُڑے کیا ہوش تیرے، طاقتِ فریاد بھی
یوں نہ، اے بُلبل! تڑپ کر جان دینی تھی تجھے / چاہیئے تھا کچھ تو پاسِ خاطرِ صیاد بھی
دیکھئے کس کی فغاں میں پہلے آتا ہے اثر / میں بھی نالے کر رہا ہوں، بُلبُل ناشاد بھی
یہ ہجومِ یاس و حرماں، یہ وفورِ رنج و غم! / مجھ کو ڈر ہے، درد بن جائے نہ تیری یاد بھی

مجھ سے ہی کچھ واسطہ طلب نہیں اُن کو جگر
تیز ہوتا ہے مجھ پر خنجرِ بیداد بھی



جان سے تنگ ہمارا دل دیوانہ ہے
زندگی کا ہے کو ہے، موت کا افسانہ ہے

گوشہ گوشہ میں نہاں جلوۂ جانانہ ہے
دل نہیں ہے مرے سینہ میں، یہ میخانہ ہے

وہی گل ہے، وہی بلبل، وہی پروانہ ہے
شان ہے ایک، مگر رنگ جُدا گانہ ہے

یہی صہبا، یہی ساغر، یہی پیمانہ ہے
چشمِ ساقی ہے کہ میخانے کا میخانہ ہے

کان ہنگامۂ محشر پہ لگے ہیں سب کے
کیا ترے رہگذر عام کا افسانہ ہے!

اللہ اللہ، یہ وارفتگیٔ عشق مری!
اُس جگہ ہوں کہ جہاں حُسن بھی دیوانہ ہے

تم دکھا دو جسے آنکھیں، وہی مخمور بنے
ہم جہاں شیشہ پٹک دیں، وہی میخانہ ہے

حشر کہتے ہیں کسے؟ وعدۂ دیدار ہے کیا؟
وہ بھی میری نگہِ شوق کا افسانہ ہے

منزلِ عشق میں، اللہ رے، یہ عالمِ شوق!
ہر قدم پر مرا انداز جُداگانہ ہے

اُن سے پوچھے کوئی یہ ہوش کی باتیں میری
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہے، دیوانہ ہے



داستانِ غمِ دل اُن کو سنائی نہ گئی
بات بگڑی تھی ایسی جو بنائی نہ گئی

سب کو ہم بھول گئے جوشِ جنوں میں لیکن
ایک تری یاد تھی ایسی، جو بھلائی نہ گئی

عشق پر کچھ نہ چلا دیدۂ تر کا قابو
اس نے جو آگ لگا دی وہ بجھائی نہ گئی

پڑ گیا حُسنِ رُخِ یار کا پرتو جس پر
خاک میں مل کے بھی اس دل کی صفائی نہ گئی

کیا اُٹھائے گی صبا خاک مری اُس در سے
یہ قیامت تو خود اُن سے بھی اُٹھائی نہ گئی



رات کیا دلکش ادائے جلوۂ جانانہ تھی!
شمع جب رُخ کے مقابل آئی خود پروانہ تھی

آج رگ رگ میں مری اک شورشِ مستانہ تھی
کیا نگاہِ مست ساقی شاملِ پیمانہ تھی

صبح تک یہ یادگارِ عشق بھی افسانہ تھی
شمع اب ہے دفن جس جا تُربتِ پروانہ تھی



مشغلہ ہجر میں کچھ تو دلِ ناشاد رہے
نالہ تھمتا ہوا، رُکتی ہوئی فریاد رہے

منتشر بعد فنا یوں مری رُو داد رہے
دل مرا خاک ہو اور خاک مری برباد رہے

اک محبت کی نظر بھی دمِ بیداد رہے
کیجئے ظلم وہ مجھ پر، جو مجھے یاد رہے

کس کو معلوم ہے اس جلوہ گہِ ناز کا حال
ہوش ہی جب نہ ٹھکانے ہوں، تو کیا یاد رہے

آپ تو چھپ گئے پردے سے دکھا کر صورت
اب کوئی شاد رہے یا کوئی ناشاد رہے
رُوح سے ربطہ نہ چھوٹا ترے کوچہ کا کبھی
تیرے دیوانے اسیری میں بھی آزاد رہے
جان تو آچکی ہونٹوں پہ مری، اے صیاد!
اب بھی محدود قفس تک مری فریاد رہے؟



یہ جو دھندلی سی ضیا خانۂ زنجیر میں ہے
داغ شاید کوئی روشن دلِ دلگیر میں ہے
ہر ادا حُسن کی ڈوبی ہوئی تاثیر میں ہے
تجھ میں جو ہے وہی عالم تری تصویر میں ہے
مطمئن ہو کے کریں سیرِ چمن کیا وحشی
اک قدم باغ میں، اک خانۂ زنجیر میں ہے
پہلے ہوں گے کبھی بیتابیِ دل کے شکوے
اب تو راحت سی مجھے خانۂ زنجیر میں ہے



کیا پوچھتے ہو حالت بیمارِ محبت کی
کچھ اور ابھی گھڑیاں باقی ہیں مصیبت کی
ہر نقش ہے سینے پر نقشۂ غمِ فُرقت کا
ہر اشک ہے آنکھوں میں تصویرِ محبت کی
آ ہی گیا رحم ان کو حالِ دلِ محزوں پر
کر ہی گئی کام اپنا تاثیر محبت کی
اے جوشِ جنوں! ٹوٹے چھالا نہ مرے دل کا
دھندلی سی نشانی ہے سوزِ غمِ فُرقت کی
لاکھوں میں جگر اُس نے پہچان لیا تم کو
چھپتی ہے چھپانے سے کب آنکھ محبت کی



جورِ گلچین و جفائے باغباں دیکھا کیے
جو دکھایا تُو نے وہ، اے آسماں! دیکھا کیے
آج کن آنکھوں سے ہم جورِ خزاں دیکھا کیے
سب چمن لٹتا رہا اور باغباں دیکھا کیے
اب قفس میں ہوش آیا ہے، تو حیرت ہے ہمیں
کس طرح آنکھوں سے لٹتے آشیاں دیکھا کیے
جی بھر آیا ناتوانی پر جو راہِ شوق میں
دیر تک ہم نقشِ پائے رہرواں دیکھا کیے
جب چمن سے لے چلا صیاد کر کے ہم کو قید
دور تک مڑ مڑ کے سوئے آشیاں دیکھا کیے
تھا اسیری میں بھی کچھ ایسا تعلق رُوح کو
ہم قفس میں روز خوابِ آشیاں دیکھا کیے
خاک سیرِ لالہ وگل، باغ میں جب تک رہے
دستِ گلچیں، یا نگاہِ باغباں دیکھا کیے



آیا نہ راس نالۂ دل کا اثر مجھے
اب تم ملے، تو کچھ نہیں اپنی خبر مجھے
دل لے کے مجھ سے دیتے ہو داغِ جگر مجھے
یہ بات بھولنے کی نہیں عُمر بھر مجھے
ہر سُو دکھائی دیتے ہیں وہ جلوہ گر مجھے
کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے
ملتی نہیں ہے لذّتِ دردِ جگر مجھے
بھولی ہوئی نہ نگہِ فتنہ گر مجھے

ڈالا ہے بیخودی نے عجب راہ پر مجھے
آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں آتا نظر مجھے

کرنا ہے آج حضرتِ ناصح سے سامنا
مل جائے دو گھڑی کو تمہاری نظر مجھے

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
لے جائے جذبِ شوق مرا اب جدھر مجھے

ڈرتا ہوں جلوۂ رُخِ جاناں کو دیکھ کر
اپنا بنا نہ لے کہیں میری نظر مجھے!

یکساں ہے حُسن و عشق کی سرمستیوں کا رنگ
اُن کی خبر اُنہیں ہے نہ میری خبر مجھے!

مرنا ہے اُن کے پاؤں پہ رکھ کر سرِ نیاز
کرنا ہے آج قصۂ غم مختصر مجھے

سینے سے دل عزیز ہے دل سے ہو تم عزیز
سب سے مگر عزیز ہے میری نظر مجھے

میں دور ہوں، تو رُوئے سخن مجھ سے کس لئے
تم پاس ہو، تو کیوں نہیں آتے نظر مجھے

کیا جانئے قفس میں رہے کیا معاملہ
اب تک جو ہیں عزیز مرے بال و پر مجھے



آنکھوں میں نور، جسم میں بن کر وہ جاں رہے
یعنی ہمیں میں رہ کے وہ ہم سے نہاں رہے

ہم ہیں وہ دردمندِ محبت جہاں رہے
خاموش بھی رہے تو سراپا فغاں رہے

ہر چند وقفِ کشمکشِ دو جہاں رہے
تم بھی ہمارے ساتھ رہے، ہم جہاں رہے

باقی چمن میں کچھ تو ہمارا نشاں رہے
صیاد ہم رہیں نہ رہیں، آشیاں رہے

ہر شاخ پر ہے باغ میں صیاد کی نگاہ
مطلب یہ ہے، کہیں نہ مرا آشیاں رہے



کس قیامت کی کشش اس جذبۂ کامل میں ہے
تیر اُن کے ہاتھ میں پیکاں ہمارے دل میں ہے

اک تلاطم سا تو برپا سینۂ بسمل میں ہے
اب نہ جانے تو ہے خود یا درد تیرا دل میں ہے

جلوہ فرما کون اس اُجڑی ہوئی منزل میں ہے
آفتابِ حشر ہے، جو داغ میرے دل میں ہے

عشق کا ہر رنگ پنہاں میرے آبِ وطن میں ہے
قیس میرے سینے میں، فرہاد میرے دل میں ہے

اللہ اللہ، یہ مری مشقِ تصور کا کمال!
میں ہوں اس محفل میں اور محفل کی محفل دل میں ہے

عشق میں گم گشتگیٔ شوق راس آئی مجھے
تھی جو میرے دل میں حسرت اب وہ اُنکے دل میں ہے

ہر تڑپ کے ساتھ آجاتی ہے مجھ میں تازہ رُوح
شکر ہے اتنا اثر تو اضطرابِ دل میں ہے

شمع چپ، پروانے ششدر، اہلِ دل سب دم بخود
ہائے کیا تصویر کا عالم تری محفل میں ہے



جوانی آتے ہی اُن پر قیامت کی بہار آئی
نظر بیگانہ وار اُٹھی، حیا مستانہ وار آئی

چمن میں راس کب مجھ کو ہوائے روزگار آئی؟
قفس ہی میری قسمت میں لکھا تھا، جب بہار آئی

مری نظروں میں جب سے تازگیِ حُسنِ یار آئی
خزاں بھی آئی گلشن میں، تو مَیں سمجھا بہار آئی

وہ عاشق ہوں کہ میری لاش جب زیرِ مزار آئی
محبت نوحہ گر پہنچی، تمنا سوگوار آئی

کچھ ایسی جوش پر اب کی یہ چشمِ اشکبار آئی
قفس میں ٹوٹ کر سارے گلستاں کی بہار آئی

شمیمِ عطر بیز آئی، نسیمِ خوشگوار آئی
تم آئے سامنے یا سو بہاروں کی بہار آئی

اب آخر آشیاں کے ذکر سے صیاد کیا حاصل؟
یہ کہہ دینا ہی کیا کم تھا کہ گلشن میں بہار آئی!

چمن میں جیسی اک بُلبُل کے دم تک دیکھ لی، ہمدم
نہ پھر ایسی خزاں آئی، نہ پھر ایسی بہار آئی

وہ دیوانہ ہوں میں، جب سے بسایا میں نے زنداں کو
نہ صحرا میں اُگے کانٹے، نہ گلشن میں بہار آئی

قفس میں بھی نگاہوں سے جُدا ہوتا نہیں دم بھر
وہ عالم ہائے میرا، خاتمے پر جب بہار آئی

غضب تھا آج گلشن میں یہ حسرت خیز نظارہ
اِدھر بُلبُل کا دم ٹوٹا اُدھر فصلِ بہار آئی

اثر اتنا تو ہونا چاہیئے جذبِ محبت میں
کہ جب تک میں قفس میں تھا، قفس ہی میں بہار آئی

قفس کا اور یکایک اس طرح جنبش میں آ جانا
مگر معلوم ہوتا ہے کہ گلشن میں بہار آئی

کہیں ساغر بکف گل ہیں، کہیں خُم دربغل غنچے
چمن ہی میکدہ بھی بن گیا، جب سے بہار آئی

بنا کر جس نے بیخود آشیاں ہم سے چھڑایا تھا
سُنا ہے پھر اُسی شدّت سے گلشن میں بہار آئی

مری اس بیخودی کا یادِ گل میں کیا ٹھکانہ ہے
اُٹھی جب آشیاں سے آگ، تب سمجھا بہار آئی

وہ گھر برباد ہی ہو جائے، تو بہتر ہے، جس گھر میں
نہ صبحِ وصل آئی اور نہ شامِ انتظار آئی

نگاہِ یاس اور دب کر نگاہِ ناز سے رہتی
گئی اور چند نشتر اُن کے دل میں بھی اُتار آئی

بہارِ رفتہ میری پھر نہ آئی، اے جگر! واپس
چمن میں ہر خزاں کے بعد لیکن اک بہار آئی



علاجِ کاوشِ غم خاک، چارہ جُو کرتے!
ہزار زخم تھے کس کس جگہ رفُو کرتے؟

اشارہ خود جو نہ وہ بہرِ جستجُو کرتے
مجال کیا تھی ہماری کہ آرزُو کرتے

وہ ہم سے ملتے نہ ملتے، یہ اُن کی تھی مرضی
ہمارا کام یہی تھا کہ جستجُو کرتے

بیان ہو نہ سکی ابتداء محبت کی
تمام عُمر ہوئی شرحِ آرزُو کرتے



جلوہ جو اِن کے رُخ کا مری چشمِ تر میں ہے
شادابیٔ بہار کا عالم نظر میں ہے

اُمیدِ وصل دیدۂ حسرت اثر میں ہے
یعنی ہماری رُوح ہماری نظر میں ہے

ہر ذرّہ رقص میں ہے، جو اس رہگذر میں ہے
کیا عالمِ حیات کسی کی نظر میں ہے

تاریک ہوتی جاتی ہے رہ رہ کے کل فضا
پھر بھی مریضِ ہجر اُمیدِ سحر میں ہے

کیا آفتابِ حشر سے جھیپے گی اب یہ آنکھ
ہر ذرّہ کوئے یار کا میری نظر میں ہے
تنہائی فراق کا کیا کیجئے بیاں!
اک آہ تھی، سو وہ بھی تلاشِ اثر میں ہے
اللہ ری، یادِ طاقتِ پرواز کا اثر!
دل میں بھی وہ تڑپ نہیں، جو بال و پر میں ہے
واہوں جو گوشِ ہوش، تو عبرت کے واسطے
اک داستاں خموشیٔ شمعِ سحر میں ہے
یوں آرہے ہیں آج ہم اک بزمِ ناز سے
چہرہ پہ نور، جلوۂ جاناں نظر میں ہے
کیوں کر بہارِ شعر سے ٹپکے نہ، اے جگر!
رنگِ کلامِ حضرت اصغر نظر میں ہے



ازل کے دن جنہیں لے کر چلے تھے تیری محفل سے
وہ شعلے آج تک لپٹے ہوئے ہیں دامنِ دل سے
مجھے اب خوف ہی کیا، ہجر میں تنہائیٔ دل سے
ہزاروں محفلیں لے کر اٹھا ہوں تیری محفل سے
یہ عالم ہے ہجومِ شوق میں بیتابیٔ دل سے
کہ منزل پر پہنچ کر بھی اڑا جاتا ہوں منزل سے
فلک پر ڈوبتے جاتے ہیں تارے بھی شبِ فرقت
مگر نسبت کہاں اُن کو مرے ڈوبے ہوئے دل سے
نگاہیں قیس کی اٹھتی ہیں جوشِ کیفِ مستی میں
ذرا ہشیار رہنا، سارباں، لیلیٰ کی محمل سے
وہی سب بن گئیں نقش و نگارِ صفحۂ ہستی
اڑی تھیں جس قدر چھینٹیں مرے خونابۂ دل سے
سمجھ کر پھونکنا اس کو ذرا، اے داغِ ناکامی!
بہت سے گھر بھی ہیں آباد اس اجڑے ہوئے دل سے
محبت میں قدم رکھتے ہی گم ہونا پڑا مجھ کو
نکل آئیں ہزاروں منزلیں ایک ایک منزل سے
قیامت کیا؟ کہاں کا حشر؟ کیسا دیر؟ کیا کعبہ؟
یہ سب ہنگامے برپا ہیں مرے اک مضطرب دل سے
بیاں کیا ہوں یہاں کی مشکلیں، بس مختصر یہ ہے
وہی اچھے ہیں کچھ، جو جس قدر ہیں دور منزل سے

ہجومِ یاس ایسا کچھ نظر آتا نہیں مجھ کو
وفورِ شوق میں آگے بڑھا جاتا ہوں منزل سے
محبت میں ضرورت ہی تلاشِ غیر کی کیا تھی؟
اگر ہم ڈھونڈتے، نشتر بھی مِل جاتا رگِ گل سے
بدن سے جان بھی ہو جائے گی رخصت، جگرؔ لیکن
نہ جائے گا خیالِ حضرت اصغر مرے دل سے



بس اک نظروں کا دھوکا ہے، بس اک آنکھوں کا پردا ہے
نہ مجنوں کوئی مجنوں ہے، نہ لیلےٰ کوئی لیلا ہے
ہوسنا کی خیالِ غیریت ہی کا نتیجا ہے
جو یہ پردا بھی اُٹھ جائے تو سب اپنا ہی اپنا ہے
سمجھ میں جو نہ آئے اور بے سمجھے نہ رہنے دے
اسی کا نام شاید عشق میں نامِ تمنا ہے
یہی تو فرق ہے بس کافر و مومن میں، اے غافل!
کہ اُس کے لاکھ کعبے ہیں اور اس کا ایک کعبا ہے



مژدہ، اے شوقِ شہادت! اوج پر تقدیر ہے
آج دستِ ناز میں نازک سی اک شمشیر ہے
کم نہیں ہوتیں دلِ ایذا طلب کی خواہشیں!
آپ دیکھیں تو سہی، ترکش میں کوئی تیر ہے
کس ادا پر جان دوں، تُو ہی بتا، اے چشمِ یار!
جس ادا کو دیکھتا ہوں حُسن کی تصویر ہے
قید خانے میں جو بیٹھا ہوں یہ ہے تیری خوشی
تُو اگر کہہ دے، تو دو ٹکڑے ابھی زنجیر ہے
میرے پہلو میں نہیں ہے یہ دلِ خانہ خراب
میری بربادی کی جیتی جاگتی تصویر ہے

وہ اُدھر محوِ تماشہ، ہم اِدھر مرعوبِ حسن
وصل کی شب دونوں جانب عالمِ تصویر ہے



دلِ برباد ہی میں عالم اک آباد بھی ہے
اسی ویرانے میں مجنوں بھی ہے فرہاد بھی ہے
کیا خبر قلبِ ہوسناک کو ہنگامِ سماع
کہ انہیں نغموں میں پنہاں کوئی فریاد بھی ہے



دل بہلنے کی شبِ غم یہی صورت ہو گی
آپ کی دی ہوئی تکلیف بھی راحت ہو گی
آپ کے درد میں بھی آپ کی سیرت ہو گی
بات میں بات، نزاکت میں نزاکت ہو گی
آتشِ دوزخِ ہجراں ہے قیامت، لیکن
تم جو چاہو گے تو یہ بھی مجھے جنّت ہو گی
جمع کرتی رہے آمادگیٔ ذوقِ فنا!
کام آئے گی، اگر دل میں حرارت ہو گی
کہنے سُننے کی غمِ عشق میں حاجت ہی نہیں
آنکھ سے ٹپکے گی، دل میں جو محبت ہو گی



وہ شکل جانستاں کیا مظہرِ شانِ الٰہی ہے
نظر میں رنگِ مستی، رُخ پہ نورِ صبح گاہی ہے
اسی کو ایک دن بننا ہے خالِ عارضِ رحمت
ہمارے نامۂ اعمال کی جتنی سیاہی ہے
کسی صورت بھی ہم سے بےخبر وہ رہ نہیں سکتے
جو ہم ایسا سمجھتے ہیں، ہماری کم نگاہی ہے
خدا جانے، محبت کونسی منزل کو کہتے ہیں
نہ جس کی ابتدا ہی ہے، نہ جس کی انتہا ہی ہے



پارہ ہائے جگر

میں ہوا ہشیار جتنا، مجھ سے وہ غافل ہوا
دل سراپا غم بنا، جب میں سراپا دل ہوا



جذبۂ دل صرف جتنا بے محل ہوتا گیا
اُس قدر ذوقِ نظر میں مبتذل ہوتا گیا
تنگ اتنا دامنِ فکر و عمل ہوتا گیا
زندگی بھر آج کل ہی آج کل ہوتا گیا



دمِ اخیر بھی اُن کا یہ احترام ہوا
اُٹھے نہ ہاتھ تو آنکھوں ہی سے سلام ہوا



یہ سوزِ نہاں نہیں ہے دل میں
جلتا ہے چراغ بیکسی کا
حسرت کا لہو بھرا ہے جس میں
وہ جام ہُوں دورِ آخری کا



لے کے خط اُن کا کیا ضبط بہت کچھ، لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا



ہر ایک داغ فرقت کا دھونا پڑے گا
تمہیں بھی میرے ساتھ رونا پڑے گا
بھلا کر خود کو غافل، رحم کا تو مستحق ہو گا
کہ گل بوٹے بھی بن جائیں گے جب سادہ ورق ہو گا



کہاں وہ دن گئے یا رب! کہ تھی شکیبائی!
نظر میں پھرتی ہے صبر و قرار کی صُورت
گئے جو دل سے تو دل کو خزاں بنا کے گئے
جو آئے دل میں، تو آئے بہار کی صُورت



کیا کروں گا اب بہارِ گل بداماں دیکھ کر
محوِ حیرت ہوں خود اپنا حُسنِ پنہاں دیکھ کر



سحر تک شمعِ محفل! میں نے جل بجھنے کی ٹھانی ہے
ہمیں یہ دیکھنا ہے، خاک ہو جاتے ہیں ہم کب تک



قید قفس میں یادِ بہار آتی ہے مجھے
نشتر بنے ہوئے ہیں پر وبال آج کل



حال وحشت میں ہوا یہ ترے دیوانوں کا
جیب چھوٹی تو گریباں کو لئے بیٹھے ہیں



نہ رہا کیا کوئی دیوانوں میں
خاک اُڑتی ہے بیابانوں میں
رہ گئی آہ، اب افسانوں میں
مے نہ شیشوں میں نہ پیمانوں میں
اُٹھ گیا کیا جگر نکتہ سرا
شور برپا ہے غزل خوانوں میں



لب پہ نالہ نہیں، شکوہ نہیں، فریاد نہیں
پھر بھی فرماتے ہیں تو لائقِ بیداد نہیں



رُوح کہتی ہوئی نکلی ہے تنِ لاغر سے
اب مجھے روکنے والی کوئی زنجیر نہیں



رنگِ حیا ہے یہ تیرے جوشِ شباب میں
یا چاندنی کا پھول کھلا ہے گلاب میں



سینۂ عشق اور ناوکِ ناز
وار پر وار ہوئے جاتے ہیں
عشق سے روز ہوا عیدِ وفا
چارو ناچار ہوئے جاتے ہیں
ساقیا، توبہ کئے لیتے ہیں
لے، گنہگار ہوئے جاتے ہیں



دے چکا جب دل تو کیسا خوف، شہرت ہو تو ہو
اب یہ سر جائے تو جائے اور قیامت ہو تو ہو
دل کہاں پہلو میں، دل تو کر چکے پہلے نذر
یہ جو کچھ بے چین سا ہے، دردِ فرقت ہو تو ہو



لُطفِ تشہیر مصوّر رہے تشہیر کے ساتھ   کھینچ دے دردبھی میرا مری تصویر کے ساتھ
حاصلِ دشت نوردی ہیں یہ اے دشتِ جنوں!   آبلے ٹوٹ نہ جائیں کہیں زنجیر کے ساتھ



ہے مآل کارِ فنا یہی کہ انہیں کا رنگ عیاں رہے
نہ نظر ہماری نظر رہے، نہ زباں ہماری زباں رہے
مرے عشقِ سحرطراز نے بہت اُن کے جلوے دکھادئے
مگر ایسے لاکھوں ہی حُسن تھے، جونظر سے بھی نہاں رہے



آنکھوں میں بند جلوۂ جاناں کئے ہوئے   جاتا ہوں ذرّہ ذرّہ کو حیراں کئے ہوئے



مشروط نگاہِ ساقی کی تحریک پہ جس کا پینا ہے   بس اُس کا ساغر ساغر ہے، بس اُس کا مینا مینا ہے



چشمِ اُمید میں ہے جان ابھی تھوڑی سی   ابھی دُھندلا سا اُجالا نظر آتا ہے مجھے



تصوّر میں یہ کس کا جلوۂ مستانہ آتا ہے   کہ ہر آنسو لئے ہمراہ اک پیمانہ آتا ہے



دمِ اظہارِ سوزِ پنہانی   شُعلے میری زبان سے آئے



سوزِ غمِ ہجر! بُجھ نہ جائے   دُھندلا سا چراغ بے کسی ہے



سفّاک چتونیں بھی ہیں، قاتل نظر بھی ہے   کیا چیز ہو گئے ہو، تمہیں کچھ خبر بھی ہے



اُس سے تو عنایت کی نظر کی نہیں جاتی   اور دل کی یہ حالت ہے کہ دیکھی نہیں جاتی



ہستی کے نکات پوچھتا ہے   غافل، تجھے اپنی بھی خبر ہے!



آنسوؤں کی کمی نہیں، لیکن کچھ سبب تھا کہ آنکھ تر نہ ہوئی



پردے اُلٹ دیئے تھے محبت کے جوش نے کھویا مگر مجھے مرے تمکین و ہوش نے



تاثیرِ سوزِ عشق سے بچنا محال ہے ایسی لگے یہ آگ کہ دیکھا کرے کوئی



پیری بھی تمام ہونے آئی دن ڈھل چکا شام ہونے آئی



مسرور وقتِ نزع جو بیمار ہو گئے کیا جانے کیا اشاروں میں اقرار ہو گئے
ترکِ خودی سے مائلِ پندار ہو گئے آزاد ہوتے ہوتے گرفتار ہو گئے



کیا جانئے کب تک مجھے فُرقت میں کل آئے دل کو ابھی روکا تھا کہ آنسو نکل آئے



یہ نہ پوچھو دہر میں کب سے مَیں اسی طرح خانہ خراب ہوں
جو نہ مٹ سکا وہ طلسم ہوں، جو نہ اُٹھ سکا، وہ حجاب ہوں
مجھے غیر سمجھیں نہ اہلِ دل، ہمہ تن اگرچہ حجاب ہوں
جو نہاں ہے میری نظر سے بھی، میں اُسی کے رُخ کی نقاب ہوں
تعلّقات کی حد کوئی، نہ توقّعات کی حد کوئی
جو کبھی سمجھ میں نہ آسکے، وہ میں ایک فردِ حساب ہوں
نہ صدائے بُلبلِ خوش بیاں، نہ سرودِ بزمِ پری رُخاں
جو بھرا ہے نغمۂ درد سے، وہ میں ایک تارِ رُباب ہوں



تخیّلاتِ جگرؔ

(دورِ دوم)

دل کیا ہے نقشِ حُسنِ حقیقت طراز کا
آئینہ کیا ہے، عکس ہے آئینہ ساز کا

عالم نہ پوچھ عشق کی شانِ نماز کا
کونین ایک ذرّہ ہے خاکِ نیاز کا

آخر کھلا یہ راز طلسمِ مجاز کا
اک شعبدہ تھا غفلتِ بیگانہ ساز کا

دھوکا قدم قدم پہ تری بزمِ ناز کا
کیا سخت مرحلہ ہے طلسمِ مجاز کا

اللہ رے اثر نگہِ مستِ ناز کا!
ہر پردہ ارتعاش میں ہے دل کے ساز کا

چھایا یہ رنگِ ہستیٔ وحدت طراز کا
مفتی نے دے دیا مجھے فتویٰ جواز کا

عالم نہ پُوچھ! کشمکشِ ضبطِ راز کا
ہر سانس ہے پیامِ غمِ جاں گداز کا

کِس لُطف سے کٹیں شبِ غم کی مُصیبتیں
ممنون ہوں محبتِ افسانہ ساز کا

تو محوِ بے خودی ہی رہا، ورنہ بے خبر!
پنہاں تھا نازِ حُسن میں عالم نیاز کا

پیراہنِ جنوں سے تنِ عشق ڈھک لیا
یہ اک طریقہ خاص ہے اخفائے راز کا

ناگاہ سامنے نظر آیا جمالِ دوست
میں شکوہ سنج تھا غمِ ہستی گداز کا

مجھ سے گناہ گار پہ یہ بارشِ کرم!
مُنہ دیکھتا ہوں رحمتِ عاجز نواز کا

صُوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا
اک پرتوِ لطیف تھا حُسنِ مجاز کا

تنہائیٔ فراق میں کیوں گریہ کیجئے
اے دل! یہ وقتِ خاص ہے راز و نیاز کا

تصویرِ یار سامنے، سر میں ہوائے شوق
ایسے میں کس کو ہوش نشیب و فراز کا؟

مجھ کو وصال و ہجر سے کیا واسطہ جگر!؟
عاشق ہوں اک تبسمِ دیوانہ ساز کا



فاش اہلِ بزم پر کُل رازِ پنہاں کر دیا
آئیں وہ جب تک، ہمیں نے سب کو حیراں کر دیا

حُسن کے جلووں کو رگ رگ میں خراماں کر دیا
دل کی اک جُنبش نے کیا کارِ نمایاں کر دیا

جان و دل صدقے، تصدق دین و ایماں کر دیا
ہم نے جو کچھ تھا، نثار اے جانِ جاناں! کر دیا

ہائے، یہ کیا قہر تُو نے چشمِ گریاں کر دیا!
اور بھی کچھ آتشِ دل کو فُروزاں کر دیا

بن رہی تھیں میرے اُن کے درمیاں کیا کیا حجاب
موت نے سب مشکلوں کو آخر آساں کر دیا

حُسن نے تا شام ہنس کر جو بنایا تھا چمن
عشق نے تا صبح رو کر شبنمستاں کر دیا

زخمۂ حُسنِ تبسّم کی فُسوں کاری نہ پُوچھ
ہر نگاہِ شوق کو تارِ رگِ جاں کر دیا

لے چلا تھا سُوئے صحرا کھینچ کر جوشِ جُنوں
پاسِ ناموسِ وفا نے پا بہ زنداں کر دیا

اب اُسی دستِ جُنوں پہ آستیں ہے خندہ زن
دھجیوں کو بارہا جس نے گریباں کر دیا

عشق نے لذّت جو دی تھی، آہ، تو نے عندلیب!
اس کو بھی صرفِ نوا ہائے پریشاں کر دیا

بےخودی حد سے زیادہ بڑھ چلی جب عشق میں
بے حسی کو پردہ دارِ رازِ پنہاں کر دیا

عشق نے دردِ زلیخا بھر دیا کونین میں
حُسن نے ساری فضا کو یُوسفستاں کر دیا

شمع جب فانوس میں تھی، آنکھ تھی محوِ جمال
جب ہوئی عُریاں، نگاہوں کو پریشاں کر دیا

بُت کدے کو وہ میسّر ہے، نہ کعبے کو نصیب
اُس نے جس جلوے کو وقفِ سینہ چاکاں کر دیا



زمین و آسماں ہونا، مکاں و لامکاں ہونا
غرض دل کو کسی صورت محیطِ دو جہاں ہونا

فنائے عشق کیا ہے، کارواں در کارواں ہونا
یہاں تک منتشر ہونا کہ بے نام و نشاں ہونا

ترے جلووں میں گم ہو کر، جہاں اندر جہاں ہونا
مبارک عُمرِ رفتہ کو حیاتِ جاوداں ہونا

نظر صیّاد کی کیا، برق بھی ہو تو لرز اُٹھے
ابھی آیا نہیں تنکوں کو جانِ آشیاں ہونا

تماشہ دیدنی ہے، دیکھ لیں اہلِ نظر آ کر
مرے ہمراہ منزل کا بھی گردِ کارواں ہونا

لہو کا قطرہ قطرہ بن گیا لَو شمعِ وحدت کی
بجا ہے اب مرا پروانہ عیاں ہونا، نہاں ہونا

زہے صورت، زہے معنی، زہے جلوہ، زہے پردہ
بیک لحظہ، بیک ساعت، عیاں ہونا، نہاں ہونا

کسی کے سامنے وہ میری عرضِ شوق کا عالم (قطعہ) مرے ذرّاتِ ہستی کا مسلسل داستاں ہونا
کبھی دریائے بیتابی کا سینے میں سمٹ آنا
کبھی ہر اشک کے قطرے کا بحرِ بیکراں ہونا

سُنا ہے ہر طرف لٹتے ہیں جلوے حُسن صُورت کے
کبھی تم بھی جگر آوارۂ کوئے بُتاں ہونا



جادو قلمِ کاتبِ تقدیر میں کیا تھا　　میں اوّلِ ساعت ہی سے مائل بہ فنا تھا
میں اُس کی نظر، اور وہ مجھے دیکھ رہا تھا　　اے حیرتِ خاموش! یہ منظر ابھی کیا تھا
جب تک حدِ ہستی کا تعیّن نہ ہوا تھا　　نام اس ستم ایجاد کا کیا جانئے کیا تھا
پہنچا ہوں اسی راہ سے تا منزلِ عرفاں
کہتے ہیں جسے ہوش، وہی ہوش رُبا تھا



یہ فصلِ گل، سماں یہ شبِ ماہتاب کا　　لا ساقیا شراب، مزا ہے شراب کا
چھوڑا نہ راز کوئی، جہانِ خراب کا　　سب کہہ گیا میں خواب میں افسانہ خواب کا
بگڑا ہوا ہے رنگ جہانِ خراب کا　　بھر لوں نظر میں حُسن، کسی کے شباب کا
اپنی نظر کی برق وشی کو بھی دیکھئے　　مجھ سے ہی پوچھئے نہ مزاج اضطراب کا
نکلی تڑپ کے پردۂ خاکی سے رُوحِ پاک
ٹوٹا طلسم جلوۂ حُسنِ حجاب کا



آہ یہ عالمِ کثرت تری رعنائی کا!　　ایک مرکز نہ رہا چشمِ تماشائی کا
کیا ٹھکانا ہے اس آوارۂ سودائی کا　　حشر اک لمحہ ہے جس کی شبِ تنہائی کا
نُور کہتے ہیں جسے چشمِ تماشائی کا　　غیر فانی ہے وہ پرتو تری رعنائی کا
عشق کیا چیز ہے، اک حشر در آغوشِ خیال　　حُسن کیا؟ خواب ہے اک چشمِ تماشائی کا
منحصر جلوت و خلوت پہ نہیں وصلِ حبیب　　خاص اک وقت ہُوا کرتا ہے یک جائی کا
رہ گئیں پردۂ ظاہر میں اُلجھ کر نظریں
حسن دیکھا نہ کسی نے مری رُسوائی کا



نظر میں ہیچ ہے، گُلشن تمام دُنیا کا　　نہ پُوچھ دو صلہ مُرغانِ رشتہ برپا کا
اثر ہے جس میں کہ ہر موج کارفرما کا　　وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا
نجات رُوح کو ملتی نہیں ہے قفس سے، آہ　　بنا ہُوا ہے یہ مجنوں، حجاب لیلا کا
ہر ایک ذرّے سے نکلے تڑپ کے برقِ جمال　　ہے تو کوئی طلبگار حُسنِ معنیٰ کا
خدا ہی رحم کرے اس کی تشنہ کامی پر　　سراب پر جسے کامل یقیں ہو دریا کا

رواں اگرچہ ہیں اس میں بھی سب وہی موجیں
مگر ہے قطرے پہ فرض احترام دریا کا



وہ ہجر کے پردے میں جس وقت کہ واصل تھا
اس درجہ لطافت تھی، احساس بھی مشکل تھا
کل دیکھ کے یہ منظر، قابو میں نہ پھر دل تھا
بیتاب تھیں خود موجیں، لب تشنہ جو ساحل تھا
کیا سیر تھی، میں جب تک آوارۂ ساحل تھا!
دریا کی طرح غم تھا، کشتی کی طرح دل تھا
حیراں ہوں کہ یہ آخر کیوں بیچ میں حائل تھا
میرا ترا رشتہ تو بے واسطۂ دل تھا
کُل اتنی حقیقت تھی منصورِ اناالحق کی
ناچیز سا اک قطرہ، دریا کے مقابل تھا
کونین کا غم دل نے سب لے لیا اپنے سر
آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا
جب غور کیا دم بھر، سب نقش چمک اُٹھے
جب آنکھ ذرا کھولی، آئینہ مقابل تھا
دل کے لئے اُلفت کی قیدیں ہی مناسب تھیں
دیوانہ، یہ ایسی ہی زنجیر کے قابل تھا
خود اپنی تجلی میں جب عشق تھا مستغرق
ہر ثابت و سیارہ مدہوش تھا، غافل تھا
کیا دن تھے جگر وہ دن، جب صحبتِ اصغر میں!
مسرور طبیعت تھی، مخرور مرا دل تھا



سینے سے دل اُچھلتے ہی رفعت نشاں ہوا
یہ ذرہ جب بلند ہوا، آسماں ہوا
دل مبتلائے نالہ و آہ وفغاں ہوا
اے شانِ عشق! حُسن ترا رائیگاں ہوا
صیاد! دونوں گھر ہیں بس اک گل کے نام کے
تیرا قفس ہوا کہ مرا آشیاں ہوا
غفلت کے ساتھ ساتھ ہے یہ قیدِ جسم بھی
پھر میں کہاں، اگر مجھے عرفانِ جاں ہوا؟
صحرائے جستجو سے نہ آگے بڑھے قدم
گم اس کی وسعتوں میں ہر اک کارواں ہوا
صیاد سے چھپا نہ سکی کوئی شاخِ نخل
پہنچی وہیں نگاہ، جہاں آشیاں ہوا
چھوٹا نہ رشتۂ طلب دوست ہاتھ سے
میں خاک ہو کے گردِ پسِ کارواں ہوا
تبدیلیٔ مقام سے بدلی فضائے عشق
جو دَرد تھا ابھی، وہی آرامِ جاں ہوا
عالم مرا تمام ثنا خواں ہوا، جگر
میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا



یہ مزا تھا خُلد میں بھی نہ مجھے قرار ہوتا
جو وہاں بھی آنکھ کھلتی، یہی انتظار ہوتا

میں جنونِ عشق میں یوں ہمہ تن فگار ہوتا
کہ مرے لہو سے پیدا اثرِ بہار ہوتا

میرے رشکِ بے نہایت کو نہ پوچھ مرے دل سے
تجھے تجھ سے بھی چھپاتا، تو وہ بے قرار ہوتا

میری بیقراریاں ہی تو ہیں اس کی وجہِ تسکین
جو مجھے قرار ہوتا، تو وہ بے قرار ہوتا

جسے چشمِ شوق میری کسی طرح دیکھ پاتی
کبھی حشر تک وہ جلوہ نہ پھر آشکار ہوتا

یہ دل اور یہ بیانِ غمِ عشق بے محابا
اگر آپ طرح دیتے، مجھے ناگوار ہوتا

کبھی یہ ملال، اُس کا نہ دُکھے کسی طرح دل
کبھی یہ خیال، وہ بھی یونہی بیقرار ہوتا

مرا حال ہی جگر کیا وہ مریضِ عشق ہوں میں
کہ وہ زہر بھی جو دیتا مجھے ساز گار ہوتا



عشق جب مصروفِ اصلاحاتِ رُوح وتن میں تھا
دفترِ عالم، مرے اک گوشۂ دامن میں تھا

آشنا قیدِ مکاں سے کب رہی برقِ جمال؟
ذرّے ذرّے میں ہے وہ جو وادیٔ ایمن میں تھا

ہم نے تکمیلِ جنوں بھی جلوہ زارِ غم میں کی
دُور کیوں جاتے، کہ صحرا بھی اسی گلشن میں تھا

مجھ کو سب معلوم ہے افسانۂ برق و کلیم
میرے دل کا ذرّہ ذرّہ وادیٔ ایمن میں تھا

رخصت اے بیگانگی، بس کھل گیا تیرا فریب!
اپنا میں دشمن رہا جب تک غمِ دشمن میں تھا

ورنہ ممکن ہی نہ تھا، نظارۂ برقِ جمال
ذوقِ موسیٰ بھی حدودِ وادیٔ ایمن میں تھا

تھا جنونِ عشق خود ہی کار فرما، اے جگر!
تُو عبث دیوانہ، فکرِ وسعتِ دامن میں تھا



دہر کی نیرنگیوں کا خوب عرفاں ہو گیا
لا شراب کُہنہ ساقی! دل پریشاں ہو گیا

محوِ رنگارنگیِ صحرائے امکاں ہو گیا
اپنے جلووں میں مقیّد آپ انساں ہو گیا

برق چمکی تھی کہ برپا جوشِ طوفاں ہو گیا
المدد، اے شوق! نظارہ پریشاں ہو گیا

ہر تڑپ کے ساتھ اک جلوہ نمایاں ہو گیا
آج ثابت یار کا، قربِ رگِ جاں ہو گیا

ذوقِ سجدہ ہر بُنِ مُو سے نمایاں ہو گیا
میں بھی کیا شے ہوں کہ اپنا آپ عنواں ہو گیا

رُوح قالب سے نکل کر اصل میں گم ہو گئی
نے سے ہوتے ہی جُدا نغمہ پریشاں ہو گیا

انتہائے جستجو میں دیکھئے ہوتا ہے کیا؟
ابتدا یہ ہے کہ ہر ذرّہ بیاباں ہو گیا

رُوح جب تڑپی، نگاہِ شوقِ عاشق بن گئی
دل جب اُچھلا، جلوہ گاہِ حُسنِ جاناں ہو گیا

ایک مرکز پر سمٹ آیا جہانِ آرزو
کثرتِ موہوم سے جب دل پریشاں ہوگیا

کس کو دیکھا پردۂ خاکی میں اپنے جلوہ گر
ڈالتے ہی اک نظر، مغرور انساں ہو گیا

کم نہ تھا یہ عالمِ ہستی کسی صُورت، مگر
وسعتیں دل کی بڑھیں اتنی کہ زنداں ہوگیا

دل کے پرتو بن گئے سب نقش ہائے رنگ رنگ
ایک ذرّہ موجدِ کُل برہمِ امکاں ہو گیا

غم نے جُنبش قلب کو دی، جاگ اُٹھی روحِ شوق
ساز چھیڑا درد نے، مُطربِ غزل خواں ہوگیا

چشمِ پُرنم، زُلف آشفتہ، نگاہیں بیقرار
اس پشیمانی کے صدقے، میں پشیماں ہوگیا

زعم تھا ذوقِ نگاہ و جذب دل پر ناگہاں
محو اک جلوے میں سب وجدان و عرفاں ہوگیا

چھُوٹ سکتا تھا کہیں اس جسم سے دامانِ رُوح
پھر کبھی ملنے کا شاید عہد و پیماں ہو گیا

دل گلستاں تھا تو ہر شئے سے ٹپکتی تھی بہار
یہ بیاباں جب ہُوا، عالم بیاباں ہو گیا

ورنہ کیا تھا، صرف ترتیبِ عناصر کے سوا
خاص کچھ بیتابیوں کا نام انساں ہو گیا

یوں بسر کی زندگی میں نے اسیری میں، جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہو گیا



تری نگاہِ ناز بایں شانِ اضطراب
ہم جانِ دردِ عشق وہم ایمانِ اضطراب

اب تک تو تیرے فیض سے اے عشقِ معتبر
داغِ سکوں سے پاک ہے، دامانِ اضطراب

خُوگر نہیں ہے تُو تو بتا، اے نگاہِ شوق!
پھر کون ہے یہ سلسلہ جنبانِ اضطراب؟

ہر چند نجدِ عشق اُٹھے ہزار قیس!
نکلا مگر نہ ایک بھی شایانِ اضطراب

پھر ہے وہیں، چلا تھا جہاں سے دلِ غریب
آغاز ہی یہ لے گیا پایانِ اضطراب

بے وجہ یہ سکونِ محبت نہیں، جگر
اُٹھنے کو ہے مگر کوئی طوفانِ اضطراب



ہو چکا تکملۂ صورت و معنائے بہار
تُو بھی اب سامنے آ، او چمن آرائے بہار!

میری نظروں میں ہے وہ منظرِ زیبائے بہار
سب بہاریں ہیں جہاں گردِ کفِ پائے بہار

تیرا گلشن ہی نہ بن جائے قفس، اے بلبل!
دیکھ محدود نہ کر وسعتِ دُنیائے بہار

عکسِ افسردگیٔ شوق، سراپائے خزاں!
پرتوِ حُسنِ نظر، صورت زیبائے بہار

باہر آنا ہی نہ تھا پردۂ بے رنگی سے
خود خزاں ساز بنی برقِ تجلائے بہار

تیرے دیوانے ہیں آزادِ تعیّن، ورنہ
یہ خزاں کو بھی جو دیکھیں تو نظر آئے بہار



وحدت خاص عشق میں ذکر ہی غیریت کا کیا
اپنے ہی جلوے دیکھئے اپنی ہی بزمِ ناز میں

یوں ہیں مری نگاہ میں نقش و نگارِ کائنات
عالم خواب جس طرح دیدۂ نیم باز میں

حُسنِ کمالِ عشق کا کوئی کمال رہ نہ جائے
ناز کا اِک سبق بھی لے درس گہِ نیاز میں

مشرقِ غم سے کر طلوع ایک وہ آفتاب حُسن
ڈوب سکے نہ جو کبھی مغربِ امتیاز میں

دونوں جہاں میں دو قدم اوّل و آخر ہوس
ان کو اُٹھا تو ہے ابھی خاص حریمِ ناز میں

غیر جو تلخ کام ہے، اُس کے نصیب کی کمی
مجھ کو تو اک مزا ملا، ہر غمِ جاں گداز میں

توڑ کے سب قیود چل، اے دلِ مدّعا طلب!
بالبِ خشک و آہِ سرد، اس کی حریمِ ناز میں

جلد سکون و عیش سے ہاتھ اُٹھا کہ، بے خبر!
تیری بقا کا راز ہے شورشِ جاں گداز میں

دل مرا توڑ کر کہا، اس نے زبانِ راز میں
ساز میں نغمے وہ کہاں، جو ہیں شکستِ ساز میں

ہو کے فنائے ذاتِ حق دل مرا سوز و ساز میں
مرکزِ اصل بن گیا، دائرۂ مجاز میں

دونوں جہاں تھے غرق محو جس کی نگاہِ ناز میں
ایسا بھی ایک بُت ملا بُت کدۂ مجاز میں

خاک بھی اس غریب کی آہ! کہ پھر نہ اُٹھ سکی!
تم نے جسے مٹا دیا پردۂ امتیاز میں

درد کا دل بڑھائے کون، پردۂ در اُٹھائے کون؟
موت کو نیند آ گئی غم کی حریمِ ناز میں

پھیلے پڑے ہیں جس قدر حُسن کے جلوۂ لطیف
جی میں ہے سب سمیٹ لُوں دامنِ امتیاز میں

اصل سے ہو کے بے خبر، ڈھونڈ نہ اے دلِ حزیں!
عیشِ دوامِ عافیت، غم کدۂ مجاز میں

یہ جو تمامِ نغمہ ہے، دعوتِ عامِ نغمہ ہے
موجِ خرامِ نغمہ ہے، نغمہ نہیں ہے ساز میں

میرے نیازِ عشق کا ہو ہی رہے گا فیصلہ
آپ کمی نہ کیجئے اپنے جنونِ ناز میں

کام نہ آئی عقل کی عقدہ کشائیاں، جگر!
اور اضافہ ہو گیا سلسلہ ہائے راز میں



فُدرت پسند کتنے عُشاقِ خوش نظر ہیں
سینے تمام ویراں، آنکھیں تمام تر ہیں

رنگینیٔ الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر
اے دل! وہی تو جلوے سرمایۂ نظر ہیں

آساں نہیں گذرنا صحرائے بے خودی سے
ہُشیار، اہلِ تمکیں! رستے یہ پُرخطر ہیں

اپنا نشاں بتائیں کیا رہروانِ غربت؟
بربادِ جستجو ہیں، پامالِ رہ گذر ہیں

درماندگی کے نالے، بیچارگی کی آہیں! وہ شام کی ہیں رونق، یہ زینتِ سحر ہیں
کیوں آسماں سے مل کر اپنا وقار کھوئیں کیا کم ہے یہ کہ تیری ہم خاکِ رہ گور ہیں

بزمِ مشاعرہ ہے یا گلشنِ تخیل!
بُلبُل چہک رہا ہے، یا حضرت جگر ہیں!



سمجھائے کون، بلبلِ غفلت شعار کو؟ محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو
عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے، آہ! کیا منہ دکھاؤں رحمتِ پروردگار کو؟
اے دل، جو راہِ عشق میں رکھا ہے تُو نے پاؤں کرنا نہ تنگ دائرۂ اختیار کو
پھر دیکھنا بہار بیابانِ عشق کی! گلشن بنا چکوں گا جب اس خار زار کو

بھڑکا رہا ہوں آتشِ عصیاں ہر ایک سمت
پھیلا رہا ہوں رحمتِ پروردگار کو



بے خودی کا نہ ہُوا شک کسی بیگانے کو فطرتِ عشق سنبھالے رہی دیوانے کو
جب سے معلوم کیا دل کے نہاں خانے کو آنکھ اُٹھانے کو بھی فرصت نہیں دیوانے کو
عشق معصوم صفت، حُسن ثقاہت دشمن مختصر کون کرے شوق کے افسانے کو
پی کے اک جام وہ جلوے نظر آئے مجھ کو دیکھتا ہوں کبھی مے کو، کبھی مے خانے کو
بجلیاں طورِ تصوّر پہ گرانے والے! پھُونک دے، پھُونک دے ہستی کے سیہ خانے کو
مے کشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں آج اک موج بہا لے گئی مے خانے کو
غیر از دوست نہ تھا ہستیِ عاشق کا وجُود کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

قیس و فرہاد ہوں یا سرمد و منصور، جگر
ہم نے بے مایہ نہ دیکھا کسی دیوانے کو



نگراں کوئی بجز دیدۂ مسحُور نہ ہو جلوہ اس طرح دیکھا، برق نہ ہو، طور نہ ہو
خود ضیا بار جو اک جلوۂ مستُور نہ ہو آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نُور نہ ہو
رازِ غم فاش نہ ہو، عشق جو مجبور نہ ہو دیکھنا، کوئی پس پردۂ منصور نہ ہو
آج ہر زخم نظر آتا ہے پیمانہ بدست اس میں کچھ شعبدۂ نرگسِ مخمور نہ ہو
کھول کر آنکھ ذرا دیکھ تو لے اے غافل! تیری ہستی ہی حجابِ رُخِ پُر نُور نہ ہو

خاک ہے سوزِ غم عشق کی تاثیر کلیم! | دل کا ہر ذرّہ اگر برقِ سرِ طور نہ ہو
جتنے وہ پاس ہیں، اتنا بھی نہ ہو پاس کوئی! | جتنے وہ دُور ہیں، اتنا بھی کوئی دُور نہ ہو
عین ایماں ہے اناالحق کا ترانہ، لیکن | ہے یہی کُفر، اگر دیدۂ منصور نہ ہو
اس تقیّد پہ تو عالم ہے یہ آزادی کا | کیا قیامت کرے انسان، جو مجبور نہ ہو!
ایک اک سانس ہے اس کے لئے پیغامِ حیات | آدمی اپنی حقیقت سے اگر دُور نہ ہو

کوچۂ عشق سے باہر نکل جائے، جگرؔ!
جیتے جی خاک میں ملنا جسے منظور نہ ہو



ابھی کچھ روز ہی گزرے نہ تھے تخلیقِ انساں کو | اُبھارا خود کسی کی مصلحت نے ذوقِ عصیاں کو
مَلک اور سجدہ کرتا، ایک مُشتِ خاکِ انساں کو! | کمالاتِ نبوّت نے کیا کافر مُسلماں کو
کسی صورت نہ ہونے دُوں عیاں اسرارِ جاناں کو | جو چاکِ سینہ فرصت دے، تو میں سی لوں گریباں کو
خدا رکھے سلامت اس دلِ برباد و ویراں کو! | بیاباں میں لئے بیٹھا ہے اک جانِ گلستاں کو
خزاں آتے ہی ٹوٹیں جلوۂ ظاہر کی سب قیدیں | شکستِ رنگ نے پرواز بخشی طائرِ جاں کو
عزادارِ تمنّا ہوں، نہ پوچھو میری بربادی | گراں بارِ مصیبت ہوں، نہ دیکھو میرے ساماں کو
یہیں سے روز کر لیتے ہیں سیرِ دو جہاں وحشی | خدا رکھے سلامت، سایۂ دیوارِ زنداں کو!
نہ پوچھی بات بھی اس شوخ کی کافر نگاہوں نے | لئے بیٹھا رہا زاہد، متاعِ دین و ایماں کو
ابھی اے جوشِ وحشت! کون یہ کہتا ہوا گزرا؟ | ترے دامن کے ٹکڑے یاد کرتے ہیں گریباں کو
عطا کردہ مذاقِ عشق، اے بیگانۂ عالم! | کہ تیری آنکھ سے دیکھوں ترے حُسنِ نمایاں کو
کمالِ لذّتِ ذوقِ اسیری، تو کہاں ممکن | بقدرِ ظرف حصّہ مل گیا ہر اہلِ زنداں کو
نہ تھا کوئی حجاب اک لغزشِ مستانہ کے آگے | مآل اندیشیوں ہی نے کیا گمراہ انساں کو
مزاجِ حُسن و تکلیفِ تجلّی، اے معاذ اللہ! | بس اب رُسوا نہ کرائے بیخودی! شوقِ پشیماں کو
نہیں آپے میں کوئی، کس کو ہو احساسِ نظارہ | تحیّر ہے نگاہوں کو، تو اجد ہے رگِ جاں کو
نکاتِ عشق حل کرتی ہے ہر جنبش نگاہوں کی | زبانِ آگہی سمجھو، سکوتِ اہلِ عرفاں کو
دکھا کر اک جھلک سامانِ راحت جس نے لُوٹا تھا | نگاہیں ڈھونڈتی ہیں پھر اسی غارتگرِ جاں کو

تغافل بھی کسی کا وجہِ تسکین، اے جگرؔ! کیا ہو
سمجھتا ہے یہ دل کم بخت پرسشہائے پنہاں کو



قدرت کی آن والے، رحمت کی شان والے
تجھ پر جہاں تصدّق، او پاک جان والے
دونوں جہاں کی نعمت ہے مٹھیوں میں تیری
بوسیدہ کپڑوں والے، ٹوٹے مکان والے
ایسے تھے آپ اُمّی، کھولی زبان جس دم
دم بھر میں بے زباں تھے، ساری زباں والے
روضہ پہ اے صبا تُو جا کر یہ عرض کر دے
مجبور کب تک آخر ہندوستان والے
اک جنبشِ نگہ کے سب منتظر کھڑے ہیں
پُر درد قلب والے، پُر سوز جان والے



ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اُٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی
چلی کچھ ایسی مخالف ہوا زمانے کی
پناہ برق نے لی میرے آشیانے کی
یہ شرح ہے دلِ عُشاق کے فسانے کی
کہ گردشیں اسی محور پہ ہیں زمانے کی
اب آگے، دیکھیں، کرے کیا ہوا زمانے کی
قفس میں طرح تو ڈالی ہے آشیانے کی
جنہیں سمجھتے ہو نیرنگیاں زمانے کی
جدا جدا ہیں یہ شرحیں مرے فسانے کی
قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی
یہ بزمِ دل، خس و خاشاک پر نہیں موقوف
اُجڑ کے بھی وہی رونق ہے آشیانے کی
خزاں، فسردگئ شوقِ نا تمام مری
بہارِ ہستئ ناقص مرے فسانے کی
تعینات کے ہیں وصل و ہجر دو پہلو
حیات و موت ہیں دو کروٹیں زمانے کی
زبانِ غیر کجا؟ انکشافِ راز کجا؟
کھلی نہ مجھ پہ حقیقت مرے فسانے کی



ہر پردۂ ہستی میں جب تُو متشکل ہے
حیران ہوں میں جلوہ پھر کون سا باطل ہے
صحرا ہے نہ بستی ہے، دریا ہے نہ ساحل ہے
جو کچھ نظر آتا ہے، اک شعبدۂ دل ہے
کیا چیز ہے کل عالم، کیا چیز مرا دل ہے؟
حیرت کا اک آئینہ حیرت کے مقابل ہے
حیراں ہوں کہ یہ آخر کیوں بیچ میں حائل ہے
میرا ترا رشتہ تو بے واسطۂ دل ہے
خود شورشِ ہستی ہے تمہیدِ فنا، یعنی
ہنگامۂ محفل ہی برہم زنِ محفل ہے
جس میں کہ ترے جلوے خود تیرتے پھرتے ہیں
اس خون کا ہر قطرہ، کونین کا حاصل ہے
وسعت نے نگاہوں کی تاریک کیا منظر
ایک ایک قدم ورنہ، خود عشق میں منزل ہے



جدھر کو جھوم کے مست شراب دیکھیں گے — تمام زہد ریائی خراب دیکھیں گے
بغور عالمِ ہستی پہ جب کریں گے نگاہ — ہر ایک موج کو موجِ سراب دیکھیں گے
بھرے ہیں جن کی ہر اک رگ میں سرمدی نغمے — وہ خاکِ محفلِ چنگ و رباب دیکھیں گے؟
ادب معاملہ داں، شوق مصلحت دشمن — خبر نہیں کہ کسے کامیاب دیکھیں گے

جگر کی بادہ کشی ان دنوں، معاذ اللہ!
جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے



چشمِ نظر پرست میں جس کا جہان نام ہے — حُسنِ تمام یار کا جلوۂ نا تمام ہے
کس کے فروغِ حُسن کا آج یہ فیضِ عام ہے — شام نثارِ صبح ہے، صبح نثارِ شام ہے
خلوتیانِ راز کا خاص یہ اک پیام ہے — کیفِ وصالِ دوست بھی منزلِ نا تمام ہے
حُسن کی بارگاہ میں رکھئے سنبھال کر قدم — یہ وہ مقام ہے جہاں خواہشِ دل حرام ہے
گرمیٔ سوزِ عشق سے، دل کو جلا تو، بوالہوس! — صبح کو بھی نہ بجھ سکے یہ وہ چراغِ شام ہے
شوق کی انتہا کہو، یا کہ فریبِ عاشقی — شورِ انا الحبیب کا خاصۂ مقام ہے
ایک بلا کی بے خودی، ایک غضب کی بے حسی — دورِ حیات کہتے ہیں جس کو وہ دورِ جام ہے
بندگیٔ جنوں ادا بے خودیٔ ادب سرشت — حُسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے
اک ادائے پُرسکوت، لاکھ نوائے پُرخروش — وہ روشِ خاص تھی، یہ روشِ عام ہے
شیفتۂ صفات کو کوئی سکون ہو تو ہو — عاشقِ ذات کو کہاں ایک جگہ قیام ہے

اب تو خدا کے واسطے زیست کا دو جگر ثبوت
خوابِ گراں وہی ہے اور وقتِ قریبِ شام ہے



سوز میں بھی وہی اک نغمہ ہے جو ساز میں ہے — فرق نزدیک کی اور دُور کی آواز میں ہے
یہ سبب ہے کہ تڑپ سینۂ ہر ساز میں ہے — مری آواز بھی شامل تری آواز میں ہے
جو نہ صورت میں، نہ معنی میں، نہ آواز میں ہے — دل کی ہستی بھی اُسی سلسلۂ راز میں ہے
ہمہ تن محو دل اک نغمۂ بے ساز میں ہے — اب نہ مطرب میں کوئی فرق، نہ آواز میں ہے
عاشقوں کے دلِ مجروح سے کوئی پُوچھے — وہ جو اک لطف نگاہِ غلط انداز میں ہے
گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے، اللہ اللہ! — سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے
حُسنِ انجام پر کس طرح تصدّق کر دُوں — وہ جو اک لطف ہر اک لغزشِ آغاز میں ہے؟

حرم و دیر نظر آتے ہیں سب سر بہ سجود
جلوہ گر کون مرے شوقِ جبیں ساز میں ہے؟



کیونکر نہ روشن تجھ سے ہوں کون و مکانِ عاشقی
تو شمعِ بزمِ آرزو، تو نورِ جانِ عاشقی
اللہ رے سوزِ دلِ خونِ کشتگانِ عاشقی
پنہاں ہے اب تک خاک میں برقِ تپانِ عاشقی
لے کر ازل ہی سے چلے، شوریدگانِ عاشقی
نشتر بجانِ آرزو، آتش بجانِ عاشقی
کیا قصۂ جورِ فلک، کیا داستانِ عاشقی؟
سب جانتی ہے وہ نظر دردِ نہانِ عاشقی
ناکام ہی اب تک رہے، بدنام ہی اب تک رہے
ہم بیکسانِ بیکسی، ہم عاشقانِ عاشقی
گو لب پر آہِ سرد ہے، چہرہ بھی غم سے زرد ہے
پھر بھی یہی اک درد ہے، آرامِ جانِ عاشقی
اُٹھنے کو ہے اُن کی نظر ہونے کو ہے وہ آنکھ تر
ہاں تیز کر دے، بے خبر، سازِ نہانِ عاشقی
برہم اُدھر بزمِ جہاں، تاراج باغ و آشیاں
طاری وہی اب تک یہاں خوابِ گرانِ عاشقی
اُن کی نگاہِ لطف ہے اور کشفِ رازِ دلبری!
میری نگاہِ شوق ہے اور داستانِ عاشقی
آؤ جہاں برہم کریں، پیدا نیا عالم کریں
تم جانِ جانِ حُسن ہو، ہم جانِ جانِ عاشقی
یہ مصرع حسرت جگرؔ نشتر سے بھی ہے تیز تر
سیرابِ غم کر دے کہیں پیرِ مغانِ عاشقی



وہ بزمِ تماشہ بھی کیا بزمِ تماشا ہے!
جو جلوہ ہے پردہ ہے، جو پردہ ہے جلوا ہے
یہ حُسنِ طلب ہی کا اک جلوۂ رعنا ہے
کس نے اُسے دیکھا ہے، کس نے اُسے پایا ہے
دُنیا یہ اُسی کی ہے، عالم یہ اُسی کا ہے
جو آپ ہی مجنوں ہے، جو آپ ہی لیلا ہے
آغازِ محبت کا انجام بس اتنا ہے
جب دل میں تمنا تھی، اب دل ہی تمنا ہے
بے کار ہے، اے مجنوں! یہ پیکرِ آب و گل
اس چیز کا طالب بن جو اصل میں لیلا ہے
کیا حُسن کا افسانہ محدود ہے لفظوں میں؟
آنکھیں ہی کہیں اس کو، آنکھوں نے جو دیکھا ہے
کہنے کے لئے کہہ لیں سب کچھ اسے اہلِ دل
خود ورنہ محبت بھی اک طرح کا پردا ہے
اِس دَور میں مجنوں ہی کوئی نہ رہا، ورنہ
اب تک وہی محمل ہے، اب تک وہی لیلا ہے
بھر دو انہیں جلوؤں سے، یا آگ لگا دو تم!
آنکھیں بھی تمہاری ہیں، سینہ بھی تمہارا ہے



تاثیرِ محبت کی اللہ رے مجبوری! ہر بُعد میں اِک قُربت، ہر قُرب میں اک دُوری
یوں محوِ فنا ہو جا، اے دل رہِ اُلفت میں ہر سانس سے پیدا ہو اک نغمۂ منصوری
کُل ہستیِ عالم پر طاری ہیں صفات اُس کے سب کہنے کی باتیں ہیں، مختاری و مجبوری
خود اپنے لئے بُلبل، تجویزِ قفس کر لے اُس پر بھی جو کھل جائے صیاد کی مجبوری
تُو نے ہی جگر اس کو مٹی میں ملایا ہے
ورنہ یہ ترا دل تھا اک آئینۂ نُوری



آدمی نشۂ غفلت میں بُھلا دیتا ہے ورنہ جو سانس ہے، تعلیمِ فنا دیتا ہے
"تجھ سے میں دُور کسی وقت نہیں ہوں غافل!" دل میں بیٹھا ہُوا کوئی یہ صدا دیتا ہے
بادۂ ناب عجب چیز ہے، ساقی، لیکن اور ہی کچھ ترے ہاتھوں سے مزا دیتا ہے
پھر شرابی تری آنکھوں کے نہ چونکے تا حشر کوئی اس طرح مئے ہوش رُبا دیتا ہے
جھلملاتے ہوئے تاروں کا یہ، اللہ رے، فیض! سامنے سے کوئی پردہ سا ہٹا دیتا ہے
تجھ سے وحشی ترے، غافل نہیں رہنے پاتے روز آ کر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے
ہائے کیا چیز گلِ داغِ محبت ہے، جگر
خشک ہونے پہ بھی جو بُوئے وفا دیتا ہے!



رند وہ ہُوں کہ غزل بھی مری رندانہ ہے معنی و لفظ نہیں، بادہ و پیمانہ ہے
اپنی ہستی کے جو انوار سے بیگانہ ہے وہ فقط چند حجابات کا دیوانہ ہے
ہجرِ جاناں میں غضب شورشِ مستانہ ہے رُوح قالب میں نہیں، قید میں دیوانہ ہے
سلسلہ روزِ ازل سے ہے برابر جاری نہیں معلوم کہاں تک مرا افسانہ ہے
حیرتِ عشق بھی کیا چیز ہے، اللہ اللہ! نہ یگانہ ہے یہاں کوئی، نہ بیگانہ ہے
چھیڑ اے مُطربِ غم! تازہ غزل کوئی، مگر یہ نہ معلوم ہو مجھ کو، مرا افسانہ ہے
کل جہان گرم تھا ہنگامۂ تاثیر و نظر آج دیکھا تو بس اک دشت ہے ویرانہ ہے
بُت پرستوں پہ عبث طعن ہیں، اے شیخِ حرم! اپنے بُت دیکھ کہ تُو آپ ہی بُت خانہ ہے
رَوشِ دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک مرا افسانہ ہے
واہ کیا مست غزل تو نے پڑھی آج جگر
ایک اک لفظ چھلکتا ہُوا پیمانہ ہے



دلِ حزیں کی تمنا دلِ حزیں میں رہی
یہ جس زمیں کی تھی دُنیا اسی زمیں میں رہی

حجاب بن نہ گئی ہوں حقیقتیں باہم
کہ بے سبب تو کشاکش نہ کفر ودیں میں رہی

سرِ نیاز نہ جب تک کسی کے در پہ جھکا!
برابر ایک خلش سی مری جبیں میں رہی

ہوس نے پھ. دیئے اس درجہ خواہشات کے بُت
ذرا سی جگہ بھی نہ کعبۂ یقیں میں رہی

بقیدِ ظرف مئے بندگی کا جوش رہا
کسی جبیں سے نہ ٹپکی، کسی جبیں میں رہی

عدم میں بھی مری ہستی کی تھی یہ شانِ وجود!
کہ راز بن کے دلِ صورت آفریں میں رہی

نگاہِ حضرتِ اصغر کی ہر ودیعتِ خاص
قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی



موت پر حیرانی و حیرت ہی کیا؟
زندگی خود اک طلسمِ راز ہے

رُوح ہے اک نغمۂ سازِ الست
جسم خاکی پردۂ آواز ہے

اُن کو اپنی شانِ رحمت پر غرور
مجھ کو اپنی بے بسی پہ ناز ہے

لفظ و معنی جس کو چھو سکتے نہیں
وہ مرا افسانۂ آغاز ہے

لب تک، اے صیاد، آ سکتی نہیں
دل میں جتنی حسرتِ پرواز ہے

یوں نہ دیکھے کوئی تو کچھ بھی نہیں
ورنہ ہر ذرّہ طلسمِ راز ہے

ہوشیار، اے طائرِ جاں، ہوشیار!
اس گلستاں کی ہوا ناساز ہے

سرِّ ہستی دو عالم کچھ نہ پوچھ
ابتدا سے انتہا تک راز ہے

اضطرابِ دل بھی کیا شے ہے کہ اب
بے پروبالی پر پرواز ہے

زندگی کیا ہے، نمودِ عاشقی
عشق کیا ہے، حُسن کا آغاز ہے

زندگی جس سے عبارت ہے، جگر
وہ کسی کی اِک نگاہِ ناز ہے



مسرور ہوں کیفیتِ دردِ جگری سے
کُچھ کام اثر سے ہے نہ اب بے اثری سے

کہتے ہیں جسے اہلِ نظر ہوش کی دُنیا
کچھ کچھ ہے خبردار مری بے خبری سے

وہ بن گئے سب سینۂ گردوں کے ستارے
بھڑکے تھے جو شعلے مرے داغِ جگری سے

پھولوں کا نہ وہ رنگ، نہ بلبل کے وہ انداز
عالم ہے مبدّل مری حرماں نظری سے

ہر چیز پہ پڑتی ہیں تحیّر کی نگاہیں
چُھوٹا ہوں جو اب سلسلہ بے خبری سے

جب آہ مری بابِ اثر دیکھ چکی سب
تب جا کے ہوا ربط کہیں بے اثری سے
سمجھا گیا اک جلوۂ بیتاب کسی کا
جو راز کہ محجوب تھا فہم بشری سے
دل خون ہوا جاتا ہے، لب پر ہے تبسم
ہم جان فدا کرتے ہیں کس بے جگری سے
لِلّٰہ جگر! اب تو ذرا ہوش میں آجا!
تنگ آ گئے احباب تری بے خبری سے

☆——☆——☆

سُنا ہے حشر میں اک حُسنِ عالمگیر دیکھیں گے
خدا جانے تجھے، یا اپنی ہی تصویر دیکھیں گے
دل برباد ہی میں حُسن کی تنویر دیکھیں گے
اسی برگِ خزاں دیدہ پر اک تصویر دیکھیں گے
جدا ہرگز نہ حسن و عشق کی تصویر دیکھیں گے
وہ جب دیکھیں گے، مری خاک دامن گیر دیکھیں گے
اگر فُرصت ملی عرفانِ تاثیرِ محبت سے
تجھے بھی ایک دن، اے آہ! بے تاثیر دیکھیں گے
رہائی ہو نہیں سکتی، کبھی قیدِ تعلق سے
جو اک زنجیر ٹوٹی، دوسری زنجیر دیکھیں گے
بغور اس ہستیِ خاکی پہ بھی ہم اک نظر کر لیں
قیامت تک نہ پھر ایسی کوئی تصویر دیکھیں گے
اب اس صورت سے کیا آئیں ترے آئینہ خانہ میں؟
تری تصویر ہی بن کر تری تصویر دیکھیں گے

☆——☆——☆

کس قدر جامع ہے میرا عالمِ تصویر بھی
حُسن کی تشریح بھی ہے، عشق کی تفسیر بھی
رُوح کی رنگینیوں سے جسم بھی ہے فیض یاب
کم نہیں تصویر سے آئینۂ تصویر بھی
تُو نے نالے عشق میں جتنے کیے، اے بے خبر!
ہو گئی اتنی ہی ضائع عشق کی تاثیر بھی
اس کی عالی ہمتی کا کیا ٹھکانہ، اے جگر!
تنگ ہو جس کے لئے فریاد بھی تاثیر بھی؟

☆——☆——☆

یہ دورِ مستعار خزاں و بہار کے
دو سلسلے ہیں اک نگۂ فتنہ کار کے
وار فتگانِ عشق، ہوں ہم رنگ کس طرح!
عالم جُدا جُدا ہیں نگہ ہائے یار کے
ہونے دیا تعلقِ اصلی نہ منقطع!
مجبوریاں بھی ساتھ چلیں اختیار کے
دیوانۂ جنوں کی وہ ہے ایک سیر گاہ
تھمتے نہیں ہیں پاؤں جہاں ہوشیار کے
آ کر قفس میں اب نہ کھلا ہے معاملہ
ہم اہل تھے خزاں کے نہ رنگِ بہار کے
رگ رگ میں آج دوڑ گئی موجِ سرخوشی
قُربان تیری لغزشِ مستانہ[1] وار کے

---

[1] میری نزدیک صحیح ہے (جگر)

رواں اگرچہ ہیں اس میں بھی سب وہی موجیں
مگر ہے قطرے پہ فرضِ احترام دریا کا



وہ ہجر کے پردے میں جس وقت کہ واصل تھا
اس درجہ لطافت تھی، احساس بھی مشکل تھا
کل دیکھ کے یہ منظر، قابو میں نہ پھر دل تھا
بیتاب تھیں خود موجیں، لب تشنہ جو ساحل تھا
کیا سیر تھی، میں جب تک آوارۂ ساحل تھا!
دریا کی طرح غم تھا، کشتی کی طرح دل تھا
حیراں ہوں کہ یہ آخر کیوں بیچ میں حائل تھا
میرا ترا رشتہ تو بے واسطۂ دل تھا
کُل اپنی حقیقت تھی منصورِ اناالحق کی
ناچیز سا اک قطرہ، دریا کے مقابل تھا
کونین کا غم دل نے سب لے لیا اپنے سر
آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا
جب غور کیا دم بھر، سب نقش چمک اُٹھے
جب آنکھ ذرا کھولی، آئینہ مقابل تھا
دل کے لئے اُلفت کی قیدیں ہی مناسب تھیں
دیوانہ، یہ ایسی ہی زنجیر کے قابل تھا
خود اپنی تجلّی میں جب عشق تھا مستغرق
ہر ثابت و سیارہ مدہوش تھا، غافل تھا
کیا دن تھے جگر وہ دن، جب صحبتِ اصغر میں!
مسرور طبیعت تھی، مخرور مرا دل تھا



سینے سے دل اُچھلتے ہی رفعت نشاں ہوا
یہ ذرّہ جب بلند ہوا، آسماں ہوا
دل مبتلائے نالہ و آہ وفغاں ہوا
اے شانِ عشق! حُسن ترا رائیگاں ہوا
صیّاد! دونوں گھر ہیں بس اک گل کے نام کے
تیرا قفس ہوا کہ مرا آشیاں ہوا
غفلت کے ساتھ ساتھ ہے یہ قیدِ جسم بھی
پھر میں کہاں، اگر مجھے عرفانِ جاں ہوا؟
صحرائے جستجو سے نہ آگے بڑھے قدم
گم اس کی وسعتوں میں ہر اک کارواں ہوا
صیّاد سے چھپا نہ سکی کوئی شاخِ نخل
پہنچی وہیں نگاہ، جہاں آشیاں ہوا
چھوٹا نہ رشتۂ طلب دوست ہاتھ سے
میں خاک ہو کے گردِ پسِ کارواں ہوا
تبدیلئ مقام سے بدلی فضائے عشق
جو دردتھا ابھی، وہی آرامِ جاں ہوا
عالم مرا تمام ثنا خواں ہوا، جگر
میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا



جگر پارے

مٹایا جس قدر ہستی کو تصویریں ہوئیں پیدا
ہوئے ہم جس قدر آزاد زنجیریں ہوئیں پیدا



پاسِ ادب سے چھُپ نہ سکا رازِ حُسن و عشق
جس جا تمہارا نام سُنا، سر جُھکا دیا



جس میں آباد تھی دُنیائے محبت میری
ہائے اس اشک کا آنکھوں سے جُدا ہونا



اُمید عفو کو بھی میں نے اب دل سے مٹا ڈالا
یہ تھا اک بدنُما دھبا مرے دامانِ عصیاں کا



کیا بلا عشقِ تماشا ساز ہے
اس کا ہر انجام اک آغاز ہے



اس جلوۂ تمام کی ہم کو خبر ہی کیا؟
اک ناتواں سا رشتہ تارِ نظر ہی کیا؟



مرا احساسِ غم، اے کاش! اتنا تیز ہو جاتا
جو چھُو جاتی ہوا، دل درد سے لبریز ہو جاتا
نہ رکھا دل کو احساسِ گنہ نے مشتعل، ورنہ
یہی ظلمت کدہ اک دن تجلّی خیز ہو جاتا
یہ ساری لذّتیں ہیں میرے شوقِ نامکمل تک
قیامت تھی، یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا
نشۂ صہبائے غفلت جب ذرا کچھ کم ہوا
مجھ کو ہر ذرّہ مری ہستی کا سازِ غم ہوا
تیرے اسرارِ حقیقت کا وہی محرم ہوا
رہ کے عالم میں بھی جو بیگانۂ عالم ہوا
ربطِ باطن اس کو کہتے ہیں کہ روزِ اوّلیں
رُوح مضطر ہی رہی، جب تک نہ پیدا غم ہوا



توڑ کر سینہ و دل یار کا پیکاں نکلا
جان نکلی مرے اللہ، کہ ارماں نکلا!



تھی حریمِ ناز کے پردوں میں بھی جُنبش تمام
ایک رنگِ خاص سے جب مضطرب تھا دل مرا

مڑ کے پھر میں نے نہ دیکھا میں ہوں ایسا رہ نورد
دیکھتی ہی رہ گئی حسرت سے مُنہ منزل مرا

بے دلی پر کیوں ہراساں ہوں کہ ہے مجھ کو خبر
خود نگاہِ ناز ہی اِک دن بنے گی دل مرا



عشق کی دسترس ہو کیا جلوہ بے پناہ تک!
اُٹھ نہ سکی نگاہ بھی، کر نہ سکے اک آہ تک



بیانِ اہلِ دل ہے کب اسیر قیل و قال میں
نظر ملی کہ ہو گیا تبادلۂ خیال میں



تھی سکونِ یاس میں بھی موجزن اِک برقِ حُسن
میں یہ سمجھا تھا کہ اب کوئی شریکِ دل نہیں



کس کو رہا ہے پاسِ عشق، کس کو رہے گا پاسِ حُسن
حُسن میں گُم حواسِ عشق، عشق میں گُم حواسِ حُسن

دیدۂ شوق سے ہوئیں آج وہ گل فشانیاں
ڈوب گئی بہار میں سادگیٔ لباسِ حُسن!



بیکسانِ راہِ اُلفت کو سمجھتے کیا ہو؟
عرش ہل جائے اگر دل سے یہ فریاد کریں



غفلتوں میں قید کب فطرت کے کاروبار میں
رُوح کہتی ہے کہ سوئیں آپ، ہم بیدار ہیں

جمع ہیں اضداد تو قائم ہے شانِ امتیاز
کلفتیں ہی مٹ گئیں تو راحتیں بیکار ہیں

قطعہ

مستِ جامِ شراب ہوتا ہوں
ہمہ تن آفتاب ہوتا ہوں

کل دکھایا تھا آپ نے جلوہ
آج میں بے نقاب ہوتا ہوں



قطعہ

ہو گئے مرگ و زیست سے آزاد
حسنِ انجام اِس کو کہتے ہیں

بعد مرنے کے بھی قرار نہیں
مرگِ ناکام اِس کو کہتے ہیں

برق گرتی ہے کہیں، چلتی ہیں شمشیریں کہیں
وہ کہیں خود عشوہ فرما، اُن کی تصویریں کہیں
جذبۂ دِل رنگ بن کر مائلِ پرواز ہے
لے کے اُڑ جائیں مصوّر کو نہ تصویریں کہیں



جان اُن پر نثار کرتا ہوں
پیار کی طرح پیار کرتا ہوں
لذّتِ گریۂ فراق نہ پُوچھ!
ہر تبسم نثار کرتا ہوں
عشق کی بے نیازیاں بن کر
حُسن کو بے قرار کرتا ہوں



جو آنسو آنکھ سے ٹپکے، وہ نظروں سے نہاں کیوں ہو؟
الٰہی! حاصلِ دردِ محبت رائیگاں کیوں ہو؟
یہی منشائے جاناں ہے، تو افشارازِ جاں کیوں ہو؟
کمالِ ضبط بھی، اے دل، اک اندازِ بیاں کیوں ہو؟



عقل باریک ہوئی جاتی ہے
رُوح تاریک ہوئی جاتی ہے



یہ کس سے کلام ہو رہا ہے
ہر سانس پیام ہو رہا ہے
ہشیار کو کب خبر ہے اِس کی
غفلت سے جو کام ہو رہا ہے
ہر نقش جبینِ عاشقی کا
مسجُودِ انام ہو رہا ہے



چُھپ کے رہ نہیں سکتی، عاشقی وہ مستی ہے
دل سے بادل اُٹھتے ہیں، آنکھ سے مئے برستی ہے
ہوش کا وہ بندہ یہ سجدہ ریز مستی ہے
آدمی کی فطرت میں یعنی بُت پرستی ہے
بے خبر! یہی تو ہے دو جہاں کا سرمایہ
یہ جو تیرے سینے میں مضطرب سی مستی ہے



ناگوارا ہے یہ شانِ جہدِ آزادی مجھے
میں تو مر جاؤں، جو کہہ دے کوئی فریادی مجھے



کیا کیا خیال و وہم نگاہوں پہ چھا گئے
جی دھک سے ہوگیا، یہ سُنا جب، وہ آگئے



شوق محوِ آرائش، عشق غرقِ وحدت ہے
اک نظر میں مستی ہے، اک نظر میں حیرت ہے
کیا مزاجِ دل کہیے؟ دل کی اب یہ صُورت ہے
حال ہے نہ بے حالی، کچھ عجیب حالت ہے



کسی طرف سے شبِ غم صدا نہیں آتی! پکارتا ہوں قضا کو، قضا نہیں آتی
ترے فراق کے غم نے بچا لیا سب سے مرے قریب کوئی اب بلا نہیں آتی



ہر قدم پر گر گر کر آدمی سنبھلتا ہے یعنی خضر بھی کوئی ساتھ ساتھ چلتا ہے



گذر سکے تو گذر جا بطرزِ بے خبری یہ کل جہاں ہے فریب تجلّی نظری



میں بتاؤں تجھ کو یہ راز کیا؟ تو اسیرِ دامِ قیود ہے میں جہاں ہوں نغمہ سرا، وہاں نہ وجود ہے نہ شہود ہے



ہوشیار، اے دیدۂ گستاخِ عاشق ہوشیار! اُس کے استغنائے وقتی پہ نہ جانا چاہیئے!!
بزمِ ساقی میں نہیں کچھ کام عقل و ہوش کا مست جانا چاہیئے مدہوش آنا چاہیئے



محبت کی پُر پیچ راہوں نے مارا! تری آڑی ترچھی نگاہوں نے مارا



وہ غریقِ معرفت، یہ محو ماومن میں ہے عینِ قربت پر بھی کتنا بُعد رُوح وتن میں ہے
ہم سے پوچھو، وہ کہاں ہے اور کس مسکن میں ہے درد کی بیتابیوں میں، قلب کی دھڑکن میں ہے



جذباتِ جگرؔ

(دورِ سوم)

اُس کی نگہِ ناز کے قابل نہ سمجھنا
اَے بے خبرو! دل کو کبھی دل نہ سمجھنا

بے کار سی اِک ہستیٔ باطل نہ سمجھنا
نقشِ قدمِ یار ہے یہ، دل نہ سمجھنا

دل ہی کو فقط درد کے قابل نہ سمجھنا
اس شوخ سے خالی کوئی محفل نہ سمجھنا

میں دل سے سہی دُور، مگر اے غمِ جاناں!
دل کو مرے، آوارۂ منزل نہ سمجھنا

جو موجِ نظر ہے، وہ ہے اک برقِ تجلّی
آنکھوں کو فقط پردۂ حائل نہ سمجھنا

ہر جلوے کے پردے میں وہ خود سیر کناں ہے
تنہا اسے ہنگامۂ محفل نہ سمجھنا

خود دے کے کہا دردِ محبت یہ کسی نے
"اب آج سے اپنا اسے تم دل نہ سمجھنا"

کہتی ہے یہ اب وسعتِ دیوانگیٔ شوق
منزل بھی جو آ جائے تو منزل نہ سمجھنا

اے قیسِ نظر! حُسنِ حقیقت سے خبردار
سایہ ہے اسے صاحبِ محمل نہ سمجھنا

ہر سانس ہے در پردہ نگہبانِ محبت
زنہار کبھی، حُسن کو غافل نہ سمجھنا

ہر ذرّہ ہے اِک پیکرِ صد حُسنِ حقیقت
ہستی کو، جگرؔ! ہستیٔ باطل نہ سمجھنا



محال تھا کہ میں آزادِ دو جہاں ہوتا
بقیدِ جسم نہ ہوتا، بقیدِ جاں ہوتا

نہاں کئے سے کہیں رازِ غم نہاں ہوتا؟
زباں دہن میں نہ ہوتی تو دل زباں ہوتا

یہ سوچتا ہوں، ٹھکانا مرا کہاں ہوتا
اگر وہ میری طرح مجھ سے بدگماں ہوتا

محال تھا کہ غمِ عشق بے نشاں ہوتا
جو میں نہیں تو مری آہ کا دھواں ہوتا

جو میں خود اپنی حقیقت کا رازداں ہوتا
تمام منظرِ فطرت مری زباں ہوتا!

یہ سب ہیں فیض اسی دم قدم کے، اے بُلبُل!
خزاں نہ تنکے اُڑاتی، نہ آشیاں ہوتا

بھلا ہوا کہ نظر حیرتوں میں ڈوب گئی
کہاں کہاں نہ ترا حُسنِ رائگاں ہوتا!

صفاتِ عشق کی تکمیل بھی ضروری تھی　　جبیں پہ سجدۂ بُت کا بھی اک نشاں ہوتا
بہار توبہ شکن، چشمِ مستِ یار مُصر　　میں آج پی جو نہ لیتا، وہ بدگماں ہوتا
کہاں فراغ تلوّن مزاجیوں سے تری؟　　یہ دردِ ہجر ہی، اے کاش جاوداں ہوتا!
کمالِ اہلِ حرم مستند سہی لیکن!　　کوئی تو باخبرِ جلوۂ بُتاں ہوتا
یہ ذوقِ سجدہ کہیں مطمئن نہ رہ سکتا　　مری جبیں سے جو باہر وہ آستاں ہوتا
کہاں ہم، اور کہاں اب فسانۂ غمِ عشق　　وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا
وہ حالِ دل لبِ خاموش سے بھی سُنتے ہیں　　یہ جانتا تو نہ شرمندۂ فغاں ہوتا
گدازِ عشق کی اب شرح مختصر یہ ہے　　وہ مہرباں جو نہ ہوتا، تو مہرباں ہوتا
نثار ہو گئے، اک جلوۂ تبسّم پر　　کہاں نصیب، یہ وقتِ وداعِ جاں ہوتا
تمام اُٹھ گئے پردے، تو اِس سے کیا حاصل؟　　مزا تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا

یہ سب نمود و نمائش ہے تیرے چھپنے سے
جو تُو نہ پردے میں ہوتا، تو میں کہاں ہوتا



یادِ ایام، کہ جلووں کا ترے ہوش نہ تھا　　حیرت آوارہ نہ تھی، عشق جنوں کوش نہ تھا
حُسن بھی بزم میں جب تک کہ قدح نوش نہ تھا　　بادۂ عشق میں نشہ تھا، مگر جوش نہ تھا
ہائے آغازِ محبت کا وہ دورِ سرشار　　کون سا اشک تھا، جو ساغرِ سرجوش نہ تھا

دن جوانی کے جگرؔ بے خبری میں گزرے
ہوش کا وقت جب آیا، تو مجھے ہوش نہ تھا



جنوں میں بھی کیا کم یہ سامان ہو گا؟　　گریباں سے پیدا گریبان ہو گا
نہ جاں دل بنے گی، نہ دل جان ہو گا　　غمِ عشق خود اپنا عُنوان ہو گا
ٹھہر، اے دلِ درد مندِ محبت!　　تصوّر کسی کا پریشان ہو گا
مرے دل میں بھی اک وہ صورت ہے پنہاں　　جو وہ دیکھ لے گا، تو حیران ہو گا
یہ کہہ کر دیا اُس نے دردِ محبت　　"جہاں ہم رہیں گے، یہ سامان ہو گا"
گوارا نہیں جان دے کر بھی دل کو　　تری اک نظر کا جو نقصان ہو گا
کٹے گی شبِ غم بڑی راحتوں سے　　تری یاد ہو گی، ترا دھیان ہو گا

چلو دیکھ آئیں، جگرؔ کا تماشا
سُنا ہے وہ کافر مُسلمان ہو گا



حُسن کے احترام نے مارا — عشق بے ننگ و نام نے مارا
وعدۂ ناتمام نے مارا — روز کی صبح و شام نے مارا
لرزشِ دستِ شوق، آہ نہ پُوچھ! — لغزشِ نیم گام نے مارا
عشق کی سادگی تو ایک طرف — شوق کے اہتمام نے مارا
اللہ اللہ! نفس کی آمد و شُد — اس پیام و سلام نے مارا
عشق مرتا نہ اپنی موت سے آہ! — عاشقانِ کرام نے مارا
کاش وہ عمرِ خضر بن جاتے — جن خیالاتِ خام نے مارا
میں نہیں بسملِ خیام، جگر
حافظِ خوش کلام نے مارا



جدھر سے حُسن کا اک گوشۂ نقاب اُٹھا — تمام ذرّے پُکارے، وہ آفتاب اُٹھا[1]
یہ کون جام تہی کردہ و خراب اُٹھا؟ — کہ مے کدے کو لئے شورِ اضطراب اُٹھا
نظر کو مستِ مئے حُسن کر، حجاب اُٹھا — جگر! شراب نہ پی، تہمتِ شراب اُٹھا
یہ سب جو حسنِ حقیقت پہ ہیں حجاب، اُٹھا — نظر کو ہے جو اُٹھانا تو کامیاب اُٹھا
نشانِ منزلِ جذبِ تمام چھپ نہ سکا — اِدھر فنا ہوا قطرۂ اُدھر حباب اُٹھا
کہاں مشاہدۂ رُوح میں ہے پابستہ؟ — بہت لطیف سہی، پھر بھی یہ حجاب اُٹھا
نمودِ حُسن کی یہ گرمیِ مزاج تو دیکھ — ہزار قطرے فنا کرکے، اک حباب اُٹھا
کہیں نہ فتنہ کوئی اُٹھ کے تھام لے دامن — قدم نہ راہ محبت میں بے حساب اُٹھا
رہِ طلب میں نہ کر، خوف لغزشِ پا سے — یہاں جو گر کے اُٹھا، بس وہ کامیاب اُٹھا
جہانِ حُسن سے تکمیلِ تشنگی کر لے — ابھی نظر سے نہ یہ پردۂ سراب اُٹھا
بھری ہوئی ہیں فضائیں جمالِ غم سے تمام — گناہگارِ نظر! لذّتِ عذاب اُٹھا

---

[1] ''آفتاب اُٹھا'' درحقیقت خلافِ محاورہ ہے، مگر میرا مفہوم بجز اس کے اور کسی طرح ادا نہیں ہوتا۔ اگر مذاقِ سلیم سے کام لیا جائے، تو یہ ایک اجتہاد ہوگا، جسے رائج ہونا چاہیے۔ (جگرؔ)

وداعِ ہوش کو پابندِ انحصار نہ کر
سکونِ شوق سے بھی، کیفِ اضطراب اُٹھا

اُٹھا چکا ہے بہت نازِ بادہ و ساغر
شکستِ نشہ سے اب لذّتِ شراب اُٹھا

فضائے عشق ہے ساکت، ہوائے شوق ہے بخ
کدھر ہے مطربِ آتش نوا، رُباب اُٹھا

کوئی خرابِ تماشا وہاں پہنچ نہ سکا
مگر جو میکدۂ عشق سے خراب اُٹھا

یہی تھا وعدۂ تسکین، یہی تھا عہدِ وفا
نظر تو اپنی، ارے شوخِ پُر حجاب، اُٹھا

نسیمِ شوق، یہ لائی جواب نامۂ درد
کچھ اور دن ابھی تکلیفِ اضطراب اُٹھا

جدھر کو مستیٔ دریا نے رُخ کیا اپنا
تڑپ کے موج اُٹھی، جھوم کر حباب اُٹھا

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے، واعظِ ناداں!
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

کدھر سے برق چمکتی ہے، دیکھیں، اے واعظ!
میں اپنا ساغر اُٹھاتا ہوں، تُو کتاب اُٹھا

کہاں یہ یار، کہاں پائے نازکِ جاناں
اُٹھا سر، اور جگر خانماں خراب! اُٹھا

قریب ساعتِ وصل آ چکی ہے، اب تو، جگر
نچوڑ دامنِ تر، دیدۂ پُر آب اُٹھا



ہزاروں قربتوں پر یوں مرا مجبور ہو جانا
جہاں سے چاہنا اُن کا وہیں سے دُور ہو جانا

نقاب روئے نادیدہ کا از خود دُور ہو جانا
مبارک اپنے ہاتھوں حُسن کو مجبور ہو جانا

سراپا دید ہو کر غرقِ موجِ نُور ہو جانا
ترا ملنا ہے خود ہستی سے اپنی دُور ہو جانا

نہ دکھلائے خُدا، اے دیدۂ تر دل کی بربادی
جب ایسا وقت آئے، پہلے تُو بے نُور ہو جانا

جو کل تک لغزشِ پائے طلب پر مسکراتے تھے
وہ دیکھیں آج ہر نقشِ قدم کا طور ہو جانا

ان آنکھوں کا نہ پوچھو ضبط، جن آنکھوں نے دیکھا ہے
سحر ہونے سے پہلے شمع کا بے نور ہو جانا

محبت کیا ہے، تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں؟
ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

یکا یک دل کی حالت دیکھ کر میرا تڑپ اُٹھنا
اسی عالم میں، پھر کچھ سوچ کر مسرُور ہو جانا

محبت عین مجبوری سہی، لیکن یہ کیا باعث؟
مجھے باور نہیں آتا مرا مجبور ہو جانا

مگر اس رمز سے نا آشنا تھے حضرتِ موسیٰ
کہ ہے تنگِ نظر پابندِ برقِ وجُود ہو جانا

نگاہِ ناز کو تکلیفِ جُنبش تا کُجا آخر؟
مجھی پر منحصر کر دو، میرا مجبور ہو جانا

جگر! وہ حُسنِ یکسوئی کا منظر یاد ہے اب تک
نگاہوں کا سمٹنا اور ہجومِ نُور ہو جانا

ادب شناسِ محبت دل خراب ہوا — ترا حجاب نہ کرنا بھی اب حجاب ہوا
سکونِ شوق جو مائل بہ اضطراب ہوا — شراب و شیشہ بنا، نغمہ و رباب ہوا
اسی سے دل کا ہر اک نقش جلوہ تاب ہوا — مری نظر نہ ہوئی، آپ کا حجاب ہوا
خراب ہو کے بھی دل کب جہاں خراب ہوا — اک آفتاب کا سایہ تھا، آفتاب ہوا
فروغِ بادہ ترے حسن کا جواب ہوا — سنبھالنا مجھے، ساقی! میں بے نقاب ہوا
مجھی ہیں گم، مرا ہر کیف و اضطراب ہوا — جو بچ رہا، وہ مرا شوقِ کامیاب ہوا
کتابِ عشق کا مشکل ترین باب ہوا — وہ ایک دَورِ محبت جو صرفِ خواب ہوا
معاملاتِ محبت یہاں تک اب پہنچے — کمالِ ضبطِ نفس، شرطِ اضطراب ہوا
نگاہِ شوق کی جذب و کشش، ارے توبہ! — جس آئینے پہ نظر کی، ترا جواب ہوا
ستم ظریفیٔ حُسنِ ازل، ارے توبہ! — وہ دل دیا کہ جسے قُرب بھی عذاب ہوا
اس ایک دل کی حقیقت کو کوئی کیا جانے؟ — جو لاکھ بار بنا، اور پھر خراب ہوا
نگاہِ دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکی — وہ ہر کرم جو پسِ پردۂ عتاب ہوا
دلِ تباہ کی کرنی ہی تھی کوئی تاویل — سمجھ لیا کہ محبت کا گھر خراب ہوا
نگاہ خاک پہنچتی جمالِ معنی تک — خیال دل میں اُترتے ہی اضطراب ہوا
بہت ملال ہے دل کو، سُنا ہے یہ جب سے — بہ حدِ تابِ نظر کوئی بے حجاب ہوا
سکون اصلِ عدم تھا محیط قدرت میں — دلیل ہستیِ ہر موج اضطراب ہوا

جہانِ شوق کی محرومیاں نہ پوچھ، جگر
سکوں تو کیا، کہ میسّر نہ اضطراب ہوا!



رحمت نے مجھ کو مائلِ عصیاں بنا دیا — اک پیکرِ حقیقتِ عُریاں بنا دیا
ساقی نے آج بندۂ احساں بنا دیا — ڈالی وہ اک نظر کہ مُسلماں بنا دیا
دل کو حریفِ جلوۂ جاناں بنا دیا — میں وہ ہوں جس نے حُسن کو حیراں بنا دیا
تیری ہر ایک شان کے شایاں بنا دیا — انساں کو دردِ عشق نے انساں بنا دیا
بربادیوں نے لُوٹ کے سامانِ آرزو — ناکامیوں کو حاصلِ عرفاں بنا دیا
اس عشق ہرزہ کار سے ہوتا ہی کیا، مگر — اک کیفِ مستقل کو رگِ جاں بنا دیا
اک اک ادائے عشق کو تاثیرِ حُسن نے — آئینۂ لطافتِ پنہاں بنا دیا
ساقی کے فیضِ مست نگاہی کے میں نثار — ایک ایک موجِ مے کو رگِ جاں بنا دیا

اس کے لئے تو تنگِ محبت ہی فخر تھا — تیرا کرم کہ جان کو جاناں بنا دیا
کس نے غمِ فراق میں بھر کر نشاطِ رُوح — اِک محشرِ تبسمِ پنہاں بنا دیا
آج اُس نظر نے دل سے کیا یُوں معانقہ — سمجھا یہ میں کہ درد کو درماں بنا دیا

ہم بھی ہیں کلمہ گو اُسی کافر نگاہ کے
کافر جگرؔ کو جس نے مسلماں بنا دیا



خالی ز ادا ہائے پریشاں نہیں دیکھا — ہم نے کسی آئینے کو حیراں نہیں دیکھا
مُدّت ہوئی چھیڑے ہوئے افسانۂ ہستی — اب تک اثر خوابِ پریشاں نہیں دیکھا

اللہ ری مجبوریٔ آدابِ محبت
گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا



وارفتگیٔ شوق میں حد سے نہ گزر جا — ٹھہر، اے جہانِ مصلحتِ عشق! ٹھہر جا
کونین کی ان بُھول بُھلیّوں سے گزر جا — اپنی ہی طرف دیکھ اِدھر جا، نہ اُدھر جا
تقلیدِ صبا اک روشِ عام ہے، اے دل! — تو موجِ فنا بن کے اُبھر اور ٹھہر جا
مجھ سا کوئی دیوانہ تجھے کون ملے گا؟ — آ، اے اجل آ، تو بھی مرے ساتھ ہی مر جا

قاتل کی نگاہوں میں ہے، اک معنیٔ پنہاں
اے جانِ بلب آمدہ! کچھ دیر ٹھہر جا



نہ دیکھا، رُخِ بے نقابِ محبت — محبت ہے شاید حجابِ محبت
برستا ہے کیفِ شبابِ محبت — ہر آنسو ہے جامِ شرابِ محبت
عجب جوش پر ہے شبابِ محبت — محبت ہے، مستِ شرابِ محبت
زہے خواب و تعبیر خوابِ محبت! — محبت ہی نکلی جوابِ محبت
مجھے کیا پڑی ہے ترے در سے اُٹھوں — ٹھہر نے جو دے، اضطرابِ محبت
دلِ ذرّہ ذرّہ ہے طُورِ تجلّی — زہے، جلوۂ آفتابِ محبت
سبھی اُٹھ گئے دیدہ و دل سے پردے — نہ اُٹھا، مگر اک حجابِ محبت
لہو کی ہر اِک بُوند دل بن گئی ہے — خوشا لذّتِ کامیابِ محبت!

حدودِ محبت سے بھی بڑھ گئے ہم
سلامت رہے اضطرابِ محبت



ترے جلووں میں گم ہو کر، خودی سے بے خبر ہو کر
تمنا ہے کہ رہ جاؤں زسرتا پا نظر ہو کر
نہ چونکے اہلِ دل تا حشر مست و بے خبر ہو کر
زمانہ کروٹیں بدلا کیا، شام و سحر ہو کر
جنونِ بیخودی نے کہہ دیا کیا؟ پردہ در ہو کر
نگاہِ قہر بھی اُٹھی، محبت کی نظر ہو کر
بہارِ لالہ و گل، شوخی و برق و شرر ہو کر
وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر ہو کر
نگاہِ اہلِ دل بھی رہ گئی زیر و زبر ہو کر
کہاں پہنچے مرے اجزائے ہستی منتشر ہو کر؟
بھرم کھونا کہیں، اے دل، نہ عشقِ معتبر ہو کر
گزر جا، ہاں گزر جا حُسن سے بھی بے خبر ہو کر
حجاب اندر حجاب و جلوہ اندر جلوہ کیا کہیئے!
بلا میں پھنس گئے عُشاق پابندِ نظر ہو کر
یہاں تک جذب کرلوں کاش! تیرے حُسنِ کامل کو
تجھی کو سب پکار اُٹھیں، گذر جاؤں جدھر ہو کر
اب اس رحمت کے آگے حشر میں کیا ہاتھ پھیلائیں
رہی وابستہ جو مجھ سے، مراد امان تر ہو کر
معاذ اللہ! ان کا کیف و جدانی، معاذ اللہ!
اثر کا مُنہ چڑاتی ہیں جو آہیں بے اثر ہو کر
پڑا رہ سبزۂ بیگانہ پر تُو صُورتِ شبنم
شعاعِ حُسن اُڑا لے جائیگی خود بال و پر ہو کر
کہاں جاتی ہے مل کر، او نگاہِ نازِ بے پروا؟
مرے پہلو میں رہ جا لذّتِ دردِ جگر ہو کر
لطافت مانعِ نظارۂ صُورت سہی، لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے، وہ گذرے ہیں اِدھر ہو کر

حریمِ حُسنِ معنی ہے، جگؔر! کاشانۂ اصغؔر[1]
جو بیٹھو با ادب ہو کر، تو اُٹھو با خبر ہو کر



مجھ سے سنو، مآلِ غمِ انتہائے عشق
میں سازِ عشق ہوں، مری نظریں صدائے عشق
اللہ ری یہ شانِ فنا و بقائے عشق!
اب حُسن آپ جلوہ نما ہے بجائے عشق
وہ جانتا ہے اس کو، جو ہے آشنائے عشق
ہر ذرّہ ہے مقام پر اپنے خدائے عشق
اب کوئی سُن سکے تو سُنے ماجرائے عشق
اک اک نظر ہے مطربِ آفت نوائے عشق

دُنیائے آب و گل کی ہوا گرم ہو چلی
کُھلنے نہ پائے تھے ابھی بندِ قبائے عشق



[1] حضرت اصغر گونڈوی نوراللہ مرقدہٗ ۱۲ (جگر)

اللہ اللہ! اثر انگیزیٔ جذبِ غمِ کیف
ٹپکا پڑتا ہے نگاہوں سے مری عالمِ کیف

اُس نے ساغر کو اُچھالا تھا کسی دن دمِ کیف
بن گیا عالمِ ہستی، ہمہ تن عالمِ کیف

کھل گیا آج مجھے دیکھ کے بیخود دمِ کیف
زاہدِ خشک کو سمجھا تھا میں نا محرمِ کیف

دیکھ! کہتے ہیں اسے حاصلِ کیف و غمِ کیف
رقص کرتا ہے نگاہوں پہ مری عالمِ کیف

گوشۂ دل میں بھی خاک اُڑتی ہے، آنکھیں بھی ہیں خشک
دیکھیے آج برستی ہے کدھر شبنمِ کیف

دیکھنا تھا مجھے، جب میں ہی نہ تھا، اے زاہد
اب جو دیکھی بھی تو کیا انجمنِ برہمِ کیف

جذب ہو کر ترے جلووں میں عجب حُسن بنا
چھا رہا تھا نگہِ شوق پہ جو عالمِ کیف

سب ہیں اک بادۂ بے کیف کے پینے والے
محرمِ کیف ہو کوئی کہ ہو نا محرمِ کیف

ہر نفس جس کا ہو اک جلوۂ نو سے ملحق
پُوچھ، اس مست سے اندازۂ نشر و دمِ کیف

کب اُسے وسعتِ کونین بھی کافی ہوتی؟
تُو نہ بنتی اگر، اے جانِ حزیں محرمِ کیف

دیکھتے دیکھتے یوں عشق نے کروٹ بدلی
انتہا کیف کی خود بن گئی وجہِ رمِ کیف

ہمہ ایں دامِ قیود و ہمہ ایں نقشِ وجود
حلقہ ہست زصد سلسلۂ برہمِ کیف

ایک دن منظرِ فطرت ہی بدل دے نہ کہیں
یہ تری مست نگاہی، یہ مرا عالمِ کیف



نالہ پابندِ نفس، اے دلِ ناشاد! نہیں
یہ تو فریاد کی توہین ہے، فریاد نہیں!

اب یہ کیا بات کہ آباد نہیں، شاد نہیں؟
دل گزر گاہ تری ہے، تجھے کیا یاد نہیں

عشق محرومِ اثر او ستم ایجاد نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا، درد کی فریاد نہیں

آنکھ کہہ دے جسے وہ عشق کی رُوداد نہیں
دل سے آ جائے جو لب تک، مری فریاد نہیں

تجھ سے، اے دوست کوئی شکوۂ بیداد نہیں
دل ستم ساز ہے خود، تو ستم ایجاد نہیں

نقش بن کر اسے رہنا ہے، سنو یا نہ سنو
دل کی آواز ہے یہ درد کی فریاد نہیں

دُور ہے منزلِ عرفانِ خودی، اور یہاں
بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خُدا یاد نہیں

غم سلامت ہے تو کر لے گا بہت دل پیدا
سچ کہا آپ نے، ہستی تری برباد نہیں!

ہم وہ مدہوشِ ازل ہیں کہ الٰہی توبہ!
دل سے کیا کہہ کے چلے تھے، ہمیں کچھ یاد نہیں

مری ہستی ہے مری عرضِ تمنائے دوست!
خود میں فریاد ہوں میری کوئی فریاد نہیں

موت ہے ذوقِ طلب کے لئے عرفانِ حصول
سعیٔ برباد ہے جو سعی کہ برباد نہیں

مستیٔ غم کا ہے اِدراک جسے کہتے ہیں درد
ہستیٔ دل کا ہے احساس، تری یاد نہیں

پھونک دے قیدِ تعیّن کو بھی، اے برقِ جمال! / دل ہے آزاد نگاہیں ابھی آزاد نہیں
آنکھ غافل ہے کہ ہے تشنۂ دیدار ہنوز / دل ہے آگاہ، کہ تو خود ہے، یہ تری یاد نہیں
تم نے کیوں انجمنِ ناز میں تیور بدلے؟ / دل دھڑکنے کی صدا ہے، کوئی فریاد نہیں
دیکھنا بیخودیٔ عشق کا اعجاز، جگرؔ
کہہ رہا ہوں وہ فسانہ، جو مجھے یاد نہیں!



عشق کا پیغامِ مستی، شوق کی رُوداد ہوں / زندگی جس سے برستی ہے، میں وہ فریاد ہوں
ہر نفس سرمایہ دارِ عشقِ کامل ہے مرا / مرحبا دردے کہ حُسنِ دوست کی رُوداد ہوں!
مائلِ فرزانگی ہے اب مرا ذوقِ جنوں / آج کل میں محوِ تعمیرِ خراب آباد ہوں
عشقِ بے پروا مرا، کافی حقیقت ہے، مری / کچھ سمجھ کر میں ہلاکِ حُسنِ بے بنیاد ہوں
اور بھی مشقِ فنا سے بڑھ گئی ایذائے فکر / جس طرف اب دیکھتا ہوں، مَیں ہی مَیں آباد ہوں
میری ہستی جستجو، میری حقیقت احتیاج / میں سراپا درد ہوں، میں مستقل فریاد ہوں
کچھ نہیں کھلتا، جگرؔ! رازِ طلسمِ کائنات
مجھ میں یہ آباد ہے یا اس میں مَیں آباد ہوں



لے کے نکلا ہے مرا جوشِ لطافت مجھ کو / خوب پہچان لے آج، اے مری صورت! مجھ کو
منزلِ غم میں کہاں، وقفۂ راحت مجھ کو؟ / ہر نفس تازہ ہے در پیش قیامت مجھ کو
گر پڑی رُوح تعیّن کدۂ ہستی میں / کاش! ہوتا ہی نہ احساسِ محبت مجھ کو
عشق نے خدمتِ دشوار وہ کی ہے تفویض / خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت مجھ کو
علم کے جہل سے بہتر ہے کہیں جہل کا علم / مرے دل نے یہ دیا درسِ بصیرت مجھ کو
برسوں آوارہ پھرا بادِ صبا کے ہمراہ / دل نے جب تک نہ دکھادی مری وسعت مجھ کو



قلزم آشامیٔ یک قطرۂ بیتاب تو دیکھ / گم کئے دیتی ہے میری ہی محبت مجھ کو
رندِ میخوار وہ ہوں، میکدۂ ہستی میں / ہر خمِ موج ہے محرابِ عبادت مجھ کو
اُڑ چلا ہوں نگہِ یار سے شوخی لے کر / اب جو ممکن ہو تو روکے مری حیرت مجھ کو
لے لیا کام جو لینا تھا غمِ ہستی نے / گرچہ ثابت نہ ہوئی میری ضرورت مجھ کو

گلِ ویرانہ کو کیا اہلِ ہوس سے مطلب؟
ننگ ہے، میری پریشانیٔ نکہت مجھ کو
فردِ عصیاں کو مری اے عرقِ شرم نہ دھو
اس سے ہوتا ہے کچھ اندازۂ رحمت مجھ کو
یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو



اے وہ! کہ تجھ سے تازہ گلستانِ آرزو
بھر دے گلِ مراد سے دامانِ آرزو
اللہ رے، فیضِ جلوۂ تابانِ آرزو!
صبحِ ازل ہے شامِ غریبانِ آرزو
نکلی تڑپ کے آنکھوں سے اک موجِ بیقرار
اب آرزو کہو اسے، یا جانِ آرزو
قطرے تمام خونِ شہیداں کے بن گئے
نقش و نگارِ پردۂ ایوانِ آرزو
جنبش میں ہیں تمام حروفِ خطِ نیاز
اللہ رے، فیضِ شوخیٔ عنوانِ آرزو!
سب کچھ ہوا، مگر نہ کھلا آج تک یہ راز
تم جانِ آرزو ہو کہ ہم جانِ آرزو
ہاں، اس طرف بھی اک نگہ نیشتر نواز
کب سے تڑپ رہی ہے رگِ جانِ آرزو



اندازۂ ساقی تھا کس درجہ حکیمانہ!
ساغر سے اُٹھیں موجیں بن کر خطِ پیمانہ
انجام سے بے پروا، آغاز سے بیگانہ
پروانے کی دُنیا ہے، بیتابیٔ پروانہ
شیشے سے نہ رکھ مطلب، اے ساقیٔ میخانہ!
ان مست نگاہوں سے بھر دے میرا پیمانہ
آجائے اگر اپنی ضد پر کوئی دیوانہ!
خود گرد پھرے آ کر، کعبہ ہو کہ بُت خانہ
ادراک ہے ہستی کا، احساس ہے مستی کا
ہاں اے نگہِ ساقی، اک اور بھی پیمانہ!
ٹکرا دیا شیشوں کو، لڑوا دیا رندوں کو
نچلی نہ کبھی بیٹھی، وہ نرگسِ مستانہ



بے نقاب آج تو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے
جو جہاں پر ہے وہیں بیخود و حیراں ہو جائے
واقفِ سرِّ حقیقت اگر انساں ہو جائے
غم سے نزدیک ہو، راحت سے گریزاں ہو جائے
اس کی اک موجِ تبسّم جو نمایاں ہو جائے
دل کا ہر ذرّہ بے کیف خمستاں ہو جائے
ایک ذرّے کا اگر حُسن نمایاں ہو جائے
آدمی شدّتِ انوار سے حیراں ہو جائے

حُسن خود ہونگراں، عشق جو حیراں ہو جائے
جان خود جسم بنے، جسم اگر جاں ہو جائے

کُفر ہی کا اگر انسان کو عرفاں ہو جائے
جس جگہ ٹیک دے سر، کعبۂ ایماں ہو جائے

تُم سُنا دو کسی پردے پہ جو اپنی آواز
رُوح خوابیدہ ابھی جسم میں رقصاں ہو جائے

دل ہے گنجینۂ اسرار، نگاہیں محدُود
کاش اُس گل کا ہر اک جُزو پریشاں ہو جائے

مستیِ عشق کا افسانہ اگر چھیڑ دُوں میں
کُفر کی شرح میں گُم، شیخ کا ایماں ہو جائے

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی، نہ سہی
یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

اس سے بڑھ کر کوئی دل سوز بھی دُنیا میں نہیں
نفسِ چالاک اگر تابعِ فرماں ہو جائے

یوں بڑھے پائے طلب حُسنِ قدم کی جانب
ایک ہی جست میں طے عالمِ امکاں ہو جائے

عام ہے بیعتِ ساقی، درِ میخانہ ہے باز
آج ہونا ہو جسے آ کے مُسلماں ہو جائے

اللہ اللہ! یہ عرفانِ جنوں کی تاثیر
آج جس خار سے کہہ دُوں، وہ گلستاں ہو جائے

خام سمجھو طلب و شوق کا اعجاز، جگر
ہر نفس عشق میں جب تک نہ رگِ جاں ہو جائے



دل کو کسی کا تابعِ فرماں بنائیے
دشوارئ حیات کو آساں بنائیے

درماں کو درد، درد کو درماں بنائیے
جس طرح چاہیے، مجھے حیراں بنائیے

پھر دل کو محوِ جلوۂ جاناں بنائیے
پھر شامِ غم کو صبحِ درخشاں بنائیے

پھر کیجیے اسی رُخِ تاباں سے کسبِ نُور
پھر داغِ دل کو شمعِ شبستاں بنائیے

پھر لکھیے خطِ شوق میں بیتابیِ فراق
پھر خونِ دل کو زینتِ عنواں بنائیے

پھر پیکرِ حیات میں بھریے فنا کا رنگ
پھر جان و دل کو شعلۂ بداماں بنائیے

منشائے حُسنِ دوست ہے، نکلیں نہ حسرتیں
سینہ تمام گنجِ شہیداں بنائیے

آباد اگر نہ دل ہو، تو برباد کیجیے
گلشن نہ بن سکے تو بیاباں بنائیے

ایک اک لہو کی بُوند میں بھر لیجے دردِ عشق
جتنی رگیں ہیں سب کو رگِ جاناں بنائیے

دل کو اسی نگاہ کے دیجیے سپرد
گلشن بنائیے، نہ بیاباں بنائیے

اُن کی طرف سے دل پہ جو پڑ جائیں مشکلیں
اپنی طرف سے اُن کو نہ آساں بنائیے

برقِ جمالِ یار یہ کہتی ہے، اے جگر!
کون اہلِ ہوش ہے، کسے حیراں بنائیے؟



خود اپنے عکس کو اپنے مقابل دیکھنے والے!
ذرا آنکھیں تو کھول او نقشِ باطل دیکھنے والے!

حقیقت کو حقیقت کے مقابل دیکھنے والے!
مجھے بھی دیکھ، میری ہستیِ دل دیکھنے والے!

یہ محفل ہے، یہاں ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے
ارے بیگانہ بن کر جانبِ دل دیکھنے والے!

نقوشِ پرتوِ رنگینیٔ دل دیکھنے والے!
کبھی خود کو بھی دیکھا او خود سے غافل دیکھنے والے!

تیرے جلووں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں میں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے؟

ترے کوچے میں آ کر فخر سمجھے ہیں اسیری کو
زمیں سے آسماں تک وسعتِ دل دیکھنے والے

نہ دیکھیں آنکھ اُٹھا کر بھی جمالِ شاہدِ مقصد
غمِ بے حاصلی کا حُسنِ حاصل دیکھنے والے

تری صورت کا مظہر ہے ترا ہر پرتوِ رنگیں
تجھی کو دیکھتے ہیں تیری محفل دیکھنے والے

شہادت انتقامِ عشق کی صورت بدلتی ہے
سنبھلنا، ہاں سنبھلنا، رقصِ بسمل دیکھنے والے!

مری ہستی کا ہر ذرّہ اُڑا جاتا ہے منزل سے
مرا منہ دیکھتے ہیں جذبِ منزل دیکھنے والے

زمین و آسماں کیا ہیں؟ مکان و لامکاں کیا ہے؟
سما جا تُو بھی او گنجائشِ دل دیکھنے والے!

انہیں تہ کی خبر کیا، گوہرِ مقصد کو کیا جانیں؟
یہ سب ہیں رقصِ موج و شکرِ ساحل دیکھنے والے

شہیدانِ محبت سے لڑا آنکھیں نہ، اے ناصح!
یہی وہ ہیں، جنہیں کہتے ہیں قاتل دیکھنے والے

اِدھر آ، ہر قدم پر حُسنِ منزل تجھ کو دِکھلا دُوں
فلک[1] کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

مری آتش نوائی کا بھی کچھ اندازہ فرمائیں
اسی محفل میں ہوں گے نبضِ محفل دیکھنے والے

انہیں میں کھینچ کر رُوحِ محبت میں نے بھر دی ہے
مرے اشعار دیکھیں گے، مرا دل دیکھنے والے

مجھے آغوشِ طوفاں ہی جگرؔ ، آغوشِ مادر ہے
وہ کوئی اور ہوں گے امنِ ساحل دیکھنے والے



اِک حُسن کا دریا ہے، اِک نُور کا طوفاں ہے
اس پیکرِ خاکی میں یہ کون خراماں ہے؟

اِک سازِ محبت ہی کل عالم! امکاں ہے
تو چھیڑ تو دے ظالم، ہر تار رگِ جاں ہے

پھر عشقِ جنوں پیشہ یوں سلسلہ جنباں ہے
راہیں بھی گُریزاں ہیں، منزل بھی گریزاں ہے

تُو رازِ محبت کو سمجھا ہی نہیں، ورنہ!!
پابندیٔ انساں ہی آزادیٔ انساں ہے

مجھ کو مری عصیاں سے کیا خاک ڈرائے گا
زاہد، وہی زاہد جو رحمت سے گُریزاں ہے

صدقے ترے ہونٹوں کے، رنگینی و رعنائی!
اک موجِ تبسّم میں کُل رازِ گُلستاں ہے

---

[1] مصرع طرح مشاعرہ مسلم ہوسٹل الہ آباد یونیورسٹی۔ (جگرؔ)

اک شاہدِ بیتابی، اک پیکرِ محجوبی
ہر درد میں شامل ہے، ہر سانس میں پنہاں ہے

عالم کا تلوّن کیا، ہستی کا تعیّن کیا؟
تُو خود جو خراماں ہے، سایہ بھی خراماں ہے

بے ہوشی و ہشیاری، مجبوری و آزادی
جو کچھ ہے محبت میں، احسان ہی احساں ہے

اللہ تجھے رکھے محفوظ حوادث سے!
اے کفر! ترے دم تک آرائشِ ایماں ہے

یہ تُربتِ عاشق ہے ٹھکرا کے نہ چل، غافل
اس خاک کا ہر ذرّہ خورشید بداماں ہے



فطرت نے محبت کی اس طرح بنا ڈالی
جو قید نظر آئی، اک بار اُٹھا ڈالی

ہر ذرّے کے پیکر میں اک رُوحِ وفا ڈالی
اپنی ہی سی کل دُنیا عاشق نے بنا ڈالی

اس جلوۂ رنگیں کی دیکھے تو کوئی شوخی!
بُت خانے کے پردے میں کعبہ کی بِنا ڈالی

بربادِ ستم ہو کر، پامالِ کرم بن کر
میں نے بھی نقاب اپنے چہرے سے اُٹھا ڈالی

ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت تھی
رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی



عشق میں مقصودِ اصلی کو مقدّم کیجئے
شرح و تفصیلات پر یعنی نظر کم کیجئے

ہر طرف بے فائدہ کیوں سعی پیہم کیجئے
تشنگی سے اپنے پیدا بحرِ اعظم کیجئے

عشق کی عظمت نہ ہرگز جیتے جی کم کیجئے
جان دے دیجئے مگر آنکھیں نہ پُرنم کیجئے

اپنی ہستی پر نہ طاری کیجئے کوئی اثر
دور سے نظارۂ حُسنِ دو عالم کیجئے

آنسوؤں میں کھینچ لیجے جلوۂ حُسنِ ازل
مہر پیدا کیجئے اور غرقِ شبنم کیجئے

بیخودی میں چھیڑ دیجے، نغمہ ہائے سازِ دل
پھر انہیں موجوں پہ خود ہی رقصِ پیہم کیجئے



احساسِ عاشقی نے بے گانہ کر دیا ہے
یوں بھی کسی نے اکثر دیوانہ کر دیا ہے

اب کیا اُمید رکھوں، اے حُسنِ یار تجھ سے؟
تُو نے مُسکرا کر، دیوانہ کر دیا ہے

تجھ سے خُدا ہی سمجھے، تُو نے کسی کو، اے دل!
مجھ سے بھی کچھ زیادہ دیوانہ کر دیا ہے

پھر اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں
یادش بخیر! جس نے دیوانہ کر دیا ہے

مُجھ کو جُنوں سے اپنے شکوہ جو ہے تو یہ ہے
میری محبتوں کو افسانہ کر دیا ہے
اے حُسنِ روز افزوں، عمرت دراز باد!
دونوں جہاں سے مجھ کو بیگانہ کر دیا ہے
جب دل میں آگیا ہے، اک جُنبشِ نظر نے
دیوانہ کہہ دیا، دیوانہ کر دیا ہے
مجھ ہی سے پُوچھتے ہیں، یہ شوخیاں تو دیکھو
میرے جگرؔ کو کس نے دیوانہ کر دیا ہے؟



ہم سے رندوں کا زمانے سے جُدا میخانہ ہے
آسماں خم ہے، فضائے آسماں پیمانہ ہے
اِک نمودِ مضطرب، اک جوشِ بیتابانہ ہے
عشق دیوانہ سہی، کیا حُسن بھی دیوانہ ہے
حیرت آبادِ فنا بھی کیا تجلّی خانہ ہے
ہر تصوّر شمعِ محفل، ہر نگہ پروانہ ہے
اللہ اللہ! بیخودیٔ شوق کی صُورت گری
ہر قدم پر اس طرف کعبہ، اُدھر بُت خانہ ہے
کھینچ کر اک آہ کس نے رکھ دیا جامِ شراب؟
دیدنی آج اضطرابِ ساقی و پیمانہ ہے
ہوشیار، اور جان و دل سے چھیننے والے، ہوشیار!
آج چشمِ شوق کا انداز بیباکانہ ہے
اس کے دل سے پوچھو رازِ جلوۂ بے رنگِ حُسن
کعبہ بھی جس کی نظر میں صورتِ میخانہ ہے
فیضِ ساقی نے مجھے لبریزِ مستی کر دیا
ہر نظر جام و سبُو ہے، ہر نفس میخانہ ہے
اس تبسّم کے تصدّق، اس تجاہل کے نثار!
خود ہی مجھ سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے
یہ بہار آئی ہوئی، ایسی گھٹا چھائی ہوئی
ہجوِ مے کرتا ہے زاہد، کیا کوئی دیوانہ ہے؟
میں ہوں رندِ لم یزل اک ساقیٔ بے نام کا
شش جہت میرے لئے ٹوٹا سا اک پیمانہ ہے
کوئی قیدِ ہوشیاری ہے نہ شرطِ بیخودی
تم سمجھ لو جس کو دیوانہ وہی دیوانہ ہے
جس کا جتنا ظرف ہے، اس سے سوا ملتا نہیں
جلوۂ ساقی بقدرِ ہمّتِ مردانہ ہے
ہر قدم پر ناصحِ مشفق کی دل سوزی نہ پُوچھ
آدمی اچھا ہے، لیکن اک ذرا دیوانہ ہے!
پی کے اِک جامِ شرابِ شوق آنکھیں کھل گئیں
دیکھتا ہوں جس طرف میخانہ ہی میخانہ ہے
عشق وحدت آشنا و شوق صورت آفریں
اِک نظر اپنی ہے کعبہ، اک نظر بُت خانہ ہے
آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ فرما دیجئے!
سب یہ کہتے ہیں، جگرؔ دیوانہ ہے دیوانہ ہے



ہر گھڑی پیشِ نظر اک تازہ طوفاں چاہیئے — حشر کیا شے ہے مذاقِ حشر ساماں چاہیئے
ذوقِ برہم چاہیئے، شوقِ گریزاں چاہیئے — مجھ کو اب تیرے سوا سب کچھ پریشاں چاہیئے
یہ کرم بھی، اے نگاہِ فتنہ ساماں چاہیئے — دل کی خاطر ایک دل سا دشمنِ جاں چاہیئے
اک جمالِ نو بہ نو طوفاں بہ طوفاں چاہیئے — اب بجائے ہر نگہ تصویرِ جاناں چاہیئے
عشق بے قید تصور شوق بے قیدِ نظر! — مجھ کو جو کچھ چاہیئے بے حد و پایاں چاہیئے
لذّتِ باقی کو اے ذوقِ فنا رہنے بھی تو دے — کچھ تو بہر امتیازِ جان و جاناں چاہیئے
ایک دو چلّو میں بجھتی ہے کہیں رندوں کی پیاس؟ — ہر نگاہِ مستِ ساقی، ساغرستاں چاہیئے
عفو کیسا، جلوۂ رحمت بھی نکلے گا یہیں! — ذوقِ عصیاں چاہیئے، عرفانِ عصیاں چاہیئے
آرزو و شوق تو ہیں انجمن در انجمن! — اب ترا جلوہ گلستاں در گلستاں چاہیئے
حُسن کی کافر نگاہیں، عشق کا معصوم دل — اب تجھے کیا، اے حیاتِ فتنہ ساماں، چاہیئے
سیر گاہِ عشق میں کانٹے ہی کانٹے ہوں تو ہوں — دیکھنے والی نظر گلشن بداماں چاہیئے
آرزوئے دل سلامت، دردِ پیہم برقرار — آنکھ لگ ہی جائے گی، گہوارہ جنباں چاہیئے
منتشر کر دے فضائے حسن میں ذرّاتِ دل — عشق کی تصویر کا ہر رُخ نمایاں چاہیئے

حسن بے تابِ تجلّی خود ہے، لیکن، اے جگر!
ایک ہلکا سا حجابِ چشمِ حیراں چاہیئے



یہ جذبِ شہادت کا حاصل نظر آتا ہے — جو پردہ اُٹھاتا ہوں، قاتل نظر آتا ہے
عالم مجھے نادیدہ بسمل نظر آتا ہے! — بسمل ہے وہی جس کو قاتل نظر آتا ہے
تصدیقِ حقیقت بھی محتاجِ حقیقت ہے — باطل ہے نظر جب تک باطل نظر آتا ہے
اس جانِ تمنّا کا کس طرح پتا پوچھیں! — ہم خود ہی نہیں رہتے، جب دل نظر آتا ہے
اب اس رُخِ رنگیں کے جلووں کو تو کیا کہیئے — اپنا بھی نظر آیا مشکل نظر آتا ہے
ہر سمت سے مقتل میں کیوں ٹوٹ پڑیں نظریں؟ — کیا صورتِ بسمل میں قاتل نظر آتا ہے
ہستی کے عدم پر بھی شک ہے ترے مستوں کو — تصویر کا یہ رُخ بھی باطل نظر آتا ہے

پروردۂ طوفاں کو کشتی کی نہیں حاجت
موجوں کے تلاطم میں ساحل نظر آتا ہے



فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں، جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے

اب زباں بھی دے ادائے شکر کے قابل مجھے
درد بخشا ہے اگر تُو نے بجائے دل مجھے

یوں تڑپ کر دل نے تڑپایا سرِ محفل مجھے
اُس کو قاتل کہنے والے کہہ اُٹھے قاتل مجھے

اب کدھر جاؤں، بتا اے جذبۂ کامل، مجھے
ہر طرف سے آج آتی ہے صدائے دل مجھے

روک سکتی ہو تو بڑھ کر روک لے منزل مجھے
لے اُڑی ہے ایک موج بیقرارِ دل مجھے

جان دے کر حشر تک میں ہوں، مری تنہائیاں
ہاں مبارک، فُرصتِ نظارۂ قاتل مجھے

ہر اشارے پر ہے پھر بھی گردنِ تسلیم خم
جانتا ہوں، صاف دھوکے دے رہا ہے دل مجھے

جا بھی اے ناصح! کہاں سُود اور کیسا زیاں؟
عشق نے سمجھا دیا ہے عشق کا حاصل مجھے

میں ازل سے صبحِ محشر تک فروزاں ہی رہا
حُسن سمجھا تھا چراغِ کشتۂ محفل مجھے

خونِ دل رگ رگ میں جم کر رہ گیا اس وہم سے
بڑھ کے سینے سے نہ لپٹا لے مرا قاتل مجھے

کیسا قطرہ؟ کیسا دریا، کس کا طوفاں کیسی موج؟
تُو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے

پُھونک دے اے غیرتِ سوزِ محبت پُھونک دے
اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

توڑ کر بیٹھا ہوں راہِ شوق میں پائے طلب
دیکھنا ہے جذبۂ بیتابیٔ منزل مجھے

اے ہجومِ نا اُمیدی! شاد باش و زندہ باش!
تو نے سب سے کر دیا بیگانہ و غافل مجھے

دردِ محرومی سہی، احساسِ ناکامی سہی
اُس نے سمجھا تو بہر صورت کسی قابل مجھے

یہ بھی کیا منظر ہے، بڑھتے ہیں نہ ہٹتے ہیں قدم
تک رہا ہُوں دُور سے منزل کو میں، منزل مجھے



اک مئے بے نام جو اس دل کے پیمانے میں ہے
وہ کسی شیشے میں ہے، ساقی، نہ میخانے میں ہے

پوچھنا کیا، کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے
سب اُلٹ دے ساقیا! جتنی بھی میخانے میں ہے

یوں تو ساقی، ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

ایک ایسا زار بھی دل کے نہاں خانے میں ہے
لُطف جس کا کچھ سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے

یادِ ایّامے کہ جب تھا ہر نفس اک زندگی!
زندگی اب ہر نفس کے ساتھ مر جانے میں ہے

ایک کیفِ نا تمام درد کی لذّت ہی کیا؟
درد کی لذّت سراپا درد بن جانے میں ہے

غرق کر دے تجھکو زاہد! تیری دُنیا کو خراب
کم سے کم اتنی تو ہر مے کش کے پیمانے میں ہے

پھر نقاب اس نے اُلٹ کر رُوحِ تازہ پُھونک دی
اب نہ کعبے میں ہے سناٹا، نہ بُت خانے میں ہے

منتشر کر دے اسے بھی حُسنِ بے پایاں کے ساتھ
زندگی شیرازۂ دل کے بکھر جانے میں ہے
پی بھی جا زاہد! خُدا کا نام لے کر پی بھی جا
بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے
شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست
آج پینے کا مزا پی کر بہک جانے میں ہے
بے تحاشہ پی رہے ہیں کب سے رندانِ الست
آج بھی اتنی ہی مے ہر دل کے پیمانے میں ہے
حُسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے، مگر
لُطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے



عشق نے توڑی سر پہ قیامت، روزِ قیامت کیا کہیئے؟
سُننے والا کوئی نہیں، رُودادِ محبت کیا کہیئے؟
دل ہے کسی کا رازِ حقیقت، رازِ حقیقت کیا کہیئے؟
حیرتِ جلوہ مُہر بہ لب ہے، جلوۂ حیرت کیا کہیئے؟
جب سے اُس نے پھیر لی نظریں، رنگِ تباہی، آ جانہ پوچھ!
سینہ خالی، آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہیئے؟
ایک تجلّی، ایک تبسم، ایک نگاہِ بندہ نواز
اس سے زیادہ، اے غمِ جاناں! دل کی قیمت کیا کہیئے؟
شیشۂ دل وہ ہستیٔ نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
اس پہ کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہیئے



ذرّہ ذرّہ دیدہ و دل ہے، گوشہ گوشہ بستی ہے
عشق ہے جب تک سلسلہ جنباں، دل کی ہستی ہستی ہے
جینے تک ہیں ہوش کے جلوے، آگے ہوش کی مستی ہے
موت سے ڈرنا کیا معنی، موت بھی جُزوِ ہستی ہے
معنیٔ صورت، صورتِ معنی، فکر و نظر کے دھوکے ہیں
فکر و نظر تک ہی رہ جانا، فکر و نظر کی پستی ہے
چشمکِ حُسن و عشق مبارک، دیدہ و دل خرّم و شاد
حشر تک اب یہ بحث سلامت کس کی کہاں تک ہستی ہے



نالۂ بے قرار کون کرے؟ حُسن کو شرم سار کون کرے؟
ہوش کی مستیاں، ارے توبہ! ہوش کو ہوشیار کون کرے؟
عشق سے اعتماد کے قابل حُسن کا اعتبار کون کرے؟
ہمیں بن جائیں کیوں نہ صورتِ یار دل کو پابندِ یار کون کرے؟
جان و دل پر نہیں رہا قابو جان و دل اب نثار کون کرے؟
سُوئے صحرا نکل چلے وحشی
انتظارِ بہار کون کرے؟



لازم ہے کچھ تو خاطرِ دلدار کے لئے دُنیا سمیٹ لوں نگہ یار کے لئے
بے ہوش کے لئے ہیں، نہ ہُشیار کے لئے جلوے ہیں خاص چشمِ گُہر بار کے لئے
ہم سے نہ پُوچھ شورشِ درماندگی کا راز جیتے ہیں اِک نگاہِ طرف دار کے لئے
اُن کی حریمِ خاص میں جلووں کا ذکر کیا؟ وہ خود ہیں اپنے طالبِ دیدار کے لئے
دل تک خیالِ غیر بھی لانا روا نہیں مخصوص ہے یہ جام لبِ یار کے لئے
آساں نہیں معاملۂ جلوہ و نظر
چشمِ کلیم چاہیئے دیدار کے لئے



جو جہنم میں بھی فردوس بداماں ہوں گے دیکھ لینا وہ ہمیں سوختہ ساماں ہوں گے
ایک در پردہ کشاکش سے پریشاں ہوں گے خود کو جتنا وہ چُھپائیں گے، نمایاں ہوں گے
نہیں معلوم وہ کس وضع کے انساں ہوں گے جن پہ تیرے ستمِ خاص کے احساں ہوں گے
وہ جدھر ناز سے بے پردہ خراماں ہوں گے ذرے سب جام بکف، مست و غزلخواں ہوں گے
جمع سب حُسن کے اجزائے پریشاں ہوں گے ہم تو ہم، بُت بھی کسی روز مسلماں ہوں گے
میری حیرت کی قسم! آپ اُٹھائیں تو نقاب میرا ذمّہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے
میں چھپاتا ترے اسرارِ محبت ظالم! کیا خبر تھی، مری رگ رگ سے نمایاں ہوں گے
حسن تک دیکھ لیں سب حُسن کے جلووں کی بہار مجھ تک آئے تو مرا حالِ پریشاں ہوں گے
نغمۂ بربطِ غم، کیفِ اثر، شورشِ جاں انہیں پردوں سے کسی دن وہ نمایاں ہوں گے
لُطفِ آزادیٔ زندانِ بلا کیا کہیئے! اب جو چھوٹے تو اسیرِ غمِ زنداں ہوں گے
تجھ کو گلشن کی قسم چھیڑ نہ اے بادِ سحر! کھل گئی غنچوں کی آنکھیں تو پریشاں ہوں گے

حُسن بے قید سہی، عشق بھی محدُود نہیں مجھ کو پائیں گے، جہاں تک وہ نمایاں ہوں گے

شعلہ سامانیٔ غم پہ نہ کرو ناز، جگر
تُم سے کتنے ہی جگر شعلہ بداماں ہوں گے



کوئی نہ گھر ہے اپنا، کوئی نہ آستاں ہے ہر شاخ ہے نشیمن، ہر پھُول آشیاں ہے
تُو سامنے ہے، پھر بھی بتلا کہ تُو کہاں ہے کس طرح تجھ کو دیکھوں، نظارہ درمیاں ہے
میں اپنی اس نظر کی رعنائیوں کے صدقے جو شکل ہے حسیں ہے، دوشیزہ ہے، جواں ہے
میں عشق ہوں مکمل میں شوق ہوں مُسلسل گویا تمام عالم میری ہی داستاں ہے
سب نذرِ حُسن کر کے بیٹھا ہے عشق رُسوا کوئی نہ راز ہے اب، کوئی نہ رازداں ہے
میں کس کے سامنے اب اپنی جبیں جُھکاؤں؟ میری جبیں نہیں ہے، تیرا ہی آستاں ہے

رنگین ہیں فضائیں، جاری ہیں اشکِ خونیں
افسانہ حُسن کا ہے اور عشق کی زباں ہے



پارہ ہائے جگر

زبانِ شوق سے شکرِ وصال ہو نہ سکا — وہ حال تھا کہ کچھ احساسِ حال ہو نہ سکا
نگاہِ شوق نے بدلے ہزارہا منظر — مرے لئے کوئی شایانِ حال ہو نہ سکا



ستم کشوں نے نہ سمجھا کمالِ حیرت میں — چُھپے ہوئے تھے وہ خود پردۂ محبت میں
اگر نہیں پسِ پردہ کوئی حقیقت میں — یہ کون بول رہا ہے طلسمِ صُورت میں؟
جب آئے محفلِ وحدت سے بزمِ کثرت میں — نظر کا بن گئے پردہ نظر کی صُورت میں



آنکھوں کے سامنے اب منزل رہی نہ راہیں — جلوؤں نے ترے مل کر سب لُوٹ لی نگاہیں
سینے سے حُسن نے خود لپٹا لیا تڑپ کر! — فریاد بن کے اُٹھیں آج اس طرح نگاہیں
اک بزمِ ناز میں چل، زاہد، تجھے دکھادوں — مینا بدوش آنکھیں، ساغر بکف نگاہیں



دوست الفت نہ کریں، غیر عداوت نہ کریں — میں کہیں کا نہ رہوں وہ جو عنایت نہ کریں
وقت آئے تو ہمیں جان بھی کر دیں گے فدا — کیا یہ ممکن ہے، تیرے نام کی عزّت نہ کریں؟



یہ بھی گر اک جلوۂ جانانہ نہ ہو! — میری محرُومی عجب افسانہ ہو!



یہ حاصلِ سرمایۂ عرفاں طلبی ہے — یعنی ہوشِ دید خود اک بے ادبی ہے
بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس — شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے

حُسن میں جب تک کہ یہ شانِ خود آرائی نہ تھی
عشق میں مستی تھی لیکن خُوئے رسوائی نہ تھی



یہ کس نے منتشر کر دیں جنوں سامانیاں میری؟
زمیں سے آسماں تک ایک میں ہوں یا فغاں میری



راس آئی مجھ کو حیرانی مری
اب وہ کرتے ہیں نگہبانی مری
ہو گیا سیراب باغِ آرزو
اللہ اللہ! شبنم افشانی مری



وارداتِ جگرؔ

(دورِ چہارم)

تجھی سے ابتدا ہے، تُو ہی اک دن انتہا ہو گا
صدائے ساز ہو گی اور نہ سازِ بے صدا ہو گا

ہمیں معلوم ہے، ہم سے سنو، محشر میں کیا ہو گا
سب اُس کو دیکھتے ہوں گے، وہ ہم کو دیکھتا ہو گا

سرِ محشر ہم ایسے عاصیوں کا اور کیا ہو گا!
درِ جنّت نہ وا ہو گا، درِ رحمت تو وا ہو گا

جہنم ہو کہ جنّت، جو بھی ہو گا فیصلہ ہو گا
یہ کیا کم ہے، ہمارا اور اُن کا سامنا ہو گا

ازل ہو یا ابد، دونوں اسیرِ زلفِ حضرتؐ ہیں
جدھر نظریں اُٹھاؤ گے، یہی اک سلسلہ ہو گا

یہ نسبت عشق کی بے رنگ لائے رہ نہیں سکتی
جو محبوبؐ خدا کا ہے، وہ محبوبِ خدا ہو گا

اسی امید پر ہم طالبانِ درد جیتے ہیں!
خوشا دردے کہ تیرا درد، دردِ لادوا ہو گا

نگاہِ قہر پر بھی جان دوں، سب کھوئے بیٹھا ہے
نگاہِ مہر عاشق پر اگر ہو گی تو کیا ہو گا

یہ مانا بھیج دے گا ہم کو محشر سے جہنم میں
مگر جو دل پہ گذرے گی، وہ دل ہی جانتا ہو گا

سمجھتا کیا ہے تُو دیوانگانِ عشق کو، زاہد!
یہ ہو جائیں گے جس جانب، اُسی جانب خدا ہو گا

جگرؔ کا ہاتھ ہو گا حشر میں اور دامنِ حضرتؐ
شکایت ہو کہ شکوہ، جو بھی ہو گا، برملا ہو گا



عشق کو بے نقاب ہونا تھا
آپ اپنا جواب ہونا تھا

مستِ[1] جامِ شراب ہونا تھا (قطعہ)
بے خود اضطراب ہونا تھا

تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
ہاں، مجھ کو خراب ہونا تھا

آؤ، مل جاؤ، مُسکرا کے گلے
ہو چکا، جو عتاب ہونا تھا

کوچۂ عشق میں نکل آیا!
جس کو خانہ خراب ہونا تھا

---

1 میں اس پابندی کا مخالف ہوں کہ قطعہ کو مطلع سے شروع نہ ہونا چاہیے (جگرؔ)

مستِ جامِ شراب خاک ہوئے　غرقِ جامِ شراب ہونا تھا
دل کہ جس پر ہیں نقشِ رنگا رنگ　اُس کو سادہ کتاب ہونا تھا
ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈ لیا　آخرش کامیاب ہونا تھا
ہائے وہ لمحۂ سکوں کہ جسے　محشرِ اضطراب ہونا تھا
نگہِ یار خود تڑپ اُٹھتی　شرطِ اوّل خراب ہونا تھا
کیوں نہ ہوتا ستم بھی بے پایاں　کرم بے حساب ہونا تھا
کیوں نظر حیرتوں میں ڈوب گئی　موجِ صد اضطراب ہونا تھا
ہو چکا روزِ اوّلیں ہی، جگرؔ!
جس کو جتنا خراب ہونا تھا



ایک رنگیں نقاب نے مارا　حُسن بن کر حجاب نے مارا
جلوۂ آفتاب کیا کہیے!　سایۂ آفتاب نے مارا
اپنے سینے ہی پر پڑا اکثر　تیر جو اضطراب نے مارا
نگہِ شوق و دعوئ دیدار　اس حجاب الحجاب نے مارا
ہم نے مرتے تیرے تغافل سے　پُرسشِ بے حساب نے مارا
لذتِ دیدِ بے جمال، نہ پُوچھ!　دردِ بے اضطراب نے مارا
چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا　اس ادائے حجاب نے مارا
حشر تک ہم نہ مرنے والوں کو　مرگِ ناکامیاب نے مارا
پاتے ہی اِک اشارۂ نازک　دم نہ پھر اضطراب نے مارا
دل کہ تھا جانِ زیست، آہ! جگرؔ!
اسی خانہ خراب نے مارا



ستم کامیاب نے مارا　کرمِ لاجواب نے مارا
خود ہوئی گم، ہمیں بھی کھو بیٹھی　نگہِ بازیاب نے مارا
زندگی تھی حجاب کے دم تک　بڑھی حجاب نے مارا
عشق کے ہر سکونِ آخر کو　حُسن کے اضطراب نے مارا
خود نظر بن گئے حجابِ نظر　ہائے اس بے حجاب نے مارا
میں تیرا عکس ہوں کہ تو میرا　اس سوال و جواب نے مارا

کوئی پوچھے کہ رہ کے پہلو میں | تیر کیا اضطراب نے مارا
بچ رہا جو تیری تجلّی سے | اس کو تیرے حجاب نے مارا
اب نظر کو کہیں قرار نہیں | کاوشِ انتخاب نے مارا

سب کو مارا جگرؔ کے شعروں نے
اور جگرؔ کو شراب نے مارا



شورشِ کائنات نے مارا | موت بن کر حیات نے مارا
پرتوِ حُسنِ ذات نے مارا | مجھ کو میری صفات نے مارا
ستمِ یار کی دہائی ہے | نگہِ التفات نے مارا
میں تھا رازِ حیات اور مجھے | میرے رازِ حیات نے مارا
ستمِ زیست آفریں کی قسم! | خطرۂ التفات نے مارا
موت کیا؟ ایک لفظِ بے معنی | جس کو مارا، حیات نے مارا
جو پڑی دل پہ، سہہ گئے، لیکن | ایک نازک سی بات نے مارا

شکوۂ موت کیا کریں کہ جگرؔ
آرزوئے حیات نے مارا



عاشق کو غمِ عشق کے آزار نے مارا | ایک یار کو اک یارِ وفا دار نے مارا
تو نے نہ اُٹھایا رُخِ نادیدہ سے پردہ | دنیا کو تری حسرتِ دیدار نے مارا
ہاں اے لبِ جاں بخش! دُہائی ہے دُہائی | انکار سے بڑھ کر ترے اقرار نے مارا
ہونے کو تو ہر مرگِ محبت ہے مُبارک | اے عشق! خوشا وہ کہ جسے یار نے مارا
کیا اُس کی محبت کا ٹھکانا کہ جسے آہ | انکارِ محبت کے بھی اقرار نے مارا
کچھ کہہ تو گیا، برقِ غضب نے جسے پھونکا | اُف کر نہ سکا، جس کو ترے پیار نے مارا

دونوں ہی جفا جو ہیں، جگرؔ، عشق ہو یا حسن
اک یار نے لوٹا، مجھے اک یار نے مارا



عشق کی یہ نمودِ پیہم کیا؟ | ہو تمہیں تم اگر، تو پھر ہم کیا؟
آہِ بیتاب و اشکِ پیہم کیا؟ | نقدِ غم ہے تو حاصلِ غم کیا؟

جو ترے کچھ نظر نہیں آتا — آرزو بن گئی مجسّم کیا!
ترا ملنا، ترا نہیں ملنا — اور جنّت ہے کیا؟ جہنم کیا؟
میں وہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی — عالَمِ ماورائے عالَم کیا؟
ہم ہیں تیرے، ودیعتیں تیری — شکرِ راحت، شکایتِ غم کیا؟
ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں — ورنہ یہ اضطرابِ پیہم کیا؟
کر لیا دل نے عیشِ وصل قبول — پا گیا کچھ شباہتِ غم کیا!
نیتِ شب بخیر، اے ساقی! — بزمِ جسم کیا ہے، ساغرِ جم کیا؟
شوقِ گستاخ کر چکا تقصیر — دیکھتا اب ہے حُسنِ برہم کیا؟
موت کی نیند چھائی جاتی ہے — کہہ چکا ہوں فسانۂ غم کیا؟
ہمہ تن عشق برملا بن جا — درد کی اِک صدائے مُبہم کیا؟
اس نظر میں نہیں سماتا کچھ — جانِ بیتاب و چشمِ پُرنم کیا؟

عشقِ خاموش کے مزے ہیں جگر
جوشِ فریاد و شورِ ماتم کیا؟



کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا، اُن کو پیار آ ہی گیا
جب نگاہیں اُٹھ گئیں، اللہ رے معراجِ شوق! — دیکھتا کیا ہوں، وہ جانِ انتظار آ ہی گیا
ہائے یہ حُسنِ تصوّر کا فریبِ رنگ و بُو — میں یہ سمجھا، جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا
ہاں سزا دے، اے خُدائے عشق، اے توفیقِ غم! — پھر زبانِ بے ادب پر ذکرِ یار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں — در حقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
ہائے، کافر دل کی یہ کافر جُنوں انگیزیاں! — تم کو پیار آئے نہ آئے، مجھ کو پیار آ ہی گیا
درد نے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے — دفعتاً پردہ اُٹھا اور پردہ دار آ ہی گیا
دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ وار — بال بکھرائے کوئی مستانہ[1] وار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا



---

[1] اہلِ فارس ان معنوں میں استعمال نہیں کرتے لیکن میرا ذوق اسے جائز قرار دیتا ہے (جگر)

کس نظر سے آج وہ دیکھا کیا — دل میرا ڈوبا کیا، اُچھلا کیا
حُسن سے بھی دل کو بے پروا کیا — کیا کیا اے عشق! تُو نے کیا کیا؟
تُو نے سو سو رنگ سے پردا کیا — دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا!
وہ بھی نکلی اک شعاعِ برقِ حُسن — میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا
لذّتِ ناکامیابی، الاماں! — تُو نے ہر امروز کو فردا کیا
اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار — اس نے بھی اندازِ دل پیدا کیا
اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی — جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں
میں نے صحرا کو جگر صحرا کیا



دل نے سینے میں تڑپ کر انہیں جب یاد کیا — در و دیوار کو آمادۂ فریاد کیا
وصل سے شاد کیا، ہجر سے ناشاد کیا — اُس نے جس طرح سے چاہا، مجھے برباد کیا
تم میرے رونے پہ روئے، ستم ایجاد کیا — عشق کی رُوح کو آمادۂ فریاد کیا
صبر دو دن نہ ہُوا، روئے، بہت یاد کیا — اب نہ کہنا یہ زباں سے، تجھے آزاد کیا
لاکھ جانیں ہوں تو پھر اُن پہ تصدّق کر دوں — وہ یہ فرمائیں کہ ہم نے اسے برباد کیا
کیا طریقہ ہے یہ صیّاد کا، اللہ اللہ! — ایک کو قید کیا، ایک کو آزاد کیا
ہم کو دیکھو او غمِ فرقت کے نہ سُننے والے — اس بُرے حال میں بھی ہم نے تجھے یاد کیا
اور کیا چاہئے سرمایۂ تسکین، اے دوست! — اک نظروں ڈ کی طرف دیکھ لیا، شاد کیا
شرحِ نیرنگیٔ اسباب کہاں تک کیجئے؟ — مختصر یہ کہ ہمیں آپ نے برباد کیا
پردۂ شوق سے اک برقِ تڑپ کر نکلی — یاد کرنے کی طرح سے انہیں جب یاد کیا
مہرباں ہم پہ رہی چشمِ سخن گو اُن کی — جب ملی آنکھ، نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا
دل کا کیا حال کہوں، جوشِ جنوں کے ہاتھوں — اک گھروند سا بنایا، کبھی، برباد کیا
اب سے پہلے تو نہ تھا ذوقِ محبت رسوا — شاید ان مست نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا
عشق کیوں سوگ مناتا، یہ خوشی کیا کم ہے؟ — دل یہ جس کا تھا، اُسی نے اُسے برباد کیا
بد دُعا تھی کہ دُعا، کچھ نہیں کُھلتا، لیکن — چپکے چپکے لبِ نازک سے کچھ ارشاد کیا



اُس کی نظروں میں انتخاب ہوا
دل عجب حُسن سے خراب ہوا

عشق کا سحر کامیاب ہوا
میں ترا، تُو مرا جواب ہوا

ہر نفس موجِ اضطراب ہوا
زندگی کیا ہوئی، عذاب ہوا

جذبۂ شوق کامیاب ہوا
آج مجھ سے اُنہیں حجاب ہوا

میں بنوں کس لئے نہ مستِ شراب
کیوں مجسّم کوئی شباب ہوا

نگہِ ناز! لے خبر، ورنہ
درد محبوبِ اضطراب ہوا

میری بربادیاں درست، مگر
تُو بتا کیا تجھے ثواب ہوا

عین قربت بھی، عین فرقت بھی
ہائے وہ قطرہ جو حُباب ہوا

مستیاں ہر طرف ہیں آوارہ
کون غارت گرِ شراب ہوا

دل کو چُھونا نہ اسے نسیمِ کرم!
اب یہ دل روکشِ حُباب ہوا

عشقِ بے امتیاز کے ہاتھوں
حُسن خود بھی شکست یاب ہوا

جب وہ آئے تو پیشتر سب سے
میری آنکھوں کو اذنِ خواب ہوا

دل کی ہر چیز جگمگا اُٹھی!
آج شاید وہ بے نقاب ہوا

دورِ ہنگامۂ نشاط نہ پُوچھ
اب وہ سب کچھ خیال و خواب ہوا

تُو نے جس اشک پر نظر ڈالی
جوش کھا کر وہی شراب ہوا

ستمِ خاص یار ہی کی قسم
کرمِ یار بے حساب ہوا



عرضِ نیازِ غم کو لب آشنا نہ کرنا
یہ بھی اک التجا ہے، کچھ التجا نہ کرنا

جب یاد آ گیا ہے، پہروں رُلا گیا ہے
دل کا وہ مجھ سے کہنا، مجھ کو جُدا نہ کرنا

میں خوگرِ ستم ہوں، پروردۂ الم ہوں
جور و جفا کے مالک، مہر و وفا نہ کرنا

دل جب سے مر مٹا ہے، کچھ اور ہی فضا ہے
میری یہ التجا ہے، تم سامنا نہ کرنا

کوئی سمجھ سکے تو کم بخت دل سے سمجھے
دل میں بھی اس کے رہنا، پھر دل میں جا نہ کرنا

دل سے خطا ہوئی تو اب دل ہے اور میں ہوں
نازک معاملہ ہے، تم فیصلا نہ کرنا

یہ رازِ عشق اے دل! ہے رازِ خاص اُن کا
وہ بھی جو تجھ سے پوچھیں، تو اعتنا نہ کرنا

یارب! غمِ محبت سب بخش دے مجھی کو
میرے سوا کسی کو اب مُبتلا نہ کرنا

جتنی ضدیں ہیں اے دل! تُو شوق سے کئے جا
مجھ کو بھی تاقیامت تیرا کہا نہ کرنا

تیرے جگرؔ کی تجھ سے اک التجا یہی ہے
اپنے جگرؔ کو اپنے دل سے جدا نہ کرنا



میرا جو حال ہو سو ہو، برقِ نظر گرائے جا
میں یونہی نالہ کش رہوں، تُو یونہی مسکرائے جا
دل کے ہر ایک گوشہ میں آگ سی اک لگائے جا
مطربِ آتشیں نوا، ہاں اسی دُھن میں گائے جا
لحظہ بہ لحظہ، دم بدم، جلوہ بہ جلوہ آئے جا
تشنۂ حُسنِ ذات ہُوں، تشنہ لبی بڑھائے جا
جتنی بھی آج پی سکوں، عذر نہ کر، پلائے جا
مست نظر کا واسطہ، مستِ نظر بنائے جا
لطف سے ہو کہ قہر سے، ہوگا کبھی تو رُوبرو
اس کا جہاں پتہ چلے، شور وہیں مچائے جا
عشق کو مطمئن نہ رکھ حُسن کے اعتماد پر
وہ تجھے آزما چُکا، تو اُسے آزمائے جا



کیا کر گیا اِک جلوۂ مستانہ کسی کا
رُکتا نہیں زنجیر سے دیوانہ کسی کا
کہتا ہے سرِ حشر یہ دیوانہ کسی کا
جنّت سے الگ چاہیئے ویرانہ کسی کا
آپ میں اُلجھتے ہیں عبث شیخ و برہمن
کعبہ نہ کسی کا ہے، نہ بُت خانہ کسی کا
جس کی نگہِ سادہ کے ہم مارے ہوئے ہیں
وہ شوخ یگانہ ہے نہ بے گانہ کسی کا
بے ساختہ آج اُن کے بھی آنسو نکل آئے
دیکھا نہ گیا حالِ فقیرانہ کسی کا
ہر دل میں غمِ عشق ہے، اقرار در اقرار
ہر لب پہ ہے افسانہ در افسانہ کسی کا
یوں عام نہ کر کیفِ غمِ عشق کو، اے دل!
کم بخت! یہ میخانہ ہے میخانہ کسی کا
اس کو بھی جگرؔ دیکھ لیا خاک میں ملتے
وہ اشک جو تھا گوہرِ یک دانہ کسی کا



جو اب بھی نہ تکلیف فرمایئے گا
تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جایئے گا
نگاہوں سے چھپ کر کہاں جایئے گا؟
جہاں جایئے گا، ہمیں پایئے گا
مرا جب بُرا حال سُن پایئے گا
خراماں خراماں چلے آیئے گا
مٹا کر ہمیں آپ پچھتایئے گا
کمی کوئی محسوس فرمایئے گا
نہیں کھیل ناصح! جنوں کی حقیقت
سمجھ لیجئے گا تو سمجھایئے گا
ہمیں بھی یہ اب دیکھنا ہے کہ ہم پر
کہاں تک توجہ نہ فرمایئے گا؟

ستم عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں — تڑپ جائیے گا، جو تڑپایئے گا
یہ دل ہے، اسے دل ہی بس رہنے دیجئے — کرم کیجئے گا تو پچھتایئے گا
کہیں چُپ رہی ہے زبانِ محبت — نہ فرمایئے گا، تو فرمایئے گا
بُھلانا ہمارا مُبارک مُبارک! — مگر شرط یہ ہے، نہ یاد آیئے گا
ہمیں بھی نہ اب چین آئے گا جب تک — ان آنکھوں میں آنسو نہ بھر لایئے گا
ترا جذبۂ شوق ہے بے حقیقت — ذرا پھر تو ارشاد فرمایئے گا
ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل — کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا؟
یہ مانا کہ دے کر ہمیں رنجِ فرقت (قطعہ) — مداوائے فُرقت نہ فرمایئے گا
محبت محبت ہی رہتی ہے، لیکن — کہاں تک طبیعت کو بہلایئے گا؟
نہ ہو گا ہمارا ہی آغوش خالی — کچھ اپنا بھی پہلُو تہی پایئے گا

جنوں کی جگر! کوئی حد بھی ہے آخر
کہاں تک کسی پر ستم ڈھایئے گا؟



نظر ملا کے، مرے پاس آ کے لُوٹ لیا — نظر ہٹی تھی کہ پھر مُسکرا کے لُوٹ لیا
شکستِ حُسن کا جلوہ دکھا کے لُوٹ لیا — نگاہ نیچی کئے، سر جُھکا کے لُوٹ لیا
دُہائی ہے، مِیرے اللہ کی دُہائی ہے — کسی نے مجھ سے بھی مجھ کو چُھپا کے لُوٹ لیا
سلام اس پہ کہ جس نے اُٹھا کے پردۂ دل — مجھی میں رہ کے، مجھی میں سما کے لُوٹ لیا
اُنہیں کے دل سے کوئی اس کی عظمتیں پُوچھے — وہ اک دل، جسے سب کچھ لُٹا کے لُوٹ لیا
یہاں تو خود تری ہستی ہے عشق کو درکار — وہ اور ہوں گے، جنہیں مُسکرا کے لُوٹ لیا
خوشا، وہ جان، جسے دی گئی امانتِ عشق! — زہے وہ دل، جسے اپنا بنا کے لُوٹ لیا
نگاہ ڈال دی جس پر حسین آنکھوں نے — اسے بھی حسنِ مجسّم بنا کے لُوٹ لیا
بڑے وہ آئے دل و جاں کے لُوٹنے والے — نظر سے چھیڑ دیا، گدگدا کے لُوٹ لیا
رہا خرابِ محبت ہی وہ جسے تُو نے — خود اپنا دردِ محبت بنا کے لُوٹ لیا
کوئی یہ لُوٹ تو دیکھے کہ اُس نے جب چاہا — تمام ہستیِ دل کو جگا کے لُوٹ لیا
کرشمہ سازیِ، حُسنِ ازل، ارے توبہ — مرا ہی آئینہ مجھ کو دِکھا کے لُوٹ لیا

نہ لٹتے ہم، مگر ان مست انکھڑیوں نے، جگرؔ
نظر بچاتے ہوئے، ڈبڈبا کے لُوٹ لیا



نہ راہزن، نہ کسی رہنما نے لُوٹ لیا
اداۓ عشق کو رسمِ وفا نے لُوٹ لیا
نگاہِ لطف کی اک اک ادا نے لُوٹ لیا
وفا کے بھیس میں اُس بے وفا نے لُوٹ لیا
نہ پُوچھ شومئِ تقدیرِ خانہ بربادی!
جمالِ یار کہاں، نقشِ پا نے لُوٹ لیا
کسی بہارِ مجسّم کا آہ کیا شکوہ
مرے ہی اس دلِ رنگیں قبا نے لُوٹ لیا
قسم ہے، تیری پشیماں نگاہیوں کی قسم!
مجھی کو خود مری شرمِ وفا نے لُوٹ لیا
وہ دل کو توڑ کے بیٹھے تھے مطمئن کہ انہیں
شکستِ شیشہ، دل کی صدا نے لُوٹ لیا
قریبِ دل ہی یکایک اُٹھے تھے کچھ فتنے
یہیں کہیں کسی محشر ادا نے لُوٹ لیا
وہ ایک قطرۂ خوں، بچ رہا تھا جو دل میں
اسے بھی گوشۂ چشمِ حیا نے لُوٹ لیا
وہی ہے لَے وہی انداز ہے، وہی آواز
مجھے تو اس دلِ آفت نوا نے لُوٹ لیا
یہی وہ حضرتِ دل ہیں، یہی وہ خضر جنہیں
جنابِ عشق کی اک ''مرحبا'' نے لُوٹ لیا
دلِ تباہ کی رُوداد، اور کیا کہیے!
خود اپنے شہر کو فرماں روا نے لُوٹ لیا
زباں خموش، نظر بے قرار، چہرہ فق
تجھے بھی کیا تری کافر ادا نے لُوٹ لیا
نہ اب خودی کا پتہ ہے، نہ بے خودی کا جگرؔ
ہر ایک لُطف کو لُطفِ خدا نے لُوٹ لیا



اب تو یہ بھی نہیں رہا احساس!
درد ہوتا ہے، یا نہیں ہوتا
عشق جب تک نہ کر چکے رُسوا
آدمی کام کا نہیں ہوتا
ٹوٹ پڑتا ہے دفعتاً جو عشق
بیشتر دیرپا نہیں ہوتا
وہ بھی ہوتا ہے ایک وقت کہ جب
ماسوا، ماسوا نہیں ہوتا
ہائے کیا ہو گیا طبیعت کو؟
غم بھی راحت فزا نہیں ہوتا
دل ہمارا ہے، یا تمہارا ہے
ہم سے یہ فیصلہ نہیں ہوتا
جس پہ تیری نظر نہیں ہوتی
اس کی جانب خُدا نہیں ہوتا
میں کہ بیزار عُمر بھر کے لئے
دل کہ دم بھر جُدا نہیں ہوتا
وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں
جب ہمارا پتہ نہیں ہوتا
دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے!
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

ہو کے اک بار سامنا اُن سے
پھر کبھی سامنا نہیں ہوتا!



شبابِ حُسن کا، حُسنِ شباب دیکھ لیا — اچھال اچھال کے جامِ شراب دیکھ لیا
کہاں تک اب تری باتوں پہ اعتماد کریں — بہت تو اے دلِ خانہ خراب دیکھ لیا
جو ہم نہیں، نہ سہی، کامیاب غم، غمِ یار — تجھے تو اپنی جگہ کامیاب دیکھ لیا
کہیں نہ ہم، تو یہ ہے اپنی مصلحت، ورنہ — ہزار بار تجھے بے نقاب دیکھ لیا
یہی بہت ہے کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے — خرابِ عشق کو اپنے خراب دیکھ لیا
غمِ نشاط و سرورِ الم، نہ پُوچھ جگر
کبھی جب اُس نے یہ چشمِ پُر آب دیکھ لیا



ہر دم دعائیں دینا، ہر لحظہ آہیں بھرنا — اُن کا بھی کام کرنا، اپنا بھی کام کرنا
ہاں کس کو ہے میسّر، یہ کام کر گذرنا — اِک بانکپن سے جینا، اِک بانکپن سے مرنا
تیری عنایتوں سے مجھ کو بھی آچلا ہے — تیری حمایتوں میں ہر ہر قدم گزرنا
ساحل کے لب سے پُوچھو، دریا کے دل سے پُوچھو — اک موجِ تہ نشیں کا مدّت کے بعد اُبھرنا
جو زیست کو نہ سمجھیں، جو موت کو نہ جانیں — جینا انہیں کا جینا، مرنا انہیں کا مرنا
اے شوق تیرے صدقے پہنچا دیا کہاں تک — اے عشق تیرے قرباں، جینا ہے اب نہ مرنا
ہر ذرّہ آہ جس کا لبریزِ تشنگی ہے — اس خاک کی بھی جانب، اے ابرِ تر، گذرنا
دریا کی زندگی پر صدقے ہزار جانیں — مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا
رنگینیاں نہیں تو رعنائیاں بھی کیسی؟ — شبنم سی نازنیں کو آتا نہیں سنورنا
اشکوں کو بھی یہ جرأت، اللہ رے تیری قدرت! — آنکھوں میں آتے آتے پھر دل میں جا ٹھہرنا
اے جانِ ناز! آجا آنکھوں کی رہ سے دل میں — ان خشک ندّیوں سے مشکل ہے کیا گذرنا!
ہم بیخودانِ غم سے یہ راز کوئی سیکھے — جینا، مگر نہ جینا، مرنا، مگر نہ مرنا
کچھ آچلی ہے آہٹ اس پائے ناز کی سی — تجھ پر خدا کی رحمت، اے دل، ذرا ٹھہرنا
خونِ جگر کا حاصل اک شعرِ تر کی صورت
اپنا ہی عکس، جس میں اپنا ہی رنگ بھرنا



شمشیرِ حُسن و عشق کا بسمل بنا دیا
تُم نے تو مُجھ کو پیار کے قابل بنا دیا
ہر جنبشِ نگاہ پہ مائل بنا دیا
میرا ہی مجھ کو مدِّ مقابل بنا دیا
آج اِک حسیں نے رشک کے قابل بنا دیا
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے دل بنا دیا
قاتل نگاہِ ناز نے بسمل بنا دیا
بسمل بنا کے پھر مجھے قاتل بنا دیا
نازک مزاجِ عشق کی اللہ ری خاطریں!
اپنی نزاکتوں کو مرا دل بنا دیا
ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق کی ہی مار!
اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا
دکھلا کے ایک جلوہ سراپائے حُسن کا
آنکھوں کو اعتبار کے قابل بنا دیا
دونوں جہاں تو اپنی جگہ پر ہیں برقرار
کیا چیز تھی کہ جس کو مرا دل بنا دیا



اس چشمِ مست نے مجھ مخمور کر دیا
میں نے نظر ملا کے اُسے چُور کر دیا
میں ان کا ہو گیا، انہیں مسرُور کر دیا
وہ میرے بن گئے، مجھے مغرُور کر دیا
سر شار و مست، بے خود و مخمُور کر دیا
خود ہو گئے قریب، مجھے دُور کر دیا
اک وہم اعتبار سہی دو جہاں، مگر
اس اعتبارِ وہم نے مجبُور کر دیا
ہُشیار، او نگاہِ ستم آشنائے دوست!
شیشہ نہیں ہے دل کہ جسے چُور کر دیا
وہ اور نازِ عشق گوارا کریں، مگر
اتنے کھچے ہم اُن سے کہ مجبُور کر دیا
اب حُسن کو بھی آنچ سے اس کی مفر نہیں
اتنا مزاجِ عشق کو مغرُور کر دیا
یہ عشق وہ بلا ہے کہ حُسنِ ازل کو بھی
تخلیقِ کائنات پہ مجبور کر دیا
اُن کو بھی نازِ فتح اگر ہو، تو بات ہے
مجھ کو تو ہر شکست نے مغرُور کر دیا
فیضِ جمالِ دوست کے قُربان جایئے
اک اک نفس کو صاعقۂ طُور کر دیا
مُدّت کے بعد آج تو موجِ نسیم نے
ٹوٹے ہوئے دلوں کو بھی مسرُور کر دیا
حُسنِ ازل تو آج بھی بے پردہ ہے، مگر
نظارہ کے ہجُوم نے مستُور کر دیا
توبہ تو کر چکا تھا، مگر اس کا کیا علاج
واعظ کی ضد نے پھر مجھے مجبُور کر دیا



اب کہاں زمانے میں دُوسرا جواب اُن کا؟
فصلِ حُسن ہے اُن کی، موسمِ شباب اُن کا
اوج پر جمال اُن کا، جوش پر شباب اُن کا
عہد ماہتاب اُن کا، دور آفتاب اُن کا

عرضِ شوق پر میری پہلے کچھ عتاب اُن کا
خاص اِک ادا کے ساتھ اُف وہ پھر حجاب اُن کا
رنگ و بُو کی دُنیا میں اب کہاں جواب اُن کا؟
عشق فرشِ بزم اُن کا حُسن فرشِ خواب اُن کا
ہم سے پُوچھ اے ناصح! دل گرفتگی اُن کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ پُر آب اُن کا
پُھول مسکراتے ہیں، دل پہ چوٹ پڑتی ہے
ہائے وہ رُخِ خنداں، اُف رے وہ شباب اُن کا
یونہی کھلتے جاتے ہیں حسن و عشق کے اسرار
اک نفس سوال اپنا، اک نفس جواب اُن کا
کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبطِ حُسن و عشق!
شوقِ نارسا اپنا، نازِ کامیاب اُن کا
اس طرح سے ہوں غارت، ہائے! عشق کی غفلت
جاں کہ ہے صدا اُن کی، دل کہ ہے رُباب اُن کا
رنگ و بُو کے پردے میں کون پُھوٹ نکلا ہے؟
چھپ سکا چھپائے سے کیا کہیں شباب اُن کا
ضبط کا جنہیں دعویٰ عشق میں رہا اکثر
ہم نے حال دیکھا ہے بیشتر خراب اُن کا
اور کس کی یہ طاقت، اور کس کی یہ جُرأت؟
عشق آپ آڑ اپنی، حُسن خود حجاب اُن کا
کہئے حالِ دل، لیکن دیکھیئے کن آنکھوں سے
ہر سکون کے پردے میں حشرِ اضطراب اُن کا
عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا
جیسے حُسن[1] کی دیوی جھانکتی ہو چلمن سے
نیم وا سی آنکھوں میں اُف وہ کیفِ خواب اُن کا
عرضِ غم نہ کر اے دل، دیکھ ہم نے کہتے تھے
رہ گئے وہ تو "اُونھ" کر کے، سن لیا جواب اُن کا
تو جگر جو رُسوا ہے، تُو ہی آہ رُسوا رہ
نام تو نہ کر رُسوا، خانماں خراب، اُن کا

تو جگر سے مستوں پر طعن نہ کر اے واعظ!
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اُن کا



تم اس دلِ وحشی کی وفاؤں پہ نہ جانا
اپنا نہ رہا جو، وہ کسی کا نہ رہے گا
مٹ جائے گی جس دن مرے سجدوں کی حقیقت
دنیا میں ترا نقشِ کفِ پا نہ رہے گا
بے پردگیٔ حُسن سے ہیں سب یہ حجابات
پردہ جو گرا دوں گے تو پردا نہ رہے گا
وہ لاکھ مٹاتے رہیں دُنیائے تمنا
کہتے ہیں جسے دل، کبھی تنہا نہ رہے گا
مانا لبِ نازک کو وہ تکلیف نہ دیں گے
آنکھوں سے بھی کیا کوئی اشارا نہ رہے گا
اللہ! یہ ساون کی گھٹائیں، یہ ہوائیں
کیا آج بھی شغلِ مے و مینا نہ رہے گا

---

1. میں تشبیہات واستعارات کو بالطبع پسند نہیں کرتا اور ان چیزوں کی بہتات کو عجزِ طبع کی دلیل سمجھتا ہوں۔ تاہم کہیں کہیں بے اختیارانہ اس طرح کے اشعار بھی کہہ گیا ہوں۔ لیکن اکثر خاص قسم کی ندرت اور جدت کے ساتھ۔ (جگر)

اسی چمن میں ہمارا بھی اک زمانہ تھا
یہیں کہیں کوئی سادہ سا آشیانہ تھا

الٰہی توبہ! میں اِس جذبِ دل سے باز آیا
کہ آج اس کا ہر انداز والہانہ تھا

شباب و عشق کا اپنا بھی اک زمانہ تھا
خبر نہیں کہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا

خوشا وہ دَور کہ جب عشق ہی زمانہ تھا
نہ دشت و در تھے، نہ گلشن، نہ آشیانہ تھا

تمہیں گذر گئے دامن بچا کے، ورنہ یہاں
وہی شباب، وہی دل، وہی زمانہ تھا

چمن چمن تھا مری چشمِ شوق میں جب تک
شرار و برق کے سائے میں آشیانہ تھا

کہاں کے حُسن و محبت، کہاں کے مہر و وفا
بس ایک سحرِ جوانی تھا اور زمانہ تھا

مٹا مٹا سہی ظالم! وہ دل تھا میرا دل
بجھا بجھا سہی، پھر بھی چراغ خانہ تھا

نصیب اب تو نہیں شاخ بھی نشیمن کی
لدا ہُوا کبھی پھولوں سے آشیانہ تھا

کہاں کا واقعہ، اتنا تو یاد ہے اب تک
نگاہ مل کے ہٹی تھی کہ دل نشانہ تھا

نظر نے اور کیا کیا، حصُولِ غم کے سوا
کہ ربطِ خاصِ محبت تو غائبانہ تھا

تری قسم، ارے او جلد روٹھنے والے!
غرورِ عشق نہ تھا، نازِ عاشقانہ تھا

بُھلا دیا ہمیں تو نے، تو رنج کیا، لیکن
ہمیں بھی تیری محبت کو بُھول جانا تھا

سمندِ عشق کہاں، سیر گاہِ شوق کہاں
کہ ہر نفس رہِ منزل میں تازیانہ تھا



ہر اک جان و تن میں سماتا چلا جا
محبت کی بستی بساتا چلا جا

مئے شوق پیتا، پلاتا چلا جا
یونہی لُوٹتا چل، لُٹاتا چلا جا

قدم والہانہ بڑھاتا چلا جا
جدھر سے گذر، مُسکراتا چلا جا

نہیں یہ کہ بچتا بچاتا چلا جا
محبت کی ہر چوٹ کھاتا چلا جا

مبارک یہ عزمِ سفر تجھ کو، لیکن
رُلاتا اُٹھا ہے، ہنساتا چلا جا

شبابِ محبت کو خود لُوٹتا چل
شبابِ محبت لُٹاتا چلا جا

ترے ہر نفس میں ہزار آندھیاں ہیں
انہیں آندھیوں کو اُٹھاتا چلا جا

محبت کے دریا کا طوفان بن کر
خس و خار کو بھی بہاتا چلا جا

قیودِ دو عالم سے آزاد ہو کر
حدودِ محبت بڑھاتا چلا جا

زمانہ کے ہم دوش و ہم راہ کب تک
زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا

یہ سب کہہ کے در پردہ رازِ حقیقت
جگرؔ یوں نہ دامن بچاتا چلا جا



عشق بن کے محشر میں حُسن کامیاب آیا — خاک کی تھی جو دُنیا، خاک ہی میں داب آیا
یہ بھی کیا محبت میں دورِ انقلاب آیا — اس طرف اُٹھتی نظریں، اُس طرف حجاب آیا
حُسن کی حقیقت میں اس طرح شباب آیا — جیسے کچی نیند اُٹھ کر کوئی مستِ خواب آیا
حشر در جلو آیا، نشر در رکاب آیا — حُسن کی کھلی آنکھیں، عشق کا شباب آیا
گودیوں میں عصمت کی کھیلتا شباب آیا — شوخیوں کے جھرمٹ میں شاہدِ حجاب آیا
اک لفافۂ رنگیں، ایک پرچۂ سادہ — اے دلِ سکوں دشمن! لے ترا جواب آیا
تم سے میں اگر کہہ دوں، کیا ہی تم کو رشک آئے — راتِ جو نظر مجھ کو اِک حسین خواب آیا
تُو وہ نغمہ چھیڑ اے دل، سب کہیں کہ گلشن میں — ہر گلِ فسردہ پر اِک نیا شباب آیا
وہ جھکی جھکی پلکیں، وہ عرق عرق عارض — شکوۂ ستم کرکے خود مجھے حجاب آیا

دھیان ترا کیا آیا، جانِ صد بہار آئی
یاد تیری کیا آئی، حاصلِ شراب آیا



خدایا اس مرض کی ہے دوا کیا — کہ ہم کیا ہیں، ہمارا مدّعا کیا
جنونِ عشق میں اچھا، بُرا کیا — روا کہتے ہیں کس کو، ناروا کیا
سراپا حُسن کا آئینہ بن کر — ہمیں ہم ہیں، ہمارا پُوچھنا کیا
محبت خود برس پڑتی ہے اکثر — بیانِ شوق و عرضِ التجا کیا
مجسّم ساز بے آواز بن جا — کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کیا
جدھر دیکھو، ہمیں ہم ہیں، وہی وہ — اب ان کا اور ہمارا پُوچھنا کیا

اگر ہے جستجوئے زندگانی!!
تو آخر زندگانی کا مزا کیا



ہاں نگاہِ شوق، وہ اُٹھی نقاب — "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"
شوقِ بے پایاں و جوشِ بے حساب — عشق کیا ہے، اِک مسلسل اضطراب
دستِ رنگین و جمالِ بے حجاب — اے خوش آں دقتے وخوش جامِ شراب

لکھ چکے خط، جا چکا خط کا جواب
اضطراب و اضطراب و اضطراب
آج کچھ اپنا پتا ملتا نہیں
میں کہاں ہوں، او نگاہِ بازیاب؟
کچھ کہوں، تو کیا کہوں، کس سے کہوں؟
میں ہی خود اپنا سوال، اپنا جواب
میری ہستی ہے، غبارِ کوئے دوست
مجھ سے پیدا ہر سکوں، ہر اضطراب
پوچھنا کیا؟ چشمِ بینا ہو تو دیکھ
دل کے ہر ذرّے میں ہیں لاکھ آفتاب
ہوش ہے پھر مائلِ فرزانگی
لاشراب او مست ساقی، لاشراب
میرے جام و بادہ کی رنگینیاں
جانتا ہے حُسن کا ظالم شباب
غرق موجِ بادہ کردے ساقیا!
تاکجا میں؟ اور دُنیائے خراب
جاں سراپا، کچھ ہے راحت، کچھ خلش
دل مجسّم، کچھ سکوں، کچھ اضطراب
عشق کیاہے؟ پرتوِ حُسنِ تمام
شوق کیا ہے؟ حُسن کا عکسِ شباب
ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منہ بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

مختصر ہے شرحِ ہستی، اے جگر
زندگی ہے خواب، اجل تعبیرِ خواب



میرا جنونِ شوق، وہ عرضِ وفا کے بعد
وہ شانِ احتیاط تری ہر ادا کے بعد
تیری خبر نہیں، مگر اتنی تو ہے خبر!
تُو ابتدا سے پہلے ہے، تُو انتہا کے بعد
شاید اسی کا نام مقامِ فنا نہ ہو
نازک سا ہوتا جاتا ہے دل ہر صدا کے بعد
گو دل سے تنگ ہوں، مگر آتا ہے یہ خیال
پھر جی کے کیا کروں گا دلِ مبتلا کے بعد

ہاں پھر انہیں حسین نگاہوں کا واسطہ
تھوڑا سا زہر بھی مری خاطر دَوا کے بعد



کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں ہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر
مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر
جنہیں کہیئے عشق کی وسعتیں، جو ہیں خاص حُسن کی عظمتیں
یہ اُسی کے قلب سے پوچھیئے، جسے فخر ہو غمِ یار پر

مرے اشکِ خُوں کی بہار ہے کہ مرقعِ غمِ یار ہے
مری شاعری بھی نثار ہے، مری چشمِ سحر نگار پر
عجب انقلابِ زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہ ہی اب جو بار ہے دوش پر، یہی سر تھا زانوئے یار پر
یہ کمالِ عشق کی سازشیں، یہ جمالِ حسن کی نازشیں
یہ عنایتیں، یہ نوازشیں، مری ایک مُشتِ غبار پر
مری سمت سے اُسے اے صبا! یہ پیامِ آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر
یہ فریبِ جلوہ ہے سر بسر، مجھے ڈر یہ ہے، دلِ بے خبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر، انہیں چند نقش و نگار پر
میں رہینِ درد سہی مگر، مجھے اور چاہیے کیا جگر؟
غمِ یار ہے مرا شیفتہ، میں فریفتہ غمِ یار پر



ہجومِ تجلّی سے معمور ہو کر — نظر رہ گئی شعلہ طور ہو کر
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر — بہت پاس نکلے، بہت دُور ہو کر
بس اک نشۂ عشق میں چُور ہو کر — پڑے رہیئے اس در پہ مجبور ہو کر
کہیں اُن کے روکے سے رُکتے ہیں وحشی! — نہ مجبور کر دیں، جو مجبور ہو کر
وفا پر ہزار ایسی جانیں تصدق — اگر رہ نہ جائے یہ دستور ہو کر
تمہیں بھی خبر ہے جو تم کہہ گئے ہو؟ — خود اپنی اداؤں سے مسحور ہو کر



شبِ غم بھی تیری توجہ کے صدقے — نمایاں ہوئی، مطلعِ نُور ہو کر
سُنانے چلے ہیں اُنہیں قصۂ غم — بہت دل کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر
سنبھل جائیں آسودگانِ محبت — نگاہیں اُٹھیں شورِ منصور ہو کر
نظر عیشِ فانی پہ کیا خاک ڈالیں — ترے درد مندانِ مجبور ہو کر؟
خبر بھی ہے، تم کیا سے کیا ہو گئے ہو — زسرتا قدم حُسنِ مجبور ہو کر
وہی نُور میں ہے، وہی نار میں ہے — کبھی نار ہو کر، کبھی نُور ہو کر

تجاہل، تغافل، تبسّم، تکلّم یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر
ترے حُسنِ مغرور سے نسبتیں ہیں کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر
جگر کی اداؤں کا اب پوچھنا کیا
تری مست نظروں سے مخمور ہو کر



نویدِ بخششِ عصیاں سے شرمسار نہ کر گُناہ گار کو یا رب! گناہ گار نہ کر
نظر ملی ہے، تو اس کو بہار ساز بنا نظر کو مائلِ رنگینیٔ بہار نہ کر
کہاں کی قربت و فرقت، گذر بھی جا اے دل! یہ راہِ عام ہے، تو اس کو اختیار نہ کر
بہار اپنی جگہ پر، سدا بہار رہے
یہ چاہتا ہے تو تجزیہ[1] بہار نہ کر



عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ ماہتاب، آفتاب ہیں ہم لوگ
گرچہ اہلِ شراب ہیں ہم لوگ (قطعہ) یہ نہ سمجھو، خراب ہیں ہم لوگ
شام سے آگئے جو پینے پر صبح تک آفتاب ہیں ہم لوگ



ہم کو دعوائے عشق بازی ہے مستحقِ عذاب ہیں ہم لوگ
ناز کرتی ہے خانہ ویرانی ایسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ
ہم نہیں جانتے خزاں کیا ہے کشتگانِ شباب ہیں ہم لوگ
تو ہمارا جواب ہے تنہا! (قطعہ) اور تیرا جواب ہیں ہم لوگ
تو ہے دریائے حُسن و محبوبی شکلِ موجِ جناب ہیں ہم لوگ
گو سراپا حجاب ہیں، پھر بھی تیرے رُخ کی نقاب ہیں ہم لوگ
خوب ہم جانتے ہیں اپنی قدر تیرے ناکامیاب ہیں ہم لوگ
ہم سے غفلت نہ ہو تو پھر کیا ہو؟ رہروِ مُلکِ خواب ہیں ہم لوگ
جانتا بھی ہے اُس کو تُو، واعظ! جس کے مست و خراب ہیں ہم لوگ

---

[1] اس لفظ کو یقیناً مشدد طریقہ پر کہنا درست نہیں لیکن محض اس مکتبی غلطی کی خاطر اپنے لطیف شعر کو ضائع نہیں کرسکتا (جگر)

ہم پہ نازل ہوا صحیفۂ عشق! صاحبانِ کتاب ہیں ہم لوگ
ہر حقیقت سے جو گزر جائیں وہ صداقت مآب ہیں ہم لوگ
جب ملی آنکھ، ہوش کھو بیٹھے کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ
ہم سے پوچھ جگرؔ کی سرمستی
محرمِ آں جناب ہیں ہم لوگ



تو بھی او ناآشنائے دردِ دل! کاش ہوتا مبتلائے دردِ دل
اللہ اللہ! انتہائے دردِ دل! اب تمہیں تو ہو بجائے دردِ دل
اس نظر کی بے قراری، آہ آہ! باش او گستاخ ادائے دردِ دل
دردِ دل میرے لئے گر ہے، تو ہو میں نہیں ہرگز برائے دردِ دل
ذرّہ ذرّہ ہے قیامت گاہِ عشق صاف سنتا ہوں صدائے دردِ دل
جس طرف وہ شوخ نظریں اُٹھ گئیں لے اُڑی موجِ ہوائے دردِ دل
مجھ سے شاید رہ نہ جائے کچھ کمی! آپ ہی دے لیں سزائے دردِ دل
کچھ تغافل، کچھ توجہ، کچھ غرور دیکھنا شانِ عطائے دردِ دل
دردِ دل! غیرت تری کیا ہو گئی؟
ان لبوں پر، اور ہائے دردِ دل!



اب تو نامِ عشق سے بھی سخت گھبراتا ہے دل اے مرے اللہ! کیا سے کیا ہُوا جاتا ہے دل
کیا بتائیں، دل سے مل کر کیا غضب ڈھاتا ہے دل جس طرح آندھی کوئی آتی ہے، یوں آتا ہے دل
رہ گیا ہے اب تو بس اتنا ہی ربط اک شوخ سے سامنا جس وقت ہو جاتا ہے، بھر آتا ہے دل
دل تو سینے ہی میں رہتا ہے، مگر اُس کے حضور جیسے اب جاتا ہے دل سینے سے، اب جاتا ہے دل
جب ستم ہی مدّعا ٹھہرا، ستم بھی کیا ضرور کچھ نہ کچھ تسکین سی یوں بھی تو پا جاتا ہے دل
سامنے اُن کے ہمیں سے اس کی ظالم شوخیاں وہ نہیں ہوتے، تو کیا نادان بن جاتا ہے دل
رحم بھی، غصّہ بھی، کیا کیا آہ آتا ہے جگرؔ! خود تڑپ کر عشق میں جب مجھ کو تڑپاتا ہے دل



حسنِ معنی کی قسم، جلوۂ صورت کی قسم تُو ہی فردوس ہے، فردوسِ محبت کی قسم
حُسن کے معجزۂ وحدت و کثرت کی قسم چشمِ حیرت میں ہے سب کچھ، میری حیرت کی قسم

تجھ کو دیکھا، مگر اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں — اپنی کم مائگیٔ جرأت و ہمت کی قسم
مجھ سے کچھ دل نے کہا تھا ابھی سچ ہو کہ نہ ہو — حسنِ کافر! تیری معصوم شرارت کی قسم
ظلم کیا، اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو — تیری اس اشک بھری چشمِ ندامت کی قسم
اک نظر دیکھ تو لے، پھول کھلے ہیں کیا کیا! — ناوکِ غم کی قسم، سینۂ حسرت کی قسم
دل کی دُنیا پہ ہے اک اور ہی عالم طاری — نگہِ ناز کے اقرارِ محبت کی قسم
تُو بھی اب سامنے آئے تو لٹا دوں تجھ پر — تیری غیرت کی قسم، اپنی حمیّت کی قسم
مجھ سے چھپنا تجھے زیبا نہیں، اے پیکرِ حُسن! — میں محبت ہی محبت ہوں، محبت کی قسم
نگہِ حُسن ہی سے حُسن کو ہم دیکھتے ہیں! — مذہبِ عشق کی پاکیزہ شریعت کی قسم
تیرا احسان مٹانا ہے، مٹا دے مجھ کو — کون کھائے گا تری چشمِ مروّت کی قسم
اک ترے واسطے خود عشق ہے جنّت بکنار — شبنمِ اشک و گُلِ داغِ محبت کی قسم
اب ترے حُسن کے جلوے نہیں روکے رُکتے — نگہ شوق کی بیتاب طبیعت کی قسم
صبحِ عشرت بھی جواب آئے تو دیکھوں نہ اُسے — اپنی محبوبۂ شامِ شبِ فرقت کی قسم
اب تجھے میری محبت کا یقیں ہو کہ نہ ہو — میں نہ کھاؤں گا ترے دردِ محبت کی قسم
تو بھی اب وہ نہیں جو خود کو نظر آتا ہے — سینۂ عشق کی پوشیدہ امانت کی قسم
نگہِ ناز میں سب کچھ تو ہے، یہ بات کہاں؟ — خلشِ درد! ترے حُسنِ نزاکت کی قسم
اب تجھے دیکھ کے مرنا بھی گوارا ہے مجھے — غمِ عشرت کی قسم، اشکِ مسرت کی قسم
تیرے ہمراہ ہیں جان و دل و ایماں سب کچھ — تیری آنکھوں کے پیامِ دمِ رخصت کی قسم
اب بھی ہیں تیرے تصوّر سے وہی راز و نیاز — اپنے اُجڑے ہوئے آغوشِ[1] محبت کی قسم

خلوتِ خاص کو اک دن تو بنا دے جلوت
تجھ کو اپنے جگرِ شوخ طبیعت کی قسم



اب اُن کا کیا بھروسہ، وہ آئیں یا نہ آئیں — آ، اے غمِ محبت! تجھ کو گلے لگائیں
بیٹھا ہوں مست و بیخود خاموش ہیں فضائیں — کانوں میں آ رہی ہیں بھُولی ہوئی صدائیں
سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں — اشکوں کی آرزوئیں، آنکھوں کی التجائیں

---

[1] ایک شخص نے آغوش کی تذکیر پر اعتراض کیا تھا۔ مگر اُن کا اعتراض غلط ہے۔ تذکیر و تانیث دونوں طرح جائز ہے اور کہا جاتا ہے (جگرؔ)

عشاق پا رہے ہیں ہر جرم پر سزائیں
انعام بٹ رہے ہیں، مغرور ہیں خطائیں

اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا، لیکن نظر نہ آئیں

مسجد میں معتکف ہیں بے کاری ہی تو زاہد
دو روزہ زندگی ہے آئیں، پئیں، پلائیں

اس حسنِ برق وش کے دلِ سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے بھی جو کھیلیں، دامن کو بھی بچائیں

عاشق خرابِ ہستی، زاہد خرابِ تمکین
وہ بھی ترے کرشمے، یہ بھی تری ادائیں

جیسا وہ چاہتے ہیں، جو کچھ وہ چاہتے ہیں
آتی ہیں میرے دل سے لب تک وہی دعائیں

اک جامِ آخری تو پینا ہے اور، ساقی
اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں

اب ہاتھ مل رہے ہیں، وہ خاکِ عاشقاں پر
برباد کر چکے جب اپنی ہی کچھ ادائیں

آلودہ خاک ہی تو رہنے دے اس کو ناصح
دامن اگر جھٹک دوں، جلوے کہاں سمائیں

بیتابیِ محبت وجہِ سکونِ غم ہے
آغوشِ مضطرب میں خوابیدہ ہیں بلائیں

اشعار بن کے نکلیں جو سینۂ جگر سے
سب حسنِ یار کی تھیں، بے ساختہ ادائیں



کدھر ہے تیرا خیال اے دل! یہ وہم کیا کیا سما رہے ہیں!
نظر اٹھا کر تو دیکھ، ظالم! کھڑے وہ کیا مسکرا رہے ہیں!

تمام ہستی پہ چھا رہے ہیں، وہ جیسے خود ہیں، بنا رہے ہیں
نظر نظر میں سما چکے ہیں، نفس نفس میں سما رہے ہیں

کرشمے، ذات وصفات کے ہیں، جمالِ قدرت دکھا رہے ہیں
کہ ہر تصور سے دور رہ کر، وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں

کہاں کا دیدار، کس کا عرفاں، حواس گم ہیں، نظر پریشاں
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں، تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

یہ حادثاتِ زمانہ کیا ہیں، اسی کے حسنِ طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر، دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں

کرشمے ہیں حسنِ بے جہت کے، فسوں میں چشمِ مناسبت کے
ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں، ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں

نفس نفس میں صفاتِ تازہ، مماتِ تازہ، حیاتِ تازہ
انہیں میسر ہے ذاتِ تازہ، جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں

(قطعہ)

ہماری ہستی تمام آفت، تمام زحمت، تمام کُلفت
اگر یہ سچ ہے تو فی الحقیقت ہمیں خود اُن کو ستا رہے ہیں
ہوا کچھ ایسی ہی چل گئی ہے، دلوں کی دُنیا بدل گئی ہے
وہ ہم کو مطلوب کہہ رہے ہیں، ہم اُن کو طالب بتا رہے ہیں!
ذرا سا اِک وقفۂ محبت، اُٹھا گیا اور ہی قیامت
ابھی ہم آنسو بہا رہے تھے، ابھی وہ آنسو بہا رہے ہیں!
خوشا یہ پندارِ عشق اپنا، زہے شکستِ غرور اُن کا
وہ ہم سے نظریں ملا رہے ہیں، ہم اُن سے نظریں ہٹا رہے ہیں
نظر نظر التجائے پیہم، ادا ادا شکوۂ مجسم!
ذرا جو بن کر بگڑ رہے ہیں، ہمیں وہ کیا کیا منا رہے ہیں
گلوں سے مستی چھلک رہی ہے، سراپا بلبل چہک رہی ہے
جگر کسی گوشۂ چمن میں، غزل کوئی اپنی گا رہے ہیں



کرم کوشیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں — بس اک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں
چمن سوز گلشن کی گلکاریاں ہیں — یہ کس سوختہ دل کی چنگاریاں ہیں
نہ بے ہوشیاں، اب نہ ہُشیاریاں ہیں — محبت کی تنہا فسوں کاریاں ہیں
نہ وہ مستیاں ہیں، نہ سرشاریاں ہیں — خودی کا ہے احساس، خود داریاں ہیں
محبت اثر کرتی ہے چُپکے چُپکے — محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں
نگاہِ تجسّس نے دیکھا جہاں تک — پرستاریاں ہی پرستاریاں ہیں
تجلّی سے کہہ دو، ذرا ہاتھ روکے — بہت عام اب دل کی بیماریاں ہیں
نہ آزاد دل ہیں، نہ بے قید نظریں — گرفتاریاں ہی گرفتاریاں ہیں
نہ ذوقِ تخیّل، نہ ذوقِ تماشا — محبت ہے اب اور بیزاریاں ہیں
تغافل ہے اک شانِ محبوب، لیکن — تغافل میں پنہاں خبرداریاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں تازہ اشعارِ رنگیں — تری اک توجّہ کی گلکاریاں ہیں
ازل سے ہے صرفِ دُعا ذرّہ ذرّہ — خدا جانے کیا کچھ طلب گاریاں ہیں

بجھے جا رہے ہیں کبھی دیدہ و دل   تری آمد آمد کی تیاریاں ہیں
قدم ڈگمگائے، نظر بہکی بہکی!   جوانی کا عالم ہے، سرشاریاں ہیں
جگر زندگی لطف سے کٹ رہی ہے   غم آزاریاں ہیں، جنوں کاریاں ہیں

کہاں پھر یہ مستی، کہاں ایسی ہستی؟
جگر کی جگر تک ہی مے خواریاں ہیں



خطاؤں سے پہلے پشیمانیاں ہیں   محبت کی معصوم نادانیاں ہیں
قیامت، تری جلوہ سامانیاں ہیں   جدھر دیکھتا ہوں، پریشانیاں ہیں
دل و جان و حسرت ہیں، قربانیاں ہیں   خوشا وہ کہ جس کی یہ مہمانیاں ہیں
مسلسل غمِ دل کی عریانیاں ہیں   نگاہیں نہیں ہیں، پریشانیاں ہیں
سنا کر غم و درد پچھتا رہا ہوں   پشیمانیوں کی پشیمانیاں ہیں
ازل سے جو دل کے مقدر پڑی تھیں!   وہی آج تک شعلہ سامانیاں ہیں
دلوں پر حکومت، نگاہوں سے پردے   (قطعہ) جہانبانیاں ہیں، ستم رانیاں ہیں
تجسس میں شامل، تحیر میں پنہاں   نظر سوزیاں ہیں، نگہبانیاں ہیں



وہ دشواریاں عشق کی حل ہوں کیونکر؟   جو دشواریاں ہیں نہ آسانیاں ہیں
محبت کے جلوے نہیں حسن سے کم   انہیں بھی میرے ساتھ حیرانیاں ہیں
ترے جلوۂ جزوِ کل کے تصدق   پریشانیوں کو پریشانیاں ہیں
غضب میں پھنسی ہیں مرا ساتھ دے کر   نہ اب حسرتیں ہیں، نہ حیرانیاں ہیں

درِ بت کدہ اور سجدوں پہ سجدے
جگر ! واہ، کیا کفر سامانیاں ہیں!



نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں   ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں
شروعِ راہِ محبت، ارے معاذ اللہ!   یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
یہ نازِ حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر!   نظر ملاتے نہیں، مسکرائے جاتے ہیں
مرے جنونِ تمنا کا کچھ خیال نہیں   لجائے جاتے ہیں، دامن چھڑائے جاتے ہیں
جو دل سے اُٹھتے ہیں شعلے وہ رنگ بن بن کر   تمام منظرِ فطرت پہ چھائے جاتے ہیں

میں اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ میں بھی
تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں
رواں دواں لئے جاتی ہے آرزوئے وصال
کشاں کشاں ترے نزدیک آئے جاتے ہیں
کہاں منازلِ ہستی، کہاں ہم اہلِ فنا!
ابھی کچھ اور یہ تہمت اُٹھائے جاتے ہیں
مری طلب بھی، اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں
الٰہی ترک محبت بھی کیا محبت ہے!
بھلاتے ہیں اُنہیں، وہ یاد آئے جاتے ہیں
سنائے تھے لبِ نَے سے کسی نے جو نغمے
لبِ جگرؔ سے مکرّر سنائے جاتے ہیں



نیازِ عاشقی کو ناز کے قابل سمجھتے ہیں
ہم اپنے دل کو بھی اب آپ ہی کا دل سمجھتے ہیں
عدم کی راہ میں رکھا ہے پہلا ہی قدم میں نے
مگر احباب اس کو آخری منزل سمجھتے ہیں
قریب آ آ کے منزل تک پلٹ جاتے ہیں منزل سے
نہ جانے دل میں کیا آوارہ منزل سمجھتے ہیں
الٰہی! ایک دل ہے، تو ہی اس کا فیصلہ کر دے
وہ اپنا دل بتاتے ہیں، ہم اپنا دل سمجھتے ہیں



کیا غرض مجھ کو ترے دل پہ اثر ہے کہ نہیں
میں پرستارِ محبت ہوں، خبر ہے کہ نہیں؟
نہیں معلوم محبت میں اثر ہے کہ نہیں
جو اِدھر سے مری حالت وہ اُدھر ہے کہ نہیں؟
میں نہ کھاؤں گا کبھی حسنِ تغافل کے فریب
مری جانب تری دز دیدہ نظر ہے کہ نہیں؟
اب یہ عالم ہے کہ جو ہجر کی شب آتی ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ اس شب کو سحر ہے کہ نہیں؟
پوچھ مجھ سے نہ مرے زخمِ جگر کی حالت
میرے دامن میں ہر آنسو گلِ تر ہے کہ نہیں؟
تو ہی کہہ دے کہ جنوں مجھ کو نہ کیونکر ہو عزیز
اس کو حاصل تری تائیدِ نظر ہے کہ نہیں؟
وصل کہتے ہیں جسے اس کی حقیقت معلوم
ورنہ اک سلسلۂ شام و سحر ہے کہ نہیں؟
اک نظر دیکھ تو لے، دل کے مٹانے والے
ابھی اِس خاک میں طوفانِ شرر ہے کہ نہیں؟
پوچھتا پھرتا ہوں اک ایک سے اس کوچے میں
جس کا دیوانہ ہوں، اس کو بھی خبر ہے کہ نہیں؟
اور درکار ہے کیا تیری توجہ کے لئے؟
آہ ظالم، مری محروم اثر ہے کہ نہیں؟
عشق بے جذب ہوئے رہ نہیں سکتا ہرگز
تیری ہر شان میں اِن شانِ جگر ہے کہ نہیں؟

لے اُٹھا جاتا ہوں میں جھاڑ کے دامن اپنا
پھر نہ کہنا مرا دیوانہ جگر ہے کہ نہیں؟



ترے بیان میں قاصد کچھ اشتباہ نہیں
جز ایں قدر کہ یہ فرمودۂ نگاہ نہیں

نہ ہو، جو حسن کی ہم پر کوئی نگاہ نہیں
ہم اہلِ عشق ہیں، پابندِ رسم و راہ نہیں

خود اپنے حُسن کی تاثیر کو وہ کیا جانے؟
تری نگاہ سے ظالم، مری نگاہ نہیں

جفائے حُسن کا صدقہ، سزائے حُسن کی خیر!
گناہِ عشق سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں

ہزار چشمِ عنایت ہو، پھر بھی کیا حاصل؟
وہ ایک شے بھی، اگر شاملِ نگاہ نہیں

انہیں بھی دست بہ دل، بے قرار دیکھ لیا
سُنا تھا، عشق کی آنکھیں تو ہیں، نگاہ نہیں



دل حریفِ حال و بے حالی نہیں
اس چمن کا اب کوئی مالی نہیں

دیکھنا دل سے سلوکِ چشمِ یار
شیشہ خالی ہے، مگر خالی نہیں

ہاں، مبارک شغل ہے زاہد، مگر
کچھ نہیں گر ہمتِ عالی نہیں

اللہ اللہ! تیرے غم کی وسعتیں
کوئی عالم درد سے خالی نہیں

اس طرف بھی دیکھ، او محشر خرام!
کم مری دُنیائے پامالی نہیں

حُسن ہے اس طرح سرگرمِ خرام
عشق کو احساسِ پامالی نہیں

عشق رنگِ حُسن سے ہے بے نیاز
حُسنِ کیفِ عشق سے خالی نہیں!

شوق بھی دل میں رہے ہمراہِ دوست
اب تو اتنی بھی جگہ خالی نہیں



لفظ و معنٰی میں نہیں، جلوۂ صُورت میں نہیں
عشق اک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

وہ حقیقت کہ جو محدودِ حقیقت میں نہیں
دل کی وسعت میں ہے، کونین کی وسعت میں نہیں

غم میسّر ہے تیرا، غم پہ نہ کیوں نالہ کروں
یہ بھی کیا تو ہے کہ جو عشق کی قسمت میں نہیں

وہ جو اِک ربطِ محبت ہے، مٹانا اس کا
مری طاقت میں نہیں، آپ کی قدرت میں نہیں

جلوہ پھر جلوہ ہے، نظارہ ہے پھر نظارہ
حیرت آئینے میں ہے، آئینہ حیرت میں نہیں

یوں بھی تکمیلِ غمِ عشق ہُوا کرتی ہے
اس کی قسمت میں ہوں میں، جو میری قسمت میں نہیں

ہر نفس میں ہے یہاں جلوۂ نو کا عالم
غمِ فرقت بھی مرا، اب غمِ فرقت میں نہیں



غمِ عاشقی کا صلہ چاہتا ہوں ۔۔۔ خود اپنی نظر سے گرا چاہتا ہوں
بلا پر نزولِ بلا چاہتا ہوں ۔۔۔ سزاوارِ غم ہوں، سزا چاہتا ہوں
محبت بقیدِ وفا چاہتا ہوں ۔۔۔ بڑا نا سمجھ ہوں، یہ کیا چاہتا ہوں
جنونِ محبت یہاں تک تو پہنچا ۔۔۔ کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں
وہ یوں پرسشِ شوق فرما رہے ہیں ۔۔۔ کوئی خود یہ کہہ دے، سزا چاہتا ہوں
طلسمِ تمنا سمجھ میں نہ آیا ۔۔۔ کوئی مجھ کو سمجھائے، کیا چاہتا ہوں
ظہورِ دو عالم، اِک اعجاز جس کا ۔۔۔ اسی نقشِ پا پر مٹا چاہتا ہوں
کہاں تک ہیں یہ رنگ وبو کی بہاریں ۔۔۔ تجھے دیکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں
کہیں ٹوٹ جائے نہ دل بے کسی کا ۔۔۔ نگاہِ کرم! آسرا چاہتا ہوں

محبت ہی اپنا بھی مذہب ہے، لیکن
طریقِ محبت جُدا چاہتا ہوں



محبت میں کیا کیا ستم دیکھتے ہیں! ۔۔۔ بہت فرصتِ شوق کم دیکھتے ہیں
غم و درد و رنجِ الم دیکھتے ہیں ۔۔۔ محبت دکھاتی ہے، ہم دیکھتے ہیں
وہاں اپنی ہستی کو ہم دیکھتے ہیں ۔۔۔ جہاں موت کا سر قلم دیکھتے ہیں
کہاں تیرے جلوے، کہاں اپنی نظریں ۔۔۔ غنیمت ہے، جو کوئی دم دیکھتے ہیں
وہ کیا دیکھ سکتے ہیں اپنی ادائیں! ۔۔۔ ہمیں دیکھتے ہیں، جو ہم دیکھتے ہیں
ہماری نظر سے بھی سمجھو تو جانیں! ۔۔۔ بہت بے نیازانہ ہم دیکھتے ہیں
تجھے بھی کسی دن سمجھنا ہے ظالم! ۔۔۔ ابھی اور، اے چشمِ نم! دیکھتے ہیں
نگاہِ محبت دکھاتی ہے سب کچھ ۔۔۔ نہ تم دیکھتے ہو، نہ ہم دیکھتے ہیں
غنیمت تھا حرمانِ اُمید افزا ۔۔۔ سو یہ حال بھی اب تو کم دیکھتے ہیں

نہ جانے محبت ہے کیا چیز لیکن
بڑی ہی محبت سے ہم دیکھتے ہیں



محبت کی محبت تک ہی جو دُنیا سمجھتے ہیں
خدا جانے وہ کیا سمجھے ہوئے ہیں، کیا سمجھتے ہیں

جمالِ رنگ و بُو تک حُسن کی دُنیا سمجھتے ہیں
جو صرف اتنا سمجھتے ہیں، وہ آخر کیا سمجھتے ہیں

کمالِ تشنگی ہی سے بجھا لیتے ہیں پیاس اپنی
اسی تپتے ہوئے صحرا کو ہم دریا سمجھتے ہیں

سمجھنے دے انہیں، اے غیرتِ جذبِ طلب، ظالم
جہاں تک جانتے ہیں، خود کو وہ اپنا سمجھتے ہیں

ہم اُن کا عشق کیسا؟ اُن کے غم کے بھی نہیں قابل
یہ اُن کی مہربانی ہے کہ وہ ایسا سمجھتے ہیں

یہ کیا طاقت کہ ہم پر ڈال دے ٹیڑھی نظر کوئی
مگر اس جانِ محبوبی کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں

ہمیں ہیں عشق کے مارے، ہمیں پر ہے نظر اُن کی
ہمیں اپنا بنایا ہے، ہمیں اپنا سمجھتے ہیں

محبت میں نہیں سیرِ مناظر کی ہمیں پروا
ہم اپنے ہر نفس کو اک نئی دُنیا سمجھتے ہیں

نگاہِ شوق ہی کچھ جانتی ہے رازِ مستوری
وہ خود جلوہ ہے اُن کا سب جسے پردا سمجھتے ہیں

اشاروں میں لُٹا دیتے ہیں دولت دین و دنیا کی
مگر اپنی محبت کو وہ صرف اپنا سمجھتے ہیں

مے و مینا کے پردے اُن کو دھوکا دے نہیں سکتے
ازل کے دن سے جو رازِ مئے مینا سمجھتے ہیں

خبر اس کی نہیں ان خام کارانِ محبت کو
اسی کو دُکھ بھی دیتے ہیں، جسے اپنا سمجھتے ہیں

فضائے نجد ہو، یا قیسِ عامر، اے جگر! ہم تو
جو کچھ ہے، ہم اُسے عکسِ رُخِ لیلا سمجھتے ہیں



رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں، انہیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میں، میکدہ بر ہوش نہیں

کونسا جلوہ یہاں آتے ہی بے ہوش نہیں؟
دل مرا دل ہے، کوئی ساغرِ سر جوش نہیں

مرنے والے! تجھے مرنے کا بھی کیا ہوش نہیں؟
ماں کا آغوش ہے، یہ موت کا آغوش نہیں

پاؤں اُٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

حُسن سے عشق جُدا ہے، نہ جُدا عشق سے حُسن
کون سی شے ہے، جو آغوش در آغوش نہیں

مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گذشتہ کے نقوش
پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

ایک گوشہ میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم
میرا دامن ہے کسی اور کا آغوش نہیں

اب تو تاثیرِ غمِ عشق یہاں تک پہنچی!
کہ اِدھر ہوش اگر ہے، تو اُدھر ہوش نہیں

زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہے مئے عشق
موت ہے موت، اگر رقص نہیں، جوش نہیں

کبھی ان مد بھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام
آج تک ہوش نہیں، ہوش نہیں، ہوش نہیں

عشق اگر حُسن کے جلوؤں کا ہے مرہونِ کرم
حُسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

اپنے ہی حُسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!
میرے، آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

زندگی خود ہی عبادت ہے، مگر ہوش نہیں ۔ محوِ تسبیح تو سب ہیں، مگر اِدراک کہاں![1]

مل کے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے جگر
مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں!



مر کے بھی کب تک نگاہِ شوق کو رُسوا کریں ۔ زندگی تجھ کو کہاں پھینک آئیں، آخر کیا کریں
جذبِ دل ممکن نہیں، تو چشمِ دل ہی وا کریں ۔ وہ ہمیں دیکھیں نہ دیکھیں، ہم انہیں دیکھا کریں
اے میں قرباں! مل گیا عرضِ محبت کا صلہ ۔ ہاں اسی انداز سے کہہ "دو تو پھر ہم کیا کریں"
دیکھئے کیا شور اُٹھتا ہے حریمِ ناز سے ۔ سامنے آئینہ رکھ کے خود کو اک سجدہ کریں
ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں ۔ عشق آخر عشق ہے، تم کیا کرو، ہم کیا کریں

عشق خود اپنی جگہ عینِ حقیقت ہے جگر
عشق ہی میں کیوں نہ شانِ دلبری پیدا کریں؟



جب اپنا اپنا غم احباب سے احباب کہتے ہیں ۔ بہت بیتاب سُنتے ہیں، بہت بیتاب کہتے ہیں
محبت بہتی گنگا ہے، نہالے جس کا جی چاہے ۔ نہ بے پایاں بتاتے ہیں، نہ ہم پایاب کہتے ہیں
زمانے بھر کی دولت کو غمِ جاناں سے کیا نسبت ۔ یہی نعمت ہے وہ نعمت، جسے نایاب کہتے ہیں
عطا کر، اے جمالِ حُسن! وہ داغِ محبت بھی! ۔ زبانِ عشق میں جس کو گلِ شاداب کہتے ہیں
عبادت گاہِ جانِ عاشقاں کا پُوچھنا ہی کیا ۔ خمِ ابروئے جاناں کو خمِ محراب کہتے ہیں
اسی صورت سُنا دیتے ہیں اُن کو واردات اپنی ۔ کہ جیسے ہم کسی کی داستانِ خواب کہتے ہیں
الٰہی! آگ ہی لگ جائے تاثیرِ محبت کو! ۔ وہ آج اپنا بھی غم با دیدۂ پُر آب کہتے ہیں
محبت جن کی ایک اک موج میں لہریں نہ لیتی ہو ۔ ہم ایسے آنسوؤں کو گوہرِ بے آب کہتے ہیں
ہمارا بھی زمانہ تھا کبھی، اے عشق، سُنتے ہیں! ۔ ہمارے پاس بھی تھا اک دلِ بیتاب کہتے ہیں
محبت کی ہر اک موجِ بلا ہے بحرِ بے پایاں! ۔ خوشا وہ اہلِ ہمّت، پھر بھی جو پایاب کہتے ہیں

---

[1] اگر میرا نفس مجھ کو دھوکا نہیں دیتا تو یہ شعر خالص الہامی ہے۔ آیۃ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اکثر میرے پیشِ نظر رہا کرتی تھی۔ خیال یہ ہوتا تھا کہ یقیناً ایسا ہی ہے۔ پھر ہمیں مزید تکلیفِ تسبیح و تہلیل و عبادت کیوں دی گئی۔ ایک دن جمعہ کی نماز میں شریک تھا کہ بے قصد و بے ارادہ یہ شعر نازل ہُوا۔ اور اُسی دن سے مجھے بہت تسکین حاصل ہوگئی۔ (جگرؔ)

کبھی پانی بھی جن آنکھوں کے ماروں نے نہیں مانگا
انہیں آنکھوں کے ماروں کو جگرؔ سیراب کہتے ہیں



اللہ اللہ! عشق کی رعنائیاں
حُسن خود لینے لگا انگڑائیاں

ہائے وہ غم کی کرم فرمائیاں
بھیگی راتیں اور وہ تنہائیاں

عشق ہے ہر مُوئے تن سے نغمہ زن
بج رہی ہیں ہر طرف شہنائیاں

کوئی دیکھے تو حریمِ شوق میں
خلوتوں کی انجمن آرائیاں

یاد ظالم کو تم اپنی روک لو
لُوٹے لیتی ہے مری تنہائیاں

دل کی چوٹیں اُبھری آتی ہیں تمام
عشق کی چلنے لگیں پُروائیاں

حُسن کی جانِ توجہ بن گئیں
بڑھتے بڑھتے عشق کی رُسوائیاں

سامنے جیسے وہ خود میں جلوہ گر
اللہ اللہ! یہ حجاب آرائیاں

خود بڑھے آتے ہیں وہ میری طرف
کوئی دیکھے تو مری پسپائیاں!

اب کہاں انساں، جسے انساں کہیں
چلتی پھرتی دیکھ تو پرچھائیاں

غیر تو غیر، اپنے سائے سے بھی رم
دیکھنا اس دل کی وحشت زائیاں

حُسن بھی ہے، عشق بھی ہے جلوہ گر
ایک دل اور اس کی یہ پہنائیاں

کون پہنچا تافرازِ بامِ حُسن؟
کس نے دیکھیں عشق کی گہرائیاں

رہ گئی رکھی ہی عقلِ پختہ کار
عشق کی کام آگئیں خودرائیاں

حُسن کے بھی ڈگمگاتے ہیں قدم
عشق کرتا ہے جہاں دارائیاں

یاد ہے اب تک جگرؔ ! آغاز عشق
شب، ہمہ شب وہ خیال آرائیاں



عشق کی بڑھنے تو دو بربادیاں
کام آئیں گی یہ صحرا زادیاں

اللہ اللہ! اعتبارات نظر!
اور پھر اُن سب کی بے بُنیادیاں

اس نگاہِ ناز ہی سے پُوچھیے
اک اسیرِ شوق کی صیّادیاں!

خود نہ تھی اپنی بھی جب تجھ کو خبر
یاد کر اے عشق وہ آزادیاں

کشورِ دل ہی میں گھٹ کر رہ گئیں
کیسی کیسی نازنیں شہزادیاں

عشق خود کرتا ہے اعلانِ شکست
حسن کو دیجے مبارکبادیاں[1]



عہدِ رنگیں کی یادگار ہوں میں — یعنی اپنا ہی سوگوار ہوں میں
آکہ بیتابِ انتظار ہوں میں — دل کی اِک آخری پُکار ہوں میں
ذرۂ آستانِ یار ہوں میں — صد مہ و مہر درکنار ہوں میں
میری ہستی کا واہ کیا کہنا — تیری ہستی کا پردہ دار ہوں میں
نہ سہی تُو، ترا خیال تو ہے — یوں بھی فردوس درکنار ہوں میں
اُف، جواں مرگیاں محبت کی! — ہائے کس کس کا سوگوار ہوں میں
نکہتِ گُل کا بھی دماغ نہیں — کتنا آزردۂ بہار ہوں میں
وہ حقیقت ہے خود مری ہستی — جس حقیقت کا پردہ دار ہوں میں
اللہ اللہ! نزاکتیں میری! — اپنی خاطر پہ بھی تو بار ہوں میں
تجھ کو تکلیفِ صد نظر، ہے ہے! — اپنے ہونے پر شرمسار ہوں میں

مجھ کو رنگِ خزاں سمجھ کے نہ دیکھ
مژدۂ آمدِ بہار ہوں میں



جو نہ کعبے میں ہے محدود نہ بُت خانے میں — ہائے، وہ اور اک اُجڑے ہوئے کاشانے میں!
ملتی ہے عمرِ ابد عشق کے مے خانے میں — اے اجل، تُو بھی سما جا مرے پیمانے میں
ہم کہیں آتے ہیں واعظ، ترے بہکانے میں — اسی میخانے کی مٹّی، اسی مے خانے میں
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں — خُلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں
حرم و دیر میں رندوں کا ٹھکانا ہی نہ تھا — وہ تو یہ کہیے، اماں مل گئی مے خانے میں
بام پر آکے اُٹھا دو رُخِ تاباں سے نقاب — اک اضافہ ہی سہی طُور کے افسانے میں
آج تو کر دیا ساقی نے مجھ مست الست — ڈال کر خاص نگاہیں مرے پیمانے میں
آج ساقی نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے! — کبھی میخانے سے باہر، کبھی میخانے میں

---

[1] "مبارک باد" صحیح ہے۔ مُبارک باد کو غلط کہا جاتا ہے لیکن داغ مرحوم نے کہا ہے اور یہ سند کافی ہے (جگر)

آپ دیکھیں تو سہی، ربطِ محبت کیا ہے — اپنا افسانہ ملا کر مرے افسانے میں[1]
ہجوِ مے نے ترا اے شیخ بھرم کھول دیا — تُو تو مسجد میں ہے، نیت تری میخانے میں

مشورے ہوتے ہیں جو شیخ و برہمن میں جگر
رند سُن لیتے ہیں بیٹھے ہوئے میخانے میں



شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں — روح بن کر ذرّے ذرّے میں سما جاتا ہوں میں
آ کہ تجھ بن اس طرح، اے دوست، گھبراتا ہوں میں — جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
جس قدر افسانۂ ہستی کو دُہراتا ہوں میں — اور بھی بیگانۂ ہستی ہوا جاتا ہوں میں
جب مکان ولامکاں، سب سے گزر جاتا ہوں میں — اللہ اللہ! تجھ کو خود اپنی جگہ پاتا ہوں میں
تیری صورت کا جو آئینہ اسے پاتا ہوں میں — اپنے دل پر آپ کیا کیا ناز فرماتا ہوں میں
یک بیک گھبرا کے جتنی دُور ہٹ آتا ہوں میں — اور بھی اس شوخ کو نزدیک تر پاتا ہوں میں
میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب — کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں
ہائے ری مجبوریاں، ترکِ محبت کے لئے — مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور اُن کو سمجھاتا ہوں میں
میری ہمت دیکھنا، میری طبیعت دیکھنا — جو سُلجھ جاتی ہے گتھی، پھر سے اُلجھاتا ہوں میں
حُسن کو کیا دشمنی ہے، عشق کو کیا بیر ہے — اپنے ہی قدموں کی خود ہی ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
تیری محفل تیرے جلوے، پھر تقاضا کیا ضرور — لے اُٹھا جاتا ہوں، ظالم، لے چلا جاتا ہوں میں
تا کجا یہ پردہ داری ہائے عشق و لافِ حُسن؟ — ہاں سنبھل جائیں دو عالم، ہوش میں آتا ہوں میں
میری خاطر اب وہ تکلیفِ تجلّی کیوں کریں؟ — اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں
دل مجسّم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بُو — کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں
تا کجا ضبطِ محبت، تا کجا دردِ فراق! — رحم کر مجھ پر کہ تیرا راز کہلاتا ہوں میں!
واہ رے شوقِ شہادت! کوئے قاتل کی طرف — گنگناتا، رقص کرتا، جھومتا جاتا ہوں میں
یا وہ صُورت خود جہانِ رنگ و بو محکوم تھا — یا یہ عالم اپنے سائے سے دبا جاتا ہوں میں
دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا — وہ جفا کرتے ہیں مجھ پر اور شرماتا ہوں میں

---

[1] سطحی نظر سے اگر دیکھا جائے تو ردیف "میں" صحیح نہیں ہوگی بلکہ اس کی جگہ "سے" درست ہے۔
لیکن اس محلِ خاص پر ردیف "میں" ہی مناسب سمجھتا ہوں (جگر)

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث، اے جگر !
ایک شیشہ ہے، کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں



آئینہ رُوبرو ہے، کچھ گنگنا رہے ہیں — زلفیں سنور چکی ہیں، قشقہ لگا رہے ہیں
کافر جمال والے کافر بنا رہے ہیں — ایمان لانے والے ایمان لا رہے ہیں
جھونکے نفس نفس میں خوشبو کے آرہے ہیں — شاید وہ آج خود ہی تشریف لا رہے ہیں
شاعر ہے محوِ فطرت، جذبات چھا رہے ہیں — پیغام جا رہے ہیں، پیغام آ رہے ہیں
ساون کی رین اندھیری، تنہائیوں کا عالم
بُھولے ہوئے فسانے سب یاد آ رہے ہیں



بے تاب ہے، بے خواب ہے، معلوم نہیں کیوں — دل ماہیِ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں
بے کیف مئے ناب ہے، معلوم نہیں کیوں — پھیکی شبِ مہتاب ہے، معلوم نہیں کیوں
ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و باصرار — وہ جُرعہ بھی زہراب ہے، معلوم نہیں کیوں
بے نام سی اک یاد ہے، کیا جانیئے کس کی — بے وجہ تب و تاب ہے، معلوم نہیں کیوں
دیکھا تھا، کبھی خواب سا، معلوم نہیں کیا — اب تک اثرِ خواب ہے، معلوم نہیں کیوں
خلوت میں بھی، جلوت میں بھی گھیرے ہوئے دل کو — اِک شعلۂ بے تاب ہے، معلوم نہیں کیوں
کل تک یہی دُنیا سبدِ گل تھی، مگر آج! — بے رنگ ہے، بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں
منہ تکتے ہیں، تدبیر کوئی کر نہیں سکتے — شَل ہمّتِ احباب ہے، معلوم نہیں کیوں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر — میرے لئے بے تاب ہے، معلوم نہیں کیوں
جو ساز کہ خود نغمۂ عُریاں تھا، اُسی کو — اندیشۂ مضراب ہے، معلوم نہیں کیوں
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے، لیکن — کشتی سے تہِ آب ہے، معلوم نہیں کیوں
اس پردۂ رنگیں پہ نظر آتا ہے جو کچھ
جیسے کہ یہ اک خواب ہے، معلوم نہیں کیوں



ہم ہوں اور آپ زیبِ محفل ہوں — ہر طرف آئینے مقابل ہوں
وہ سُنیں میرے درد کی آواز — وہ مجسّم نزاکتِ دل ہوں
رشک! یہ بھی نہیں پسند کہ وہ — اپنی صورت پہ آپ مائل ہوں

کیوں کنکھیوں سے وہ ہمیں دیکھیں
جذبِ دل ہی کے جو نہ قائل ہوں

ایک جانب برس رہے ہوں جمال
اک طرف کچھ حجاب حائل ہوں

جتنے آساں ہوں عشق کے عقدے
حیف! اتنے ہی سخت مشکل ہوں

پسِ منظر بھی سامنے ہے اگر!
نگہ و فکر خود نہ حائل ہوں

دُور کیوں جائیں آرزو لے کر
آپ اپنے ہی پر نہ مائل ہوں

کیفِ احساسِ عشق ہی نہ رہے
اس قدر پاس بھی نہ دو دل ہوں

زندگی جن کے ہر قدم پر نثار
حیف اپنے وہ آپ قاتل ہوں

اب تو پہلو کا یہ تقاضا ہے
دل ہوں اور دو جہان کے دل ہوں

نغمے ساکت ہوں بن کے رُوح، مگر
ساز خاموش ہوں، مگر دل ہوں

آپ ہی میرے جان و دل کی صدا
آپ ہی میری جان ہوں، دل ہوں

دیکھ لی ہم نے عشق کی تاثیر
اب وہ قائلِ ہوں یا نہ قائل ہوں

زندگی تھے کبھی جو آہ، جگر!
اب وہی گھونٹ زہرِ قاتل ہوں



اوس پڑے بہار پر، آگ لگے کنار میں
تم جو نہیں کنار میں، لُطف نہیں بہار میں

لُطف ہے کیا، ستم ہے کیا، عالمِ اعتبار میں
فُرصتِ ہوش ہی کسے، عشق کی گیرودار میں

راحتِ جانِ عاشقاں، کاہشِ انتظار میں
عیشِ دلِ ستم کشاں، دردِ فراقِ یار میں

کون کرے یہ عرض جا کے حریمِ یار میں
نشہ نہیں شراب میں، جوش نہیں بہار میں

اس پہ کرے خدا ہی رحم، گردشِ روزگار میں
اپنی تلاش چھوڑ کر جو ہے تلاشِ یار میں

عشق ہے کس قطار میں، حُسن ہے کس شمار میں
عُمر تمام ہو چلی اپنے ہی انتظار میں

اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں
آپ مجھے بھلا سکیں، یہ نہیں اختیار میں

ہم کہیں جانے والے ہیں دامنِ عشق چھوڑ کر
زیست ترے حضور میں، موت ترے دیار میں

قدرتِ کار ساز کی اُف! یہ ستم ظریفیاں
جبر میں اختیار ہے، جبر ہے اختیار میں

راحتِ بے خلش اگر مل بھی گئی تو کیا مزا
تلخیٔ غم بھی چاہیے بادۂ خوشگوار میں

دورِ غمِ فراق کی اتنی تو یاد ہے، جگر!
اور بھی اک صدا سی تھی درد کی ہر پکار میں



الٰہی ! ایک دعا ہے اگر قبول نہ ہو — بہت غریب یہ دل ہے، کبھی ملول نہ ہو
تجھے بھی شاق نہ ہو، شوق بھی ملول نہ ہو — نظر قبول ہوئی ہے، اثر قبول نہ ہو
دعائے مرگ تو مانگی ہے آج گھبرا کر — میں کیا کروں گا جو یہ بھی اُسے قبول نہ ہو؟
کمالِ عشق! یہ توفیق چاہتا ہوں میں! — حصُولِ جلوہ باندازۂ حصُول نہ ہو
جسے ہم اپنی محبت کا زخم کہتے ہیں — ترے ہی عارضِ رنگیں کا کوئی پھول نہ ہو
کسی کے خاطرِ نازک کا آ گیا ہے خیال — دعائیں مانگ رہا ہوں، دُعا قبول نہ ہو
جو تیرے ہجرِ میسّر کا راز فاش کرے — تری جناب میں وہ دل کبھی قبول نہ ہو

کوئی گناہ نہیں، شوقِ دید و ذوقِ نظر
جُز اینکہ فرصتِ نظارگی کو طُول نہ ہو



ستم ہو، قہر ہو، آفت، بلا ہو — یہ سب کُچھ ہو، مگر پھر دل ربا ہو
کسی کے غم میں کوئی رو رہا ہو — کوئی پردے سے چھپ کر دیکھتا ہو

بتاؤ، کیا تمہارے دل پہ گذرے
اگر کوئی تمہیں سا بے وفا ہو



حسن کے ہاتھ میں گر عشق کی تلوار نہ ہو — کوئی یوں جُھوم کے سر دینے کو تیار نہ ہو
وصل شایاں نہ رہے، ہجر سزا وار نہ ہو — میں کہیں کا نہ رہوں تو جو طرف دار نہ ہو
میں بھی ہر حال کو اب ہجر بنا دوں تو سہی — میرا انکار ترے وصل کا انکار نہ ہو
میں خطا وار، سیہ کار، گُنہ گار، مگر — کس کو بخشے تری رحمت جو گنہ گار نہ ہو
مجھ کو سب کچھ دیا اک بت نے، مگر یہ کہہ کر — تجھ کو، اللہ کرے، کچھ بھی سزا وار نہ ہو!
میں چلوں عشق میں وہ راہ جو ہو سب سے الگ — کُچھ سجھائی بھی نہ دے، سطح بھی ہموار نہ ہو

آتشِ شوق جو بھڑکی ہے، بھڑکتی ہی رہے
مجھ کو اللہ کرے، تو بھی سزا وار نہ ہو



اک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہؐ — ہاں کوئی نظر، رحمتِ سلطانِ مدینہؐ!
تو صبحِ ازل، آئینہ حُسنِ ازل بھی — اے صلِّ علیٰ صورتِ سلطانِ مدینہؐ!
دامانِ نظر تنگ و فراوانیٔ جلوہ — اے طلعتِ حق، طلعتِ سلطانِ مدینہؐ!

اے خاکِ مدینہ تری گلیوں کے تصدق
تو خلد ہے، تو جنّتِ سلطانِ مدینہؐ!
اس طرح کہ ہر سانس ہر مصروفِ عبادت
دیکھوں میں درِ دولتِ سلطانِ مدینہؐ!
اک ننگِ غمِ عشق بھی ہے منتظرِ دید
صدقے ترے، اے صورتِ سلطانِ مدینہؐ!
کونین کا غم، یادِ خدا، دردِ شفاعت
دولت ہے یہی دولتِ سلطانِ مدینہؐ!
اے عالمِ تکویں! ترے اسرارِ حقیقت
منجملہ ایک آیتِ سلطانِ مدینہؐ!
ظاہر میں غریب الغربا[1] پھر بھی یہ عالم
شاہوں سے سوا سطوتِ سلطانِ مدینہؐ!
اس اُمتِ عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا!
نازک ہے بہت غیرتِ سلطانِ مدینہؐ!
اے جانِ بلب آمدہ، ہشیار، خبردار
وہ سامنے ہیں حضرتِ سلطانِ مدینہؐ!
کچھ ہم کو نہیں کام جگرؔ! اور کسی سے
کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہؐ!



میری نظروں میں ہے اک جانِ وفا کا نقشہ
کس نے دیکھا ہے اس انداز و ادا کا نقشہ؟
عشق میں فرقت و قربت ہیں برابر دونوں
یہ قیامت کا سماں ہے، وہ بلا کا نقشہ
دل میں کچھ بھی نہیں اب کفرِ محبت کے سوا
جم گیا ایک بُتِ ہوش ربا کا نقشہ
تُو نے دیکھا ہی نہیں تجھ سے کہوں کیا زاہد؟
ہائے ان شوخ نگاہوں میں حیا کا نقشہ
دل میسّر ہو تو کیا سیرِ دو عالم کی ہوس
اسی نقشہ میں ہے کُل ارض و سما کا نقشہ
دل میں جب درد اُٹھا نور کا طوفاں بھی اُٹھا
کھنچ گیا سامنے اک برق ادا کا نقشہ
آج جھکتی نظر آتی ہے جبینِ کونین
دیکھنا یار کے نقشِ کفِ پا کا نقشہ
پاک رکھ، اشکِ ندامت سے بہر حال جگرؔ
دیکھنا ہے انھی آنکھوں سے خدا کا نقشہ



اُف[2] یہ تیغ آزمائیاں توبہ! تیری نازک کلائیاں، توبہ!

---

[1] غریب بمعنی مفلس صحیح نہیں۔ لیکن زبان کے متعلق میرے نظریات دوسروں سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ (جگرؔ)

[2] یہ مسلسل غزل یا نظم میری حیاتِ معاشقہ کے ایک اہم اور بہت ہی درد انگیز واقعہ سے متعلق ہے۔ (جگرؔ)

کیا کریں بندگانِ محبوبی! — عاشقی کی خدائیاں، توبہ!
منزلِ عشق، اے خدا کی پناہ! — ہر قدم کربلائیاں، توبہ!
یادِ ایّام شوق و عشق و جنوں! — چرخ کی فتنہ زائیاں، توبہ!
لُطفِ بیگانگی، معاذ اللہ! — اُن کی سادہ ادائیاں، توبہ!
حُسن میں رقص کا سا اِک عالم — شوق کی نَے نوائیاں، توبہ!
ہائے غمّازیاں نگاہوں کی! — اپنی بے دست[1] و پائیاں، توبہ!
اُف! وہ احساسِ حُسن پہلے پہل — یک بیک کج ادائیاں، توبہ!
اللہ اللہ! عشق کی وہ جھجک — حُسن کی کہربائیاں، توبہ!
اُس کے دامن پہ دل کا جا پڑتا — ہم سے یہ بے وفائیاں، توبہ!
غیظ سے ابروؤں پہ وہ شکنیں — دل پہ زور آزمائیاں، توبہ!
آستینوں کا وہ چڑھا لینا — گوری گوری کلائیاں، توبہ!
نظروں نظروں میں کاوشِ سرِ بزم — دل ہی دل میں لڑائیاں، توبہ!
سوزِ غم کی شکایتیں، ہے ہے! — دردِ دل کی دہائیاں، توبہ!
برملا سخت رنجشیں باہم — غائبانہ صفائیاں، توبہ!
اپنے مطلب سے عشق کی چھیڑیں — ظاہری بے وفائیاں، توبہ!
حُسن و توہینِ عشق، ہائے غضب! — اپنی وہ خودستائیاں، توبہ!
غیرتِ عشق، اے معاذ اللہ! — ایک دم بے وفائیاں، توبہ!
شبنم آلودہ وہ حسیں آنکھیں — رُخ پہ اُڑتی ہوائیاں، توبہ!
اس کی غم التفاتیاں، ہے ہے! — اپنی بے اعتنائیاں، توبہ!
سرِ سودا کی شورشیں پیہم! — ہر طرف جگ ہنسائیاں، توبہ!
رفتہ رفتہ وہ بے پناہ سکوت — سب سے نا آشنائیاں، توبہ!
موت سے ہر نفس وہ راز و نیاز — موت کی ہم نوائیاں، توبہ!
ناگہاں آمدِ محبوب — غم کی بے انتہائیاں، توبہ!
یک بیک آنکھ چار ہو جانا — دیر تک رُونمائیاں، توبہ!

---

[1] بے دست و پا جس مفہوم میں مستعمل ہے، اس اعتبار پر میں نے اسے ایک لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس بنا پر مہنّد بنا لینا غلط نہیں سمجھتا۔ (جگرؔ)

نظروں نظروں میں سرگذشتِ فراق — دونوں جانب دہائیاں، توبہ!
حُسن کی لہر پھر سے دوڑا کر — اس کی معجز نمائیاں، توبہ!
پھر وہی چشمِ مست و جامِ بدست — پھر وہی نغمہ زائیاں، توبہ!
پھر وہی لَب، وہی تبسمِ ناز! — پھر وہی کج ادائیاں توبہ!

پھر وہ اک بیخودی کے عالم میں
مل کے باہم جُدائیاں، توبہ!



کچھ نہ زمان و مکاں، کچھ نہ سفید سیاہ — اشہد اَنْ لا اِلٰہ، اشہد اَنْ لا اِلٰہ
غنچہ و نسرین و گل، انجم و خورشید و ماہ — یہ بھی مری رہ گذر، وہ بھی مری گردِ راہ
عشق نظر آفریں اور نظر معصیت — عشق تمنّا نژاد، اور تمنّا گناہ
حاصلِ صد عرضِ غم، مایۂ صد عرضِ شوق — اک مترنّم سکوت، اک متبسّم نگاہ
کون تجھ کو پا سکے، کس کو ہے یہ دستگاہ — عشق سوگم کردہ ہوش، عقل سوگم کردہ راہ
دورِ ازل تا ابد، یہ بھی کوئی سیر گاہ — فاصلہ یک قدم، دائرہ یک نگاہ
اس کے سوا اور کیا پیش کشِ حُسنِ دوست — ایک دھڑکتا سا دل، ایک لرزتی سی آہ
قصۂ ناز و نیاز، کیا کہیں ہوتا ہے ختم — حُسن ترا بے اماں، عشق مرا بے پناہ
تو ہے خودی ناشناس، تجھ کو خدا سے غرض — دیکھ تو لے کر ذرا، آئینۂ مہر و ماہ
جانبِ مُلکِ حبیب، پھرہوں میں یوں گام زن — صبحِ ازل در نفس، شامِ ابد در نگاہ
اپنے بھی سایہ سے چل بچ کے رہِ دوست میں — شوق سہی راہ نُما، عشق سہی خضرِ راہ
اس کا وہیں تک گذر، جس کی جہاں تک سکت — اس کی وہیں تک فکر، جس کی جہاں تک نگاہ
چیر کے دیکھوں اگر سینۂ مستیِ عشق — توڑ کے رکھ دوں ابھی آئینۂ مہر و ماہ
اے کہ تو ناواقفِ مصلحتِ حسن و عشق (قطعہ) — اے کہ تو نا محرمِ سرِّ ثواب و گناہ
میرا تخیل جگر! طائرِ جبریلِ فکر — میرا تصوّر جگر! بُلبُلِ عنقا نگاہ

درسِ حقیقت سمجھ، حاصلِ فرصت سمجھ
فرضِ محبت سمجھ، معصیتِ گاہ گاہ



مذہبِ عشق کر قبول، مسلکِ عاشقی نہ دیکھ — محشرِ التجا تو بن، صورتِ ملتجی نہ دیکھ
تجھ کو خدا کا واسطہ، تو مری زندگی نہ دیکھ — جس کی سحر بھی شام ہو، اس کی سیہ شبی نہ دیکھ

دل کو مٹا کے عشق میں، دل کی طرف کبھی نہ دیکھ
ہو کے نثارِ زندگی، حاصلِ زندگی نہ دیکھ

جان کو جب گھلا چکا، جان کی فکر ہی نہ کر
شمع کو جب بجھا چکا، شمع کی روشنی نہ دیکھ

ناصحِ کم نگاہ سے کون یہ کہہ کے سر کھپائے
رازِ شکستگی سمجھ، رنگِ شکستگی نہ دیکھ

کس لئے جان دیتے ہیں رند شرابِ ناب پر
پوچھ نہ روز محتسب! تھوڑی سی آج پی کے دیکھ

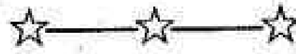
تجھ کو بھی اب قسم ہے یہ، تیرے ستم کا واسطہ
نالۂ نیم شب نہ سُن، آہِ سحر گہی نہ دیکھ

ہو کے رہے گا ہم نوا، وہ بھی ترے ہی ساتھ ساتھ
نغمۂ شوق گائے جا، حُسن کی برہمی نہ دیکھ

عشق ادا شناسِ حُسن، حُسن ادا شناسِ عشق
کام سے اپنے کام رکھ، بے خودی و خودی نہ دیکھ

یہ بھی تری طرح کبھی رُخ سے نقاب اُلٹ نہ دے
حُسن پہ اپنے رحم کر، عشق کی سادگی نہ دیکھ

فتنۂ روزگار میں ہے یہی رازِ عافیت
دل جسے چاہے دیکھنا، دیکھ، جگر؟ وہی نہ دیکھ



عشق فنا کا نام ہے، عشق میں زندگی نہ دیکھ
جلوۂ آفتاب بن، ذرّہ میں روشنی نہ دیکھ

شوق کو رہنما بنا، جو ہو چکا، کبھی نہ دیکھ
آگ دبی ہوئی نکال، آگ بجھی ہوئی نہ دیکھ

جلوۂ رنگ رنگ کی، دیکھ، ہما ہمی نہ دیکھ
ایک جگہ ٹھہر نہ جا، غور سے تُو کبھی نہ دیکھ

شوق کا مرثیہ نہ پڑھ، عشق کی بے بسی نہ دیکھ
اُس کی خوشی خوشی سمجھ، اپنی خوشی خوشی نہ دیکھ!

یہ تو نہیں کہ آنکھ کو دعوتِ ماسوا نہ دے
ہاں مگر اس قدر کہ بس، ایک ہی رُخ کبھی نہ دیکھ

دل کی لگی بڑھائے جا، تیز قدم اُٹھائے جا
رُخصتِ شوق کی قسم، فُرصتِ زندگی نہ دیکھ

حُسنِ مجاز سے گذر، یعنی جو تجھ سے ہو سکے
دیکھ کے ایک بار پھر بارِ دگر کبھی نہ دیکھ

حُسن کا ہے یہ مقتضیٰ، دیکھ تو دیکھتا ہی رہ
عشق کا ہے یہ فیصلہ، آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھ

تو ہی کمالِ عشق ہے، تو ہی کمالِ حُسن ہے
اپنے سوا کسی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھ

تُو ہی تمام نغمہ ہے، تُو ہی تمام نغمہ بن
ساز کی نغمگی ہی کیا، ساز کی نغمگی نہ دیکھ

پہلے جہانِ رنگ و بُو، تا بہ کمال دیکھ جا
رہروِ منزلِ سلوک، اپنی طرف ابھی نہ دیکھ

موت و حیات میں ہے صرف ایک قدم کا فاصلہ
اپنے کو زندگی بنا، جلوۂ زندگی نہ دیکھ

ہے یہی عین دوستی، اپنی طرف سے، اے جگر!
دستِ کرم بڑھائے جا، غیر کی دشمنی نہ دیکھ



دل میں اک رشکِ حُور رہتا ہے
پاس رہتا ہے، دُور رہتا ہے

میں تو رکھوں ہزار پہلو میں!
کب دلِ ناصبُور رہتا ہے؟

ہو گیا کیا مُریدِ مئے زاہد؟
اب تو چہرے پہ نُور رہتا ہے

پُوچھتا ہے یہ اُن نگاہوں سے عشق کیوں ناصبُور رہتا ہے؟
چشمِ ساقی کی خیر ہو، یا رب! بے پیئے ہی سرُور رہتا ہے
عشق مرنے پہ بھی نہیں مٹتا یہ تعلق ضرُور رہتا ہے
وہی آہیں، وہیں ہوں میں، لیکن
اب دُھواں دُور دُور رہتا ہے



سُن تو اے دل یہ برہمی کیا ہے؟ آج کچھ درد میں کمی کیا ہے؟
دیکھ لو! رنگِ رُوئے ناکامی! یہ نہ پوچھو، کہ بے کسی کیا ہے
اپنی ناکامیٔ طلب کی قسم!! عین دریا ہے، تشنگی کیا ہے
جسم محدُود، رُوح لامحدُود پھر یہ اِک ربطِ باہمی کیا ہے
اے فلک! اب تجھے تو دکھلادوں زورِ بازوئے بے کسی کیا ہے
ہم نہیں جانتے محبت میں! رنج کیا چیز ہے، خوشی کیا ہے
اِک نفس خُلد، اک نفسِ دوزخ
کوئی پُوچھے یہ زندگی کیا ہے؟



اک شوقِ دید بے حد سب کچھ دکھا رہا ہے کوئی نہ آرہا ہے، کوئی نہ جا رہا ہے
غمِ عشق کے خزینے خوش خوش لُٹا رہا ہے اِس ہاتھ کھو رہا ہے، اُس ہاتھ پا رہا ہے
آنکھیں بنی ہوئی ہیں میخانۂ تصوّر اِک مست آرہا ہے، اِک مست جا رہا ہے
ہم کو کیا اس سے مطلب، ناصح کو کیا شکایت میرا مٹانے والا مجھ کو مٹا رہا ہے
معراجِ شوق کہیئے یا حاصلِ تصوّر جس سمت دیکھتا ہوں، تو مُسکرا رہا ہے
منّت گزار ہوں میں، اے عشق ناشکیبا! دل تیرے نشتروں سے تسکین پا رہا ہے
اُن کی وہ آمد آمد، اپنا یہاں یہ عالم اِک رنگ آرہا ہے، اِک رنگ جا رہا ہے
جب حُسن و عشق دونوں رویا کریں گے مجھ کو
وہ بھی جگر زمانہ نزدیک آ رہا ہے



اُسے حال و قال سے واسطہ، نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبتِ خاص ہو، ترے حسنِ برق خرام سے

مجھے دے رہے ہیں تسلّیاں، وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

کہوں کیا؟ رہا جو مقابلہ، خطراتِ گام بہ گام سے
سرِ بامِ عشق تمام تک، رہِ شوقِ نیم تمام سے

نہ غرض کسی سے، نہ واسطہ، مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے تری یاد سے، ترے نام سے

مرے ساقیا، مرے ساقیا! تجھے مرحبا، تجھے مرحبا!
تُو پلائے جا، تُو پلائے جا، اسی چشمِ جام بہ جام سے

تری صبحِ عیش ہے کیا بلا؟ تجھے اے فلک! جو ہو حوصلا
کبھی کر لے آ کے مقابلا، غمِ ہجرِ یار کی شام سے

مجھے یُوں نہ خاک میں تُو ملا، میں اگرچہ ہوں ترا نقشِ پا
ترے جلوے جلوے کی ہے بقا، مرے شوقِ نام بنام سے

تری چشمِ مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش، یہ سب جنوں، اسی ایک گردشِ جام سے

یہ کتابِ دل کی ہیں آیتیں، میں بتاؤں کیا جو ہیں نسبتیں
مرے سجدہ ہائے دوام کو، ترے نقش ہائے خرام سے

مجھے چاہیئے وہی ساقیا! جو برس چلے، جو چھلک چلے
ترے حُسنِ شیشہ بدست سے، تری چشمِ بادہ بجام سے

جو اُٹھا ہے درد، اُٹھا کرے، کوئی خاک اس سے گلہ کرے
جسے ضد ہو حُسن کے ذکر سے، جسے چڑ ہو عشق کے نام سے

وہیں چشمِ حُور پھڑک گئی، ابھی پی نہ تھی کہ بہک گئی
کبھی یک بیک جو چھلک گئی، کسی رندِ مست کے جام سے

تو ہزار عذر کرے، مگر ہمیں شک ہے اور ہی کچھ جگر!
ترے اضطرابِ نگاہ سے، تری احتیاطِ کلام سے



اب مرے سامنے ٹھہرے تو گُلستاں کوئی ۔۔۔ ہو چلا ہے مری صُورت سے نُمایاں کوئی
چُھپ کے رہتا ہے کہیں رازِ گُلستاں کوئی؟ ۔۔۔ غنچے غنچے کی زباں سے ہے گُل افشاں کوئی

اب اسے وصل کہے یا غمِ ہجراں کوئی
پردۂ یاس میں ہے سلسلہ جنباں کوئی

اس طرح آج سے محسوسِ رگِ جاں کوئی
ایک اک سانس میں جیسے ہو خراماں کوئی

خیر ہے آپ نے کیوں غیظ میں تیور بدلے؟
اپنی ناکام محبت پہ ہے نازاں کوئی

کیا وہ نظروں کا مری حُسنِ تلاطم سمجھے
جس نے دیکھا ہی نہ ہو جلوۂ رقصاں کوئی

چشمِ دیوانگیٔ شوق یہاں بھی نہ کھلی!
عرصۂ حشر ہے اور مست و غزل خواں کوئی

عشق بھی رنگ تعیّن کا اُٹھا دے پردہ
سامنے آئے تو بے قیدِ رگِ جاں کوئی

بے حقیقت نہ سمجھ ناصحِ ناداں ان کو
انہیں اشکوں میں نہ ہو حُسن کا طوفاں کوئی

شوق نے توڑ دیئے وہ بھی جو باقی تھے قیود
لُوٹ لے آ کے بہارِ چمنِ جاں کوئی

اور کیا چاہتی ہے، بُلبلِ شوریدہ مزاج؟
پردۂ گُل میں ہے، خود چاک گریباں کوئی

یک بیک سامنے آیا نہ کرو بے پردہ
لے کے اُڑ جائے نہ، یہ عالمِ امکاں کوئی

غنچے اُس کے ہیں، گُل اس کے ہیں، بہاریں اُس کی
خون سے اپنے بنائے جو گلستاں کوئی

نگہِ یار کے مخصوص اشاروں کے سوا
مذہبِ عشق میں ہے کُفر نہ ایماں کوئی

اللہ اللہ! مرے جوشِ جنوں کی لہریں
نظر آ جاتا ہے جب چاک گریباں کوئی

چاہیئے تیرے تصوّر سے بھی ایسے میں گریز
کیوں کرے تجھ کو شریکِ غمِ ہجراں کوئی

ہائے وہ حُسن کا انداز کہ جس وقت جگر
عشق کے بھیس میں ہوتا ہے نُمایاں کوئی



نظر فروز رہے، سامعہ نواز رہے
زہے مجاز کہ وہ زینتِ مجاز رہے!

کہاں جمالِ حقیقت؟ کدھر مجاز رہے؟
جو تیرے رخ پہ نہ حائل حجابِ ناز رہے

ہمیں وہ اب ہیں جو کھوئے ہوئے سے پھرتے ہیں
ہمیں وہ تھے کہ ترے رازدارِ راز رہے

الٰہی! اس دلِ راز آشنا کو کیا کہیئے؟
جو اس طرح سے بھی نا آشنائے راز رہے

نفس کے پردے میں بھی ہے اسی کا عکسِ جمال
بہت نہ سوزِ محبت نفس گداز رہے

کُھلا یہ راز تری جلوہ گاہِ قُربت میں
جو تجھ سے دُور رہے، آشنائے راز رہے

جبینِ سجدہ میں ایسی کبھی تڑپ تو نہ تھی
وہ آج خود بھی مگر شاملِ نماز رہے

ترے سوا تری محفل سے کیا غرض مجھ کو
خروشِ نغمہ رہے یا سکوتِ ساز رہے

تری امانتِ غم کا تو حق ادا کر لوں
خدا کرے، شبِ فرقت ابھی دراز رہے!

ترے بغیر تو جینا روا نہیں لیکن
میں کیا کروں، جو ترا غم ہی جاں نواز رہے

جراحتیں دلِ بسمل کی رُوح تک پہنچیں — دراز دستیٔ قاتل، ابھی دراز رہے

یہ حکمِ خاص ہے ساقی کا آج محفل میں
جگر سا ایک بھی کافر نہ پاک باز رہے



کچھ اس طرح وہ پسِ پردۂ مجاز رہے — حجاب ساز میں جیسے نوائے ساز رہے
نہ کوئی راز رہا ہے، نہ کوئی راز رہے — نفس نفس میں وہ خود ہی جو نے نواز رہے
تری نگہ جو اسی طرح گرم ناز رہے — بشر تو کیا، نہ فرشتہ بھی پاک باز رہے
خطا معاف، کسی اور کا تُو ذکر ہی کیا — نیاز مند ترے مجھ سے بے نیاز رہے
جنونِ سجدہ کو کیا اہلِ ہوش سے مطلب؟ — ترا خیال بھی کیوں شاملِ نماز رہے
یہاں تو کام ہے اِک نشترِ توجہ سے — نگاہِ قہر رہے یا نگاہِ ناز رہے
محبت اصلِ حقیقت، محبت اصلِ مجاز — وہ کم نظر تھے جو بیگانہ مجاز رہے
جبین و سجدہ کی توہین ہے جبیں سائی — جبین و سجدہ میں کچھ بھی جو امتیاز رہے
ترے نثار! عطا کر وہ اِک لطیف خلش — تمام عمر محبت کو جس پہ ناز رہے
نگاہِ ناز سے چھلکا رہا ہے مَے کوئی — وہ پاک باز نہیں، اب جو پاک باز رہے
زمانہ آج ہی غرقِ شراب تھا، زاہد! — کچھ اور دیر جو، وہ چشمِ نیم باز رہے

دکھاؤں عشق کی خود داریاں جگر! میں بھی
جو ایک بات پہ قائم غرورِ ناز رہے



مِلا[1] کے آنکھ نہ محروم ناز رہنے دے — تجھے قسم، جو مجھے پاک باز رہنے دے
میں اپنی جان تو قُربان کر چکوں تجھ پر — یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے
ترے ہی شیوۂ عاشق کُشی کی تجھ کو قسم — اسی طرح مژہ ہائے دراز رہنے دے
ہٹا نہ سینۂ عاشق سے رُخ کسی جانب — نگاہِ ناز کو نشتر نواز رہنے دے
گلے سے تیغِ ادا کو جُدا نہ کر قاتل! — ابھی یہ منظرِ راز و نیاز رہنے دے
یہ تیرِ ناز ہیں، تُو شوق سے چلائے جا — خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے
قتیلِ غمزۂ خوں ریز ہوں، قصور معاف! — اشارۂ نگہ دل نواز رہنے دے

---

[1] مسلسل

بجھا نہ آتشِ پنہاں کرم کے چھینٹوں سے
دلِ جگر کو مجسّم گداز رہنے دے



مجھے[1] ہلاک فریبِ مجاز رہنے دے — نہ چھیڑ، او نگہِ امتیاز! رہنے دے
یہ جان آج نکلتی ہے جس کے قدموں پر — خدا کرے، سرِ دامانِ ناز رہنے دے
میں رازِ عشق کو بیگانہ جہاں رکھوں — مگر، جو مصلحتِ حُسنِ ناز رہنے دے
خدا نے دی ہے یہ نعمت تو رکھ اسے بے عیب — غرورِ حُسن کو، تاجدِ ناز رہنے دے
یہ بات کیا کہ حقیقت وہی، مجاز وہی — مجاز ہے تو پھر اس کو مجاز رہنے دے
یہ جان ایک بلا نوش کی ہے، اے ساقی! — نہ پھینک دردِ مئے خانہ ساز، رہنے دے
یہ خانقاہ نہیں، پی بھی جا، ارے زاہد! — یہ میکدہ ہے، یہاں احتراز رہنے دے
ازل سے حسن تو عاشق نواز ہے لیکن — جو عشق ہی اسے عاشق نواز رہنے دے
اسے نہ آئینہ سمجھو، وہ اور ہی شے ہے — جس آئینہ کو خود آئینہ ساز رہنے دے
لُٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے — بس اِک تبسّمِ عاجز نواز رہنے دے

گذرتی ہے جو دلِ عشق پر، نہ پوچھ جگر
یہ خاص رازِ محبت ہے، راز رہنے دے



حال بھی، ماورائے حال بھی ہے — عشق ممکن بھی ہے، محال بھی ہے
پھر بھی تجھ سے ہزار شکوے ہیں — جانتا ہوں، مرا خیال بھی ہے
کرتے جاتے ہیں صاف عذرِ کرم — اور پھر پرسشِ ملال بھی ہے
دل کے ہر اضطرابِ نازک میں — شانِ بیتابیٔ جمال بھی ہے
ہر ستم ہے کرم کے پردے میں — اس ستم کی کوئی مثال بھی ہے
رہ گئے محوِ یک نظر ہو کر — اس کے فرصتِ خیال بھی ہے
دُور ہٹنا نہ منزلِ دل سے — وصل بھی ہے، یہیں وصال بھی ہے
چھائے جاتے ہیں دردِ دل بن کر — اس پہ تاکیدِ ضبطِ حال بھی ہے
حُسن کے ہر جمال میں پنہاں، — میری رعنائیٔ خیال بھی ہے
دل کو برباد کرکے بیٹھا ہوں — کچھ خوشی بھی ہے، کچھ ملال بھی ہے

---

[1] غیر مسلسل

لاکھ رسوا سہی جگرؔ، لیکن
خوش نظر بھی ہے، خوش خیال بھی ہے



کیا خاک سیر کیجئے دُنیائے رنگ وبُو کی
مہلت نہ آرزو کی، فُرصت نہ جستجُو کی

یہ حدِ آخری ہے عاشق کی جستجو کی
بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی

تم دل اسے سمجھ لو، یا جان آرزو کی
سینے میں اب سے پہلے اک بوند تھی لہو کی

اللہ شرم رکھ لے، تو میرے جنگ جُو کی
آئینہ رُو برو ہے، چوٹیں ہیں دو بدو کی

تو وہ بہار تازہ، دنیائے رنگ و بُو کی
اک بار جس نے دیکھا تا حشر آرزو کی

طے منزلیں ہوئی ہیں یوں عشق و آرزو کی
کچھ میں نے جستجو کی، کچھ اُس نے جستجو کی

اب کیا جواب دُوں میں، کوئی مجھے بتائے
وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں، کیوں میری آرزو کی

یہ ترکِ جستجو بھی، کیا ترکِ جستجو ہے
اس میں بھی پا رہا ہوں اِک شان جستجو کی

پھر دلنوازیاں ہیں، پھر چارہ سازیاں ہیں
پہچانتا ہوں نظریں اس شوخ فتنہ جُو کی

ہاں نشترِ نوازش! اک اور بھی اشارہ
محسوس ہو چلی ہے جنبش رگِ گلو کی

مایوس ہو کے پلٹیں جب ہر طرف سے نظریں
دل ہی کو بُت بنایا، دل ہی سے گفتگو کی

ناکامِ جستجو سب فریاد کر رہے ہیں
اے کاش! کوئی سُنتا فریاد جستجو کی

وہ ایک گوشۂ دل جس میں ہیں لاکھ شکوے
میں نے بہت چھپایا، اس کی نظر نہ چُوکی

آئے مرے مقابل جس کو ہو زعمِ تمکیں
تصویر کھینچتا ہوں اِک حُسنِ شعلہ خُو کی

عالم سے چھپنے والے! معلوم تیرا چھپنا
سو بار تجھ کو دیکھا، سو بار گفتگو کی

پردہ جب اُٹھ گیا ہے، دیکھا یہی ہے اکثر
اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کی

مجرم بنا ہوا ہُوں، اور یہ بھی جانتا ہُوں
میں وہ ہُوں، تو نے ظالم! خود جس کی آرزو کی

راتیں گذارتے ہیں یوں بیکسانِ فُرقت
جب دل کو آ چلا غش، تاروں سے گفتگو کی

دل خود بھی تنگ ہے اب، لیکن علاج اس کا
عادت سی پڑ گئی ہے ظالم کو جستجو کی

عین شگفتگی ہی حُسنِ شگفتگی ہے
چاکِ قبائے گُل کو حاجت نہیں رفو کی

تُو خوب جانتا ہے، اور جان و دل کے مالک!
ہر حال میں جگرؔ نے تیری ہی آرزو کی



یہ مے کشی ہے تو پھر شانِ مے کشی کیا ہے؟ — بہک نہ جائے جو پی کر، وہ رِند ہی کیا ہے؟
بس ایک سمت اُڑا جا رہا ہوں وحشت میں — خبر نہیں کہ خودی کیا ہے، بیخودی کیا ہے؟
میں زہرِ مرگ گوارا کروں کہ تلخیٔ زیست — مری خوشی تو ہے سب کچھ، تری خوشی کیا ہے؟
لبوں پر موجِ تبسم، نگہ میں برقِ غضب — کوئی بتائے، یہ اندازِ برہمی کیا ہے؟
کسے مجال کہ افشائے رازِ یار کرے — یہ زندگی ہی سے سمجھ کہ زندگی کیا ہے؟
ستم کشانِ محبت سے کوئی پُوچھے تو — اُمید پر ہے بھروسہ، امید ہی کیا ہے؟
کہاں کی خانقہ و مسجد و کنشت و بہشت — فقیر ہوں، مرے ساقی کے گھر کمی کیا ہے؟
یہ درس میں نے لیا مکتبِ محبت سے — کسی طرح جو بہل جائے، زندگی کیا ہے؟

اسی کے واسطے مے بھی ہے، مے کشی بھی جگر
خبر نہیں جسے مے کیا ہے؟ مے کشی کیا ہے؟



شائستۂ غرورِ تمنا نہ کیجئے — ایسی نگاہ سے مجھ دیکھا نہ کیجئے
تسکینِ مضطرب کا مداوا نہ کیجئے — وعدہ تو کیجئے مگر ایفا نہ کیجئے
محدودِ وصلِ شوق کی دُنیا نہ کیجئے — مر جائیے، یہ ننگ گوارا نہ کیجئے
رعنائی خیال کو رُسوا نہ کیجئے — ممکن بھی ہو تو عرضِ تمنا نہ کیجئے
کیا جانئے، کب آہ کی تاثیر جاگ اُٹھے! — گہری نگاہ سے مجھے دیکھا تو کیجئے
کافی ہے اک نگاہِ کرم التجا کے بعد — تازہ کوئی فسونِ تماشا نہ کیجئے
موسیٰ کی طرح کون سنے لن ترانیاں؟ — بے عیب ہے جو حُسن، تو پردا نہ کیجئے
یا دیکھ کر نہ دیکھئے کچھ ماسوائے دوست — یا دیکھنے کی طرح سے دیکھا نہ کیجئے
دیوانہ کر کے دیجئے پھر مجھ کو اذنِ ہوش — ہشیار کر کے پھر مجھے دیوانہ کیجئے
ماتم گسار کون ہے اب دل کی لاش پر؟ — کہتے نہ تھے کہ خونِ تمنا نہ کیجئے
تاثیرِ شوق و یاس کا پردا اُلٹ نہ دے — اتنے قریب سے مجھے دیکھا نہ کیجئے
ہر جلوہ ہے بجائے خود اِک دعوتِ نگاہ — کیا کیجئے جو تیری تمنا نہ کیجئے؟
یُوں چشمِ شوق دیکھ ہی لیتی ہے کچھ نہ کچھ — پردے کا ہے خیال تو پردا نہ کیجئے

تفسیرِ حُسن و عشق، جگر! مصلحت نہیں
افشائے رازِ قطرہ و دریا نہ کیجئے!



محبت میں جدھر دیکھو، بہارِ جاوِدانی ہے
ہجوم رنگ و بُو ہے، جس و نغمہ ہے، جوانی ہے
جنونِ عشق میں حاصل یہ لطفِ زندگانی ہے
نظر کو دل سے اور دل کو نظر سے بدگمانی ہے
ترے سر کی قسم، تجھ سا ہی اِک محبوبِ ثانی ہے
یہی نقشہ، یہی انداز، ایسی ہی جوانی ہے
خدایا، خیر کرنا، نبضِ بیمارِ محبت کی
کئی دن سے بہت برہم مزاجِ ناتوانی ہے
کسی کو آج مجبورِ ترنّم کر بھی دے، اے دل!
بہت مدّت ہوئی، خاموش سازِ لن ترانی ہے
الٰہی! بھیج دے ایسے میں اس جانِ تمنا کو
سکوتِ شب کا سناٹا ہے اور دل کی کہانی ہے
تجھے اے عشق سینے سے لگاؤں دیدہ و دل سے
ترے ہر درد میں پنہاں نشاطِ جاودانی ہے
یہ بتلا اور کچھ تیرے سوا کونین میں بھی ہے
یہ مانا جو بھی ہے تیرے سوا، اے دوست! فانی ہے
نہ کر آلودۂ لفظ و بیاں شرحِ محبت کو
محبت ہی بجائے خود زبانِ بے زبانی ہے
ترے حُسنِ حیات افروز کو دیکھا ہے جس دن سے
بہت مجھ کو عزیز اُس دن سے اپنی زندگانی ہے
الٰہی، شرم تیرے ہاتھ ہے آدابِ محفل کی!
وہ نازک طبع مہماں ہے، جنوں کی میہمانی ہے
لئے پھرتا ہوں اک تصویرِ حسرت اپنی آنکھوں میں
خُدا بخشے! دلِ مرحُوم کی زندہ نشانی ہے
انہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا، ظالم!
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

ترے جورِ مسلسل کی قسم، او پُوچھنے والے!
جگر کے حال پر تیرا کرم ہے، مہربانی ہے



جنونِ عشق کا اتنا تو حق ادا کرتے
اسے بھی اپنی طرح عالم آشنا کرتے
حیاتِ درد سہی، پھر بھی آہ کیا کرتے!
فنا کی چیز جو ہوتی، تو ہم فنا کرتے
تمام منظرِ ہستی کو ایک جا کرتے
پھر اپنی شرحِ محبت جُدا جُدا کرتے
محبت اصلِ حقیقت ہے، اس کو کیا کرتے؟
ہم التجا جو نہ کرتے، وہ التجا کرتے
وہ ہنس رہے ہیں مرے حال پر، ہنسا کرتے
یہ بہ رہے ہیں جو آنسو، یونہی بہا کرتے
نہ تھا پسند کہ محرومِ التجا کرتے
وگرنہ دل وہ کسی کا پسند کیا کرتے
یہ کیا مجال کہ ہم ترکِ التجا کرتے
دہن کو سی بھی جو لیتے، نظر کو کیا کرتے
نمازِ عشق یہاں ہے نفس نفس جاری
کبھی ادا ہی نہ ہوتی، اگر قضا کرتے
یقیں کرو کہ تمہاری جگہ جو ہم ہوتے
محبتوں کے خزانے لُٹا دیا کرتے
دل ایک شاہدِ معنی سہی، مگر پھر بھی
تمہارے سامنے ہم بے نقاب کیا کرتے؟
حجاب نے انہیں رکھا حجاب میں، ورنہ
جب آتے سامنے، اپنا ہی سامنا کرتے

وہ عرضِ شوق پر، اے کاش! اور کچھ نہ سہی — نگاہ نیچی کیے مسکرا دیا کرتے
نہ انتہا ہے، نہ کچھ ابتدا محبت کی — جو انتہا کوئی ہوتی تو ابتدا کرتے
نہیں جو وصل میسّر، نصیب ہجر تو ہے
ہم اتنے فرق کا اُن سے ملال کیا کرتے



عشق کی حد سے نکلتے، پھر یہ منظر دیکھتے — کاش! حُسنِ یار کو، ہم حُسن بن کر دیکھتے
غنچہ و گل دیکھتے، یا ماہ و اختر دیکھتے — تم نظر آتے ہمیں، ہم کوئی منظر دیکھتے
دُور جا کر دیکھتے، نزدیک آ کر دیکھتے — ہم سے ہو سکتا تو ہم ان کو برابر دیکھتے
فطرتِ مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں — ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے
پھر وہی حسرت ہے ساقی پھر اسی انداز سے — پھر سوا ساغر کے سب کچھ غرقِ ساغر دیکھتے
میرے چُپ رہنے پہ کیا وہ باز رہتے، چھیڑ سے — مسکرا کر دیکھتے، پھر مُسکرا کر دیکھتے
عشق سرتا پا نظر، نازک مزاجِ حُسن دوست — دیکھتے بھی ہم اگر اس کو تو کیونکر دیکھتے؟
مل گئیں نظروں سے نظریں، اور مل کر رہ گئیں — چشمِ ساقی دیکھ کر کیا جام و ساغر دیکھتے؟
تشنگانِ دید جلوہ میں ہمیں سمجھا ہے کیا؟ — تُم اگر صُورت دکھاتے، جان دے کر دیکھتے؟
مر مٹا اک بات پر کس آن سے، کس شان سے — آپ اگر ایسے میں ہوتے، دل کے تیور دیکھتے
زاہدِ مسجد نشیں ہے اور اک ٹوٹا سا ظرف — میکدے میں اہتمامِ جام و ساغر دیکھتے
وائے محرومیِ قسمت! رہ گئی حسرت یہی — ایک دن تو ہم انہیں اپنے میں آ کر دیکھتے
ہائے وہ چہرہ اور اس میں وہ تڑپتی بجلیاں — کاش اک دن پھر اسے گستاخ بن کر دیکھتے
دم بخود ہیں حضرتِ زاہد یہیں تک دیکھ کر — ہوش اُڑ جاتے، اگر شیشے سے باہر دیکھتے
یا مذاقِ دید کی تہمت نہ لیتے، اے جگر!
یا مجسّم دل، سراپا آنکھ بن کر دیکھتے!



کیا برابر کا محبت میں اثر ہوتا ہے؟ — دل اِدھر ہوتا ہے ظالم نہ اُدھر ہوتا ہے
ہم نے کیا کچھ نہ کیا، دیدہ و دل کی خاطر؟ — لوگ کہتے ہیں دُعاؤں میں اثر ہوتا ہے
دل تو یوں دل سے ملایا کہ نہ رکھا میرا — اب نظر کے لئے کیا حکمِ نظر ہوتا ہے؟
میں گنہگارِ جنوں، میں نے یہ مانا، لیکن — کچھ اُدھر سے بھی تقاضائے نظر ہوتا ہے
تو نے دیکھا ہی نہیں، تجھ سے کہوں کیا ناصح — وہ جو مخصوص اِک اندازِ نظر ہوتا ہے

کون دیکھے اسے بیتابِ محبت، اے دل!
تُو وہ نالے ہی نہ کر، جن میں اثر ہوتا ہے



خوشا بیداد! خُونِ حسرت بیداد ہوتا ہے
ستم ایجاد کرتے ہو، کرم ایجاد ہوتا ہے

بظاہر کچھ نہیں کہتے مگر ارشاد ہوتا ہے
"ہم اُس کے ہیں جو ہم پر ہر طرح برباد ہوتا ہے"

مرے ناشاد رہنے پر وہ جب ناشاد ہوتا ہے
بتاؤں کیا، جو میرا عالمِ فریاد ہوتا ہے

یہی ہے رازِ آزادی، جہاں تک یاد ہوتا ہے
کہ نظریں قید ہوتی ہیں تو دل آزاد ہوتا ہے

دلِ عاشق بھی کیا مجموعہ اضداد ہوتا ہے
اُدھر آباد ہوتا ہے، اِدھر برباد ہوتا ہے

وہ ہر اک واقعہ جو صورتِ افتاد ہوتا ہے
کبھی پہلے بھی دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

بڑی مشکل سے پیدا، اک وہ آدم زاد ہوتا ہے
جو خود آزاد، جس کا ہر نفس آزاد ہوتا ہے

نگاہیں کیا کہ پہروں دل بھی واقف ہو نہیں سکتا
زبانِ حُسن سے ایسا بھی کچھ ارشاد ہوتا ہے

تمہیں ہو طعنہ زن مجھ پر، تمہیں انصاف سے کہدو
کوئی اپنی خوشی سے خانماں برباد ہوتا ہے؟

یہ مانا تنگِ پابندی سے کیا آزاد کو مطلب؟
مگر وہ شرمِ آزادی سے بھی آزاد ہوتا ہے

تصوّر میں ہے کچھ ایسا تری تصویر کا عالم
کہ جیسے اب لبِ نازک سے کچھ ارشاد ہوتا ہے

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی!
سناتا جا رہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے



یوں بھی مجھے تو حاصل آرامِ جاں نہیں ہے
اب تُو جو مہرباں ہے، دل مہرباں نہیں ہے

جو داستاں ہے اپنی، افسانہ ہے کسی کا
شاید مرے دہن میں میری زباں نہیں ہے

ہاں اے جمالِ جاناں! اک اور بھی تجلّی
دُنیا مری نظر میں اب تک جواں نہیں ہے

ہر لحظہ کہہ رہا ہے، یہ انقلابِ فطرت
یعنی جہاں ابھی تھی، دُنیا وہاں نہیں ہے

دل کی جراحتوں کو کچھ دل ہی جانتا ہے
ظاہر میں دیکھئے تو کوئی نشاں نہیں ہے

شاید تری نظر سے کچھ رازِ دل سمجھ لوں
کہتے ہیں عشق جس کو میری زباں نہیں ہے

جو کچھ میں دیکھتا ہوں، میری نظر سے دیکھو
عینِ مشاہدہ ہے، وہم و گماں نہیں ہے

تیرے کرم کے صدقے، کرلے ستم بھی شامل
دل شادماں ہے لیکن غم شادماں نہیں ہے



دل ترے عشق میں ناشاد بھی ہے، شاد بھی ہے
یہی نغمہ، یہی فریاد، یہی یاد بھی ہے
اب بھی کیا دل کو نہ سمجھو گے سزا وارِ سزا
مجرمِ شوق بھی ہے ملزمِ فریاد بھی ہے
تم میری آنکھ سے دیکھو تو یہ دُنیائے جمال
ہائے کیا چیز مرا عشق خدا داد بھی ہے!
ہر وہ ناچیز سا ذرّہ جسے تم دیکھتے ہو
اُس کو سُن لو تو یہ نغمہ بھی ہے، فریاد بھی ہے
تم جو ایسے میں چلے آؤ تو رولوں دم بھر
صبح کا وقت بھی ہے، خاطرِ ناشاد بھی ہے
اب کہاں، آہ، مجھے فرصتِ یک لحظہ جگر؟
سینۂ عشق بھی ہے، نشترِ فریاد بھی ہے



وہ کون ہے ایسا کہ تری شکل دکھا دے
احسان ہے اس کا جو مجھے مجھ سے ملا دے
ہاں، جذبِ غمِ عشق کی تاثیر دکھا دے
مجبور نہ بن حُسن کو مجبور بنا دے
تو چاہے تو اے جلوۂ اعجازِ محبت
تصویر کو تصویر کا دیوانہ بنا دے
تُو حُسن ہے، میں عشق ہوں، تُو جاں ہے، میں جسم
کس کی ہے یہ طاقت کہ مجھے تجھ سے چھڑا دے؟
اے جانِ دو عالم! ترے عالم کے تصدّق
اپنا جو بنایا ہے، تو اپنا سا بنا دے
جنّت میں بھی ایسا تو نہ ہو گا گلِ خنداں
اے زخمِ جگر! نیتِ قاتل کو دُعا دے



کیوں دُور ہٹ کے جائیں، ہم دل کی سرزمیں سے
دونوں جہاں کی سیریں حاصل ہیں سب یہیں سے
یہ راز سُن رہے ہیں اِک موجِ تہ نشیں سے
ڈوبے ہیں، ہم جہاں پر، اُبھریں گے پھر وہیں سے
خونِ وفائے بسمل، جرمِ نگاہِ قاتل
ظاہر تو ہر جگہ ہے، ثابت نہیں کہیں ہے
اس چشمِ خشک سے تم چھیڑیں تو کر رہے ہو
تڑپے نہ موج کوئی دریائے آستیں سے
انکار اور اس پر اصرار، وہ بھی پیہم
تم مجھ کو چاہتے ہو، ثابت ہوا یہیں سے
اب کیا بتاؤں کیا کیا عالم گزر رہے ہیں!
میرے دلِ حزیں پر، میرے دلِ حزیں سے
یوں آج مل رہا ہے جانِ جگر سے کوئی!
جس طرح مل رہا ہو کوئی حسیں، حسیں سے



اے حُسنِ یار شرما، یہ کیا انقلاب ہے
تجھ سے زیادہ درد ترا کامیاب ہے
جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے
پانی بھی ہے شراب، ہوا بھی شراب ہے

جو خود نہ زندگی ہو نہ پیغامِ زندگی!
وہ حُسن قہر ہے، وہ محبت عذاب ہے
عاشق کی بے دلی کی تغافل نہیں جواب
اس کا بس ایک جوشِ محبت جواب ہے
تیری عنایتیں کہ نہیں نذرِ جاں قبول
تیری نوازشیں، کہ زمانہ خراب ہے
اے حُسن! اپنی حوصلہ افزائیاں تو دیکھ
مانا کہ چشمِ شوق بہت بے حجاب ہے
میں عشقِ بے پناہ ہوں، تم حُسنِ بے پناہ
میرا جواب ہے، نہ تمہارا جواب ہے
میخانہ ہے اسی کا، یہ دُنیا اسی کی ہے
جس تشنہ لب کے ہاتھ میں جامِ شراب ہے
اُس سے دلِ تباہ کی رُو داد کیا کہوں؟
جو یہ نہ سُن سکے کہ زمانہ خراب ہے
اے محتسب! نہ پھینک، مرے محتسب! نہ پھینک
ظالم!! شراب ہے، ارے ظالم!! شراب ہے
اپنے حدُود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں
جو ذرّہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج؟
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے
میری نگاہِ شوق بھی کچھ نہیں، مگر
پھر بھی ترا شباب، ترا ہی شباب ہے
مانوسِ اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے؟
اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہے
میں اس کا آئینہ ہوں، وہ ہے میرا آئینہ
میری نظر سے اس کی نظر کامیاب ہے
تنہائیِ فراق کے قُربان جایئے
میں ہوں، خیالِ یار ہے، چشمِ پُرآب ہے
سرمایۂ فراقِ جگر! آہ کچھ نہ پوچھ
اک جان ہے سو اپنے لئے خود عذاب ہے



سُنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے
جس حال میں ہوں، اب مجھے افسوس نہیں ہے
زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہیں ہے
سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جو ننگِ جبیں ہے
جس دل میں تری یاد ہے، تو صدر نشیں ہے
وہ دل بھی حسیں، اس کی محبت بھی حسیں ہے
وہ آئے ہیں، اے دل! ترے کہنے کا یقیں ہے
لیکن میں کیا کروں، مجھے فُرصت ہی نہیں ہے
جس رنگ میں دیکھو اسے، وہ پردہ نشیں ہے
اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے
ہر ایک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے
پوچھو تو کہیں بھی نہیں، دیکھو تو یہیں ہے
نزدیک ہو یا دُور، جہاں تم ہو وہیں ہے
عاشق وہی عاشق ہے، جو مجبُور نہیں ہے
یہ دل ہے ترا دل، مجھے کیا تابِ تصرف
تو دیکھ لے، جو چیز جہاں پر تھی، وہیں ہے
میری ہی طرح وہ بھی نہ ہو ہجر میں بیتاب
ہر سانس کے ساتھ آج اک آوازِ حزیں ہے
اس طرح نہ ہو گا کوئی عاشق بھی تو پابند
آواز جہاں دو اُسے، وہ شوخ وہیں ہے

مجھ سے کوئی پوچھے ترے ملنے کی ادائیں
دُنیا تو یہ کہتی ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے

کیا ذوق ہے، کیا شوق ہے، کیا ربط ہے، کیا ضبط
سجدہ ہے جبیں میں، کبھی سجدہ میں جبیں ہے

ہر لحظہ نیا جلوہ، نئی آن، نئی شان
میری نگہِ شوق بھی، کیا شوخ حسیں ہے!

میں بے اثرِ جذبِ محبت سہی، لیکن
کیا کم ہے، وہ میرے لئے بیتاب نہیں ہے

میں اور ترے ہجرِ جفا کار کے صدقے
اس بات پہ جیتا ہوں کہ مرنے کا یقیں ہے

معلوم ہیں اس سحر نگاری کے کرشمے!
دنیا میرے نزدیک جو ہے بھی، تو نہیں ہے

اس بزمِ حقیقت کی حقیقت میں کہوں کیا؟
نغموں کا تلاطم تو ہے، آواز نہیں ہے

کس کس سے ترے عشق میں دامن کو چھڑاؤں؟
کونین ہے اور ایک مری جانِ حزیں ہے



تڑپ کر انہیں تڑپا رہا ہے
قیامت پہ قیامت ڈھا رہا ہے

عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے
حسیں جیسے کوئی شرما رہا ہے

یہ کیسا دل پہ عالم چھا رہا ہے
کہ تجھ سے مل کے بھی گھبرا رہا ہے

نگاہوں سے نگاہیں لڑ رہی ہیں (قطعہ)
مزے دردِ محبت پا رہا ہے

پیامِ شوق کا اب پوچھنا کیا!
برابر آ رہا ہے، جا رہا ہے

وہ زُلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں
جہانِ آرزو، تھرّا رہا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ کچھ دل کو مرے سمجھا رہے ہیں
کچھ اُن کو دل مرا سمجھا رہا ہے

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

ازل ہی سے چمن بند محبت (قطعہ)
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے

کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے
وہیں اک پھول بھی مُرجھا رہا ہے



طبیعت ہے کہ ٹھہری جا رہی ہے
زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے

مری رُودادِ غم وہ سُن رہے ہیں
تبسم سا لبوں پر آ رہا ہے

سنبھل بیٹھیں حریفانِ شہادت
زباں پر نامِ قاتل آ رہا ہے

غمِ دل کو خدا آباد رکھے!
نشاطِ سرمدی برسا رہا ہے

ملا ہے آج اذنِ باریابی!!
ہر اک پردہ اُٹھایا جا رہا ہے

جگؔر ہی کا نہ ہوا فسانہ کوئی
در و دیوار کو حال آ رہا ہے

☆——☆——☆

دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے — آہ ہوتی ہے، واہ ہوتی ہے
جو بجائے خود، آہ ہوتی ہے — ہائے وہ کیا نگاہ ہوتی ہے
میرے غم خانۂ مصیبت کی — چاندنی بھی سیاہ ہوتی ہے
اک نظر دل کی سمت دیکھ تو لو — کیسی دُنیا تباہ ہوتی ہے
حُسنِ جاناں کی منزلوں کو نہ پُوچھ — ہر نفس ایک راہ ہوتی ہے
کیا خبر تھی کہ عشق کے ہاتھوں (قطعہ) — ایسی حالت تباہ ہوتی ہے
سانس لیتا ہوں، دم اُلجھتا ہے — بات کرتا ہوں، آہ ہوتی ہے

☆——☆——☆

جو اُلٹ دیتی ہے صفیں کی صفیں — اک شکستہ سی آہ ہوتی ہے
یوں نہ پردہ کرو خُدا کے لئے — دیکھو دُنیا تباہ ہوتی ہے
وقفۂ ہوشِ عشق، آہ، نہ پُوچھ! — فُرصتِ یک نگاہ ہوتی ہے
آہِ پیہم یہ تھا مدارِ حیات — وہ بھی اب گاہ گاہ ہوتی ہے
وہ بھی ہے اِک مقامِ عشق جہاں — ہر تمنا گناہ ہوتی ہے
وہ سرہانے کھڑے ہیں اور یہاں — رُخصتِ اشک و آہ ہوتی ہے
حاصلِ حسن و عشق اسے سمجھو — وہ جو پہلی نگاہ ہوتی ہے
ایک ایسا بھی وقت ہوتا ہے — مُسکراہٹ بھی آہ ہوتی ہے
ہم سے پُوچھو، تو عشق کی بھی نگاہ — سخت کافر نگاہ ہوتی ہے
حسن کو بھی جو رنگ دیتی ہے — ایک سادہ نگاہ ہوتی ہے

دردِ بے وجہ کو نہ چھیڑ جگؔر !
یہ خوشی گاہ گاہ ہوتی ہے

☆——☆——☆

خار کو گُل اور گُل کو خار جو چاہے کرے — تُو نے جو چاہا کیا، اے یار! جو چاہے کرے
مست، بیخود، عاقل و ہشیار، جو چاہے کرے — شوخیٔ طرزِ تپاکِ یار، جو چاہے کرے
اس نے یہ کہہ کر دیا دل کو فریبِ جُستجو — حشر تک اب عاشقِ ناچار جو چاہے کرے
تھا ابھی جلوہ، ابھی پردہ، ابھی کچھ بھی نہیں — آپ کی یہ حسرتِ دیدار جو چاہے کرے

ہر حقیقت حُسن کی ہے، بے نیاز اعتراف
اب کوئی اقرار یا انکار، جو چاہے کرے



عشق کی چوٹ چل ہی جاتی ہے — آہ دل سے نکل ہی جاتی ہے
خُوب رو لے فراق میں اے دل — کچھ طبیعت سنبھل ہی جاتی ہے
فطرتِ عشق لاکھ پتھر ہو — اک نہ اک دن پگھل ہی جاتی ہے
موجِ خوں ہو کر موجِ بادۂ ناب — جوش کھا کر اچھل ہی جاتی ہے
ہم سے ایسی چلی، کہ بس توبہ!
ورنہ آپس میں چل ہی جاتی ہے



کیا بتائیں عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے — یہ سمجھ لو، جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے
جب نہیں تم تو تصوّر بھی تمہارا کیا ضرور؟ — اس سے بھی کہہ دو کہ یہ تکلیف کیوں فرمائے ہے
ہائے، وہ عالم نہ پوچھو اضطرابِ عشق کا — یک بیک جس وقت کچھ کچھ ہوش سا آجائے ہے
کس طرف جاؤں؟ کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں؟
اے ہجومِ نامُرادی! جی بہت گھبرائے ہے



سُن کہتے ہیں جلوں کی یہ کثرت نظر آئی — اللہ کو اللہ کی صُورت نظر آئی
جب دل پہ نظر کی، تری صورت نظر آئی — آغوشِ محبت میں محبت نظر آئی
ہو گا تری محفل میں کوئی اور بھی جلوہ
مجھ کو تو محبت ہی محبت نظر آئی



ہر اک سے بیگانہ بن رہے ہیں، کسی کی جانب نظر نہیں ہے
خبر وہ رکھتے ہیں اس طرح سے کہ جیسے کوئی خبر نہیں ہے
فراق بھی ہے، وصال بھی ہے، ہر ایک لحظہ، ہر ایک ساعت
فراق کیا ہے، وصال کیا ہے؟ جو کوئی پُوچھے، خبر نہیں ہے
تجھے نہیں مجھ سے رابطہ اصلاً، یہ میں نے مانا، مگر یہ بتلا
مرے تصوّر میں کیوں ہے ایسا، تری توجہ اگر نہیں ہے

مری یہ ہستی، مری یہ طاقت، کہ تیرِ دل دوزِ عشق روکوں
مری طرف سے یہ کون ہے پھر، جو خود وہ سینہ سپر نہیں ہے
شباب میکش، جمال میکش، خیال میکش، نگاہ میکش!
خبر وہ رکھیں گے کیا کسی کی؟ انھیں خود اپنی خبر نہیں ہے



نظر سے حُسنِ دو عالم گرا دیا تُو نے
نہ جانے کونسا عالم دکھا دیا تُو نے
کمالِ حُسن کا عالم دکھا دیا تُو نے
چراغ سامنے رکھ کر بجھا دیا تُو نے
جوابِ حُسنِ طلب اور کیا دیا تُو نے؟
تمام شکوہ شکایت بنا دیا تُو نے
فنائے عشق کو رنگِ بقا دیا تُو نے
حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تُو نے
ہزار جانِ گرامی فدا بایں نسبت!
کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تُو نے
یہ کیا کیا، کہ عطا کرکے عشقِ لامحدود
مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تُو نے
جمالِ حُسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر!!
نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تُو نے
ہزار دل کو مٹا کر، دیا مجھے اک درد
اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تُو نے
خوشا وہ دردِ محبت، زہے وہ دل کہ جسے!
ذرا سکون ہُوا، گدگدا دیا تُو نے
ہرِ ایک دل کو عطا کرکے مدعائے حیات
جگر کو اک دل بے مدعا دیا تُو نے



شوق گستاخ کا چہرے پر اثر دیکھ نہ لے
ڈر رہا ہوں کہ وہ سفّاک ادھر دیکھ نہ لے
لب تو خلوت میں بھی اٹھتی نہیں چہرے سے نقاب
ڈر یہ ہے کوئی پسِ پردۂ در دیکھ نہ لے
عاشقوں کی نگہِ شوق کہیں تھکتی ہے!
دیکھتے ہی رہیں اس کو وہ اگر دیکھ نہ لے
اب نظر خاک اُٹھے، عزمِ نظر کے ہمراہ
دل دھڑکتا ہے کہ وہ شوخ اِدھر دیکھ نہ لے
میں تو اس چھپنے کے صدقے کہ یہ اب ضد ہے انہیں
حُسن کو عشق کی صُورت میں جگر دیکھ نہ لے



دل کو اشکوں سے جو خالی کوئی کر دیتا ہے
ساقیٔ غیب پھر اس جام کو بھر دیتا ہے
مست ہو جاتا ہے، بیخود مجھے کر دیتا ہے
درد اُٹھ کر تری آمد کی خبر دیتا ہے
تُو نے ٹانکے جو دیئے تھے، وہ مگر ٹوٹ گئے
آج پھر خون ہر اک زخمِ جگر دیتا ہے

دیکھ سکتا نہیں، ساقی مری محرومی کو
جام خالی نہیں ہوتا ہے کہ بھر دیتا ہے



وہ کافر آشنا، نا آشنا، یوں بھی ہے، اور یوں بھی
ہماری ابتدا تا انتہا، یوں بھی ہے، اور یوں بھی
تعجب کیا؟ اگر رسمِ وفا یوں بھی ہے، اور یوں بھی
کہ حسن و عشق کا ہر مسئلہ یوں بھی ہے، اور یوں بھی
کہیں ذرّہ، کہیں صحرا، کہیں قطرہ، کہیں دریا
محبت اور اس کا سلسلہ یوں بھی ہے، اور یوں بھی
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں، ایک مقصد میری ہستی کا
بتاؤں کیا کہ میرا مدعا یوں بھی ہے، اور یوں بھی
ہم اُن سے کیا کہیں؟ وہ جانیں، اُن کی مصلحت جانے
ہمارا حالِ دل تو برملا یوں بھی ہے، اور یوں بھی
نہ پالینا ترا آساں نہ کھو دینا ترا ممکن
مصیبت میں یہ جانِ مبتلا یوں بھی ہے، اور یوں بھی
لگا دے آگ، اور برقِ تجلّی! دیکھتی کیا ہے؟
نگاہِ شوق ظالم! نارسا یوں بھی ہے اور یوں بھی
الٰہی! کس طرح عقل و جنوں کو ایک جا کرلوں؟
کہ منشائے نگاہِ عشوہ زا، یوں بھی ہے، اور یوں بھی
مجازی[1] سے جگرؔ کہہ دو! ارے او عقل کے دشمن
مقر ہو یا کوئی منکر، خدا یوں بھی ہے، اور یوں بھی



ترے جمالِ حقیقت کی تاب ہی نہ ہوئی
ہزار بار نگہ کی، مگر کبھی نہ ہوئی
تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی
کہاں وہ شوخ، ملاقات خود سے بھی ہوئی
بس ایک بار ہوئی اور پھر کبھی نہ ہوئی
وہ ہم ہیں اہلِ محبت کہ جان سے، دل سے
بہت بخار اُٹھے، آنکھ شبنمی نہ ہوئی
ٹھہر ٹھہر، دلِ بیتاب، پیار تو کرلوں
اب اس کے بعد ملاقات پھر ہوئی نہ ہوئی
میرے خیال سے بھی آہ! مجھ کو بُعد رہا
ہزار طرح سے چاہا، برابری نہ ہوئی
ہم اپنی رندی و طاعت پہ خاک ناز کریں!
قبول حضرتِ سلطان ہوئی ہوئی نہ ہوئی
کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ایسی چشمِ توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی
تمام حرف و حکایت، تمام دیدہ و دل
اس اہتمام پہ بھی شرحِ عاشقی نہ ہوئی
فسردہ خاطریٔ عشق، اے معاذ اللہ!
خیالِ یار سے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی
تری نگاہِ کرم کو بھی آزما دیکھا
اذیتوں میں نہ ہونی تھی کچھ کمی، نہ ہوئی
کسی کی مست نگاہی نے ہاتھ تھام لیا
شریکِ حال جہاں میری بیخودی نہ ہوئی

---

[1] مجازیؔ ایک لکھنوی منکرِ خدا کا تخلّص ہے جو اتفاق سے میرے دوست بھی ہیں (جگرؔ)

صبا! یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی
وہ کچھ سہی نہ سہی، پھر بھی زاہدِ ناداں
بڑے بڑوں سے محبت میں کافری نہ ہوئی
اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی، اُن سے آہ بھی نہ ہوئی
خیالِ یار، سلامت تجھے خدا رکھے!
ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی
گئے تھے ہم بھی جگرؔ جلوہ گاہِ جاناں میں
وہ پوچھتے ہی رہے، ہم سے بات بھی نہ ہوئی



زخم وہ دل پہ لگا ہے کہ دکھائے نہ بنے
اور چاہیں کہ چھپا لیں تو چھپائے نہ بنے
ہائے بیچارگیٔ عشق کی اس محفل میں
سر جھکائے نہ بنے، آنکھ اٹھائے نہ بنے
یہ سمجھ لو کہ غمِ عشق کی تکمیل ہوئی
ہوش میں آکے بھی جب ہوش میں آئے نہ بنے
کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ
مُنہ چھپائے نہ بنے، سامنے آئے نہ بنے
ہائے وہ عالمِ پُر شوق کہ جس وقت جگرؔ
اُس کی تصویر بھی سینے سے لگائے نہ بنے



یادِ جاناں بھی عجب رُوح فزا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنّت کی ہوا آتی ہے
میری جانب نگہِ ہوش رُبا آتی ہے
پھر وہی ظالم مظلوم نُما آتی ہے
جا بھی، اے ناصحِ ناداں! نہ کر اس کو بدنام
ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے
مرگِ ناکامِ محبت! میری تقصیر معاف
زیست بن بن کے میرے حق میں قضا آتی ہے
نہیں معلوم، وہ خود ہیں کہ محبت اُن کی
پاس ہی سے کوئی بیتاب صدا آتی ہے
میں تو اس سادگیٔ حسن پہ اس کے صدقے
نہ جفا آتی ہے جس کو نہ وفا آتی ہے
ہائے کیا چیز ہے یہ تکملۂ حُسن و شباب!
اپنی صورت سے بھی اب اُن کو حیا آتی ہے



کون یہ جانِ تمنّا عشق کی منزل میں ہے
جو تمنّا دل سے نکلی، پھر جو دیکھا، دل میں ہے
وہ کچھ اس صُورت سے آئے جلوہ دکھاتے ہوئے
میں یہ سمجھا وسعتِ کونین میرے دل میں ہے
شاید اُٹھنے ہی کو ہے پردہ رُخِ مقصود سے
آج حاصل کی سی عزّت سعٔی لاحاصل میں ہے
اے میں قُرباں! واہ کیا کہنا ترا اعجازِ عشق!
اک سکونِ مستقل بھی اضطرابِ دل میں ہے

اس شہیدِ ناز کے کیا خوں بہا کا پوچھنا — جس کی رُو داد مکمل دامنِ قاتل میں ہے
اُٹھ گیا، آخر محبت کا بھی پردہ اُٹھ گیا — اب نہ میرے دل میں حسرت ہے، نہ اُن کے دل میں ہے
کیا کہیں خونِ دو عالم سے بھی اب بجھتی ہے پیاس — خونِ بسمل کی حرارت خنجرِ قاتل میں ہے
میں ہُوا جب سے غریقِ موجِ طوفاں خیزِ عشق — ڈوب مرنے کی تمنا سینۂ ساحل میں ہے
دیکھئے کرتی ہے کیا کیا ان کی نظروں میں حقیر — یہ جو ظالم، اک لہو کی بُوند اب تک دل میں ہے

بیخودی، منزل سے بھی کوسوں نکل آئی جگر
جستجو آوارہ اب تک جادۂ منزل میں ہے



آئے زباں پہ رازِ محبت، محال ہے — تُم سے مجھے عزیز تمہارا خیال ہے
نازک ترے مریضِ محبت کا حال ہے — دن کٹ گیا تو رات کا کٹنا محال ہے
دل تھا ترے خیال سے پہلے چمن چمن — اب بھی روش روش ہے، مگر پائمال ہے
کم بخت اس جنونِ محبت کو کیا کروں؟ — میرا خیال ہے نہ تمہارا خیال ہے

آنکھیں تو کھول، سر تو اُٹھا، دیکھ تو ذرا
کب سے، جگر، وہ چاند سا چہرہ نڈھال ہے



محبت آپ اپنی ترجماں ہے — یہی خود چشم و دل، لفظ و بیاں ہے
نگاہوں میں بہارِ جاوداں ہے — جہاں مَیں ہوں، وہیں اب آشیاں ہے
محبت دونوں جانب مہرباں ہے — کہ ہم اس سے، وہ ہم سے بدگماں ہے
وہ کب سے مضطرب ہیں، اے غمِ عشق! — خُدا جانے، تیری غیرت کہاں ہے
ہماری رفعتوں کا پوچھنا کیا! — جہاں ہم پاؤں رکھ دیں، آسماں ہے
کوئی آواز ہی دے گم شدہ دل! — کہاں ہے، اور مرے یوسف کہاں ہے؟
اگر تو ہے، تو اے جانِ دو عالم! — یہاں ہر شے جواں ہے، جاوداں ہے
مزے سوزِ دروں کے مل رہے ہیں — بحمد اللہ کہ دل آتش بجاں ہے
تماشا دیدنی ہے، دیکھ جاؤ — زبانِ شوق و گلبانگِ فغاں ہے
مبارک باد، اے جذبِ محبت — انہیں اپنے پر اب میرا گماں ہے
کسی کو اک نظر ہی دیکھ تو لیں — اب اتنی بھی ہمیں جرأت کہاں ہے؟
ترے نقشِ قدم کا ذرہ ذرہ! — عبادت گاہِ جانِ عاشقاں ہے

الٰہی خیر کرنا! دیر سے پھر بہت مضطر نگاہِ رازداں ہے
پھنکا جاتا ہے دل جس سوزِ غم سے جہنّم میں یہ چنگاری کہاں ہے؟

جو پڑھ سکتا ہے، تو پڑھ، اے غمِ دل!
کہ ان نظروں میں آج اک داستاں ہے



کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جب تک ہمارے پاس رہے، ہم نہیں رہے

ایمان و کفر اور نہ دُنیا و دیں رہے
اے عشق! شادباش کو تنہا ہمیں رہے

عالم جب ایک حال پہ قائم نہیں رہے
کیا خاک اعتبارِ نگاہِ یقیں رہے

میری زباں پہ شکوۂ دردِ آفریں رہے
شاید مرے حواس ٹھکانے نہیں رہے

جب تک الٰہی! جسم میں جانِ حزیں رہے
نظریں مری جوان رہیں، دل حسیں رہے

یا رب! کسی کے رازِ محبت کی خیر ہو
دستِ جنوں رہے نہ رہے، آستیں رہے

تاچند جوشِ عشق میں دل کی حفاظتیں؟
میری بلا سے اب وہ جنونی کہیں رہے

جا اور کوئی ضبط کی دُنیا تلاش کر
اے عشق! ہم تو اب ترے قابل نہیں رہے

مجھ کو نہیں قبول دو عالم کی وسعتیں!
قسمت میں کوئے یار کی دو گز زمیں رہے

اے عشقِ نالہ کش! تیری غیرت کو کیا ہُوا؟
ہے ہے! عرق عرق وہ تنِ نازنیں رہے

دردِ غمِ فراق کے یہ سخت مرحلے
حیراں ہوں میں کہ پھر بھی تم اتنے حسیں رہے!

اللہ ری چشمِ یار کی مُعجز بیانیاں!
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

ظالم اُٹھا تو پردۂ وہم و گمان و فکر
کیا سامنے وہ مرحلہ ہائے یقیں رہے؟

ذات و صفاتِ حُسن کا عالم نظر میں ہے
محدودِ سجدہ کیا مرا ذوقِ جبیں رہے؟

کس درد سے کسی نے کہا آج بزم میں؟
"اچھا یہ ہے، وہ ننگِ محبت یہیں رہے"

سر داد گانِ عشق و محبت کی کیا کمی؟
قاتل کی تیغ تیز، خُدا کی زمیں رہے

اس عشق کی تلافیٔ مافات دیکھنا!
رونے کی حسرتیں ہیں، جب آنسو نہیں رہے



دیکھ لے تو بھی کہ اب خیر نہیں جانوں کی
آج ہولی ہے ترے سوختہ سامانوں کی

چاہتے ہیں، نہ رہے حدِ تعیّن کوئی
ہائے معصوم ضدیں عشق کے دیوانوں کی

بزمِ ساقی میں ذرا دیکھ تو چل کر زاہد
کیا بہاریں ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

تیری نظروں کے تصدق، تری آنکھوں کے نثار
انہیں پیمانوں سے، ساقی، انہیں میخانوں کی
ابھی تکمیل کو پہنچی نہیں تعمیرِ جنوں
ابھی چلتی رہے دیوانوں سے دیوانوں کی
سب جسے کہتے ہیں ارمانوں کا پُورا ہونا
میرے نزدیک یہی موت ہے ارمانوں کی
ہر طرف چھا گئے ارمانِ محبت بن کر
مجھ سے اچھی رہی قسمت مرے افسانوں کی



عشق کا ہاتھ سے پیمان نہ جانے پائے
جان جائے مگر ایمان نہ جانے پائے
یہ نہیں، دل کسی عنوان نہ جانے پائے
مگر اتنا ہے کہ آسان نہ جانے پائے
بات تو جب ہے کہ تو لاکھ ادھر رُخ نہ کرے
دل سے بچ کر کوئی پیکان نہ جانے پائے
صاف رکھ جان و دل و جسم کو آئینہ صفت
کہ وہ آئے تو پشمان نہ جانے پائے
دل کو اب بھی ہے یہ ضد حُسن کے ہر جلوے سے
گھر میں جو آئے، وہ مہمان نہ جانے پائے
ہوش میں آ دل دیوانہ کہ تیری ہی طرح
کوئی حیران و پریشان نہ جانے پائے
داستانِ غمِ ہستی کو مکمل کر لے
ایک بھی عشق کا عنوان نہ جانے پائے
تیری محفل میں ہے اِک ننگِ محبت تیرا
دیکھنا، ہو کے پشیمان نہ جانے پائے
اشک ہیں حاصلِ غم، غم ہے ودیعت اس کی
باہر آنکھوں سے یہ طوفان نہ جانے پائے
حُسن سرگرمِ نوازش ہے، مگر اے غمِ دل
رائیگاں عشق کا احسان نہ جانے پائے
جان جائے کہ رہے، دیکھ مری جانِ جگر
عشق کی شان، تری آن نہ جانے پائے



اک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے
یہ کس کا تصوّر ہے، یہ کس کا فسانہ ہے؟
جو اشک ہے آنکھوں میں، تسبیح کا دانہ ہے
دل سنگِ ملامت کا ہر چند نشانہ ہے
دل پھر بھی مرا دل ہے، دل ہی تو زمانا ہے
ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانا ہے
رونے کو نہیں کوئی، ہنسنے کو زمانا ہے
وہ اور وفا دشمن، مانیں گے نہ مانا
سب دل کی شرارت ہے، آنکھوں کا بہانا ہے
شاعر ہوں میں شاعر ہوں، میرا ہی زمانا ہے
فطرت مرا آئینہ، قدرت مرا شانا ہے
جو اُن پہ گزرتی ہے، کس نے اسے جانا ہے؟
اپنی ہی مصیبت ہے، اپنا ہی فسانا ہے
آغازِ محبت ہے، آنا ہے نہ جانا ہے
اشکوں کی حکومت ہے، آہوں کا زمانا ہے

آنکھوں میں نمی سی ہے، چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں — نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانا ہے
ہم دردِ بدل نالاں، وہ دست بدل حیراں — اے عشق! تو کیا ظالم! تیرا ہی زمانا ہے
یا وہ تھے خفا ہم سے، یا ہم ہیں خفا اُن سے — کل اُن کا زمانہ تھا، آج اپنا زمانا ہے
اے عشقِ جنوں پیشہ! ہاں عشقِ جنوں پیشہ! — آج ایک ستم گر کو ہنس ہنس کے رُلانا ہے
تھوڑی سی اجازت بھی، اے بزم گہ ہستی! — آ نکلے ہیں، دم بھر کو رونا ہے، رُلانا ہے
یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجیے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
خود[1] حسن و شباب اُن کا کیا کم ہے رقیب اپنا — جب دیکھیے، تب وہ ہیں، آئینہ ہے، شانا ہے
ہم عشقِ مجسّم ہیں، لب تشنہ و مستسقی — دریا سے طلب کیسی، دریا کو رُلانا ہے
تصویر کے دو رُخ ہیں جاں اور غمِ جاناں — اک نقش چھپانا ہے، اک نقش دکھانا ہے
یہ حُسن و جمال اُن کا، یہ عشق و شباب اپنا — جینے کی تمنا ہے، مرنے کا زمانا ہے
مجھ کو اسی دُھن میں ہے ہر لحظہ بسر کرنا — اب آئے، وہ اب آئے، لازم اُنھیں آنا ہے
خود داری و محرومی، محرومی و خود داری — اب دل کو خدا رکھے، اب دل کا زمانا ہے
اشکوں کے تبسّم میں، آہوں کے ترنّم میں — معصوم محبت کا معصوم فسانا ہے

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن
بندھ جائے سو موتی ہے، رہ جائے سو دانا ہے



عشق ہے نصف الحقیقت، کیوں پریشاں کیجیے — یعنی ہم پر رحم کرکے، خود پہ احساں کیجیے
کب تک آخر مشکلاتِ شوق آساں کیجیے — اب محبت کو محبت ہی پہ قرباں کیجیے
چاہتا ہے عشق، رازِ حُسن عریاں کیجیے — یعنی خود کھو جائیے، اُن کو نمایاں کیجیے
آپ کے دشمن رہیں وقفِ خلش، صرفِ تپش — آپ کیوں غمخوارئ بیمارِ ہجراں کیجیے
حُسن کی رُسوائیاں بھی حُسن سے کچھ کم نہیں — ہو سکے تو مثلِ بُوئے گل پریشاں کیجیے
پھر جنوں سامانیوں میں کچھ کمی سی آچلی — آج پھر برہم مزاجِ حُسنِ جاناں کیجیے
آپ کو شرمائیے کیا، آپ کا دامن ہے پاک — ہم گنہگارِ محبت ہیں، پشیماں کیجیے
دل پہ جو گزرے سو گزرے، عشق کی ضد ہے یہی — آج اتنا چھیڑیے اُن کو کہ گریاں کیجیے
سر سے پا تک اک نگاہِ بے محابا ڈال کر — عمر بھر کے واسطے ممنونِ احساں کیجیے
اللہ اللہ! سُنتے ہیں تم ہو رگِ جاں سے قریب — اب تو ہر نشتر کو پیوستِ رگِ جاں کیجیے

---

[1] اگرچہ اس شعر کا انداز لکھنوی ہے لیکن مفہومِ شعری واقفیت کے ساتھ ساتھ نہایت درجہ نازک (جگر)

شانِ رحمت کو نہیں درکار کوئی پیش کش
احتیاطاً اکتسابِ کُفر و ایماں کیجئے



[1]خاطرِ عشق الم کوش ہوئی جاتی ہے — زندگی خوابِ فراموش ہوئی جاتی ہے
حیرتِ جلوہ، ہم آغوش ہوئی جاتی ہے — آنکھ نظارہ فراموش ہوئی جاتی ہے
شوقِ چالاک کہاں، جرأتِ بیباک کہاں؟ — یاس آغوش در آغوش ہوئی جاتی ہے
وہ خلش جس سے تھا ہنگامۂ ہستی برپا — وقفِ بیتابیٔ خاموش ہوئی جاتی ہے
وہی مستی کہ سماتی ہی نہ تھی عالم میں — غرقِ یک ساغرِ سرجوش ہوئی جاتی ہے
وہی اک شورشِ دل تنگ تھی جس پر کونین — وہی اب معتکفِ ہوش ہوئی جاتی ہے
ایک منظر ہے کہ آنکھوں میں کھنچا آتا ہے — ایک دُنیا ہے کہ رُوپوش ہوئی جاتی ہے
ایک جانب نگہِ خاص سے ہے اذنِ جنوں — اک طرف مرحمتِ ہوش ہوئی جاتی ہے
نگہِ شوق کہاں ہے، یہ تماشا کیا ہے؟ — جیسے ہر شے لبِ خاموش ہوئی جاتی ہے
ہائے وہ سرخوشیٔ عشق کہ تھی جزوِ حیات — کس قدر زُود فراموش ہوئی جاتی ہے
یاد ہی موت کی تھی خادمۂ زیست کبھی — یاد ہی ہے کہ ہم آغوش ہوئی جاتی ہے
اُف، وہ پروانے کے سمٹتے ہی چلے آتے ہیں — ہائے وہ شمع کہ خاموش ہوئی جاتی ہے
عشق کی قسمتِ محروم! الٰہی توبہ!! — یادِ جاناں بھی فراموش ہوئی جاتی ہے
بال کھولے ہوئے یہ کون چلا آتا ہے — بزمِ دل محشرِ خاموش ہوئی جاتی ہے
مجھ گنہگار کو شکوہ ہے تری رحمت کا — کیوں خطا بخش و خطا پوش ہوئی جاتی ہے؟

یادِ ایام، کہ جب پوچھیے، کہتے تھے جگر
دعوتِ چشم و لب و گوش ہوئی جاتی ہے



دل میں تم ہو، نزع کا ہنگام ہے — کچھ سحر کا وقت ہے، کچھ شام ہے
عشق ہی خود عشق کا انعام ہے — واہ کیا آغاز، کیا انجام ہے!
حسن ہے، نغمہ ہے، مے ہے، جام ہے — اب کہاں حدِ گردشِ ایام ہے؟
کیا اسی کو کہتے ہیں آئینِ حُسن؟ — جو تمہارا ہو گیا، ناکام ہے
پینے والے ایک یا دو ہوں تو ہوں — مفت سارا میکدہ بدنام ہے

---

[1] مسلسل

درد و غم دل کی طبیعت بن چکے　　اب یہاں آرام ہی آرام ہے
عشق کے ہاتھوں تری سرکار سے　　مل گیا جو کچھ، وہی انعام ہے
پی رہا ہوں آنکھوں آنکھوں میں شراب　　اب نہ شیشہ ہے، نہ کوئی جام ہے
دیکھ لینا عشق کی بھی نخوتیں　　حُسن کی برہم مزاجی عام ہے
وہ سراپا ناز، اُن سے کیا گلہ؟　　تجھ سے شکوہ گردشِ ایّام ہے
ہوشیار، اور شکوہ سنجِ زندگی!　　زندگی انعام ہی انعام ہے
حُسن سے ہیں عشق کی رسوائیاں　　بادہ جب تک ہے، فروغِ جام ہے
کیجئے کیا اور شرحِ زندگی　　کچھ سحر، کچھ دوپہر، کچھ شام ہے
ایک بوسہ اس لبِ جاں بخش کا　　عُمر بھر کے واسطے انعام ہے
ہوشیار، او کامیابِ زندگی!　　زندگی، ناکامیوں کا نام ہے

کیا جگرؔ سے آپ بھی واقف نہیں!؟
ایک ہی تو رندِ مے آشام ہے



آئینے میں عشق کی تاثیرِ پنہاں دیکھئے　　میری صورت اپنی صُورت سے نمایاں دیکھئے
بے تکلّف ہر طرف تصویرِ جاناں دیکھئے　　میری آنکھوں سے جمالِ شامِ ہجراں دیکھئے

دل کی ہستی بیش از یک شیشۂ ساعت نہیں
اس میں جو کچھ دیکھئے، تقویمِ دوراں دیکھئے



پھر وہ ہم سے خفا ہے، کیا کہیئے؟　　زندگی بے حیا ہے، کیا کہیئے؟
دل بھلا یا بُرا ہے، کیا کہیئے؟　　آپ کا نقشِ پا ہے، کیا کہیئے؟
چاندنی ہے، ہوا ہے، کیا کہیئے؟　　مفلسی کیا بلا ہے، کیا کہیئے؟
بندگی جس کی ہے فقط رونا　　وہ ہمارا خُدا ہے، کیا کہیئے؟
انتہا کے ہیں عشق میں صدمے　　اور ابھی ابتدا ہے، کیا کہیئے؟
شوقِ بے انتہا کے پردے میں　　کون ہنگامہ زا ہے، کیا کہیئے؟
حُسن جتنا ہے جنگ جُو ظالم　　عشق اس سے سوا ہے، کیا کہیئے؟
دل میں پنہاں ہے اک لطیف خلش　　صورتِ التجا ہے، کیا کہیئے؟
پھر سرِ حشر ہیں، وہی جلوے　　پھر وہی سامنا ہے، کیا کہیئے؟

ابھی پابند ہے، ابھی آزاد — عشق کا، دل بھی کیا ہے، کیا کہیئے؟
پردہ رکھ لیتے ہم زمانے سے — آنکھ پہچانتا ہے، کیا کہیئے؟
پوچھتے ہیں مزاجِ دل ہم سے — ایک ہی خود نُما ہے، کیا کہیئے؟
شورشِ بیخودیٔ شوق نہ پُوچھ — کس طرف کی ہوا ہے، کیا کہیئے؟
عشق تو عشق، حُسن سے بیزار — دل کو کیا ہو گیا ہے، کیا کہیئے؟
شوق سرتا قدم نگاہ و زباں — وہ مجسّم حیا ہے، کیا کہیئے؟

آج حالِ دلِ تباہ، جگر
ہم نے کیوں کر سُنا ہے، کیا کہیئے؟



کچھ جو پشیمانِ جفا ہو گئے — اور وہ گھبرا کے خفا ہو گئے
نالۂ دل خاک رسا ہو گئے — (قطعہ) آئے وہ، آتے ہی جُدا ہو گئے
کچھ نہ سُنا اور یوں ہی چل دیئے — کچھ نہ کہا اور خفا ہو گئے
اور ابھی اس عشق میں کچھ سانحات — دل کی ہلاکت کے سوا ہو گئے
اُن کا اُدھر گوشۂ دامن بڑھا — تنگ اِدھر بندِ قبا ہو گئے
وہ بھی جو تھے منکرِ آئینِ عشق — سُنتے ہیں پابندِ وفا ہو گئے
ہم سے نظر پھیر لی اُس شوخ نے — ہم بھی ہیں انسان، خفا ہو گئے
ہم کو گرفتارِ بلا دیکھ کر — وہ بھی گرفتارِ بلا ہو گئے
کچھ مرے چہرے سے کھلے رازِ عشق — کچھ تری نظروں سے دُور ہو گئے
ڈھونڈھ کے اب لائیے کیونکر انہیں — ہائے وہ نالے، کہ رسا ہو گئے

چپ ہیں وہ یوں سُن کے مری عرضِ شوق
جیسے کہ سچ مچ ہی خفا ہو گئے



سب پہ تو مہربان ہے پیارے — کچھ ہمارا بھی دھیان ہے پیارے
آ کہ تجھ بن بہت دنوں سے یہ دل — ایک سُونا مکان ہے پیارے
تو جہاں ناز سے قدم رکھ دے — وہ زمیں آسمان ہے پیارے
مختصر ہے یہ شوق کی رُوداد — ہر نفس داستان ہے پیارے
اپنے جی میں ذرا تُو کر انصاف — کب سے نا مہربان ہے پیارے؟

صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے — تو یونہی دھان پان ہے پیارے
ہم سے جو ہو سکا، ہو کر گزرے — اب ترا امتحان ہے پیارے
مجھ میں تجھ میں تو کوئی فرق نہیں — عشق کیوں درمیان ہے پیارے
کیا کہے حالِ دل غریب جگرؔ
ٹوٹی پھوٹی زبان ہے پیارے



جب سے تُو مہربان ہے پیارے — اور دل بد گمان ہے پیارے
ان کی باتوں میں تُو نہ آ جانا — عشق جادو بیان ہے پیارے
تو کہاں؟ یہ غریب خانہ کہاں؟ — وہم ہے یا گُمان ہے پیارے
صدقے تیری نوازشوں کے، مگر — سخت تر امتحان ہے پیارے
ان دنوں دل کے رنگ ڈھنگ نہ پُوچھ — کچھ عجب آن بان ہے پیارے
سچ بتا، اس میں کوئی بات بھی ہے — یا یُوں ہی مہربان ہے پیارے
وہ بھی ہلکی سی اِک نگاہِ کرم — دل بہت ناتوان ہے پیارے
تیرا دیوانہ غریب جگرؔ
فخرِ ہندوستان[1] ہے پیارے



عشق کی داستان ہے پیارے — اپنی اپنی زبان ہے پیارے
کل تک اے درد! یہ تپاک نہ تھا — آج کیوں مہربان ہے پیارے؟
سایۂ عشق سے خُدا ہی بچائے — ایک ہی قہرمان ہے پیارے
اس کو کیا کیجئے جو لب نہ کُھلیں — یوں تو منہ میں زبان ہے پیارے
یہ تغافل بھی ہے نگہ آمیز — اس میں بھی ایک شان ہے پیارے
جس نے، اے دل! دیا ہے اپنا غم — اُس سے تو بدگُمان ہے پیارے
دل کا عالم نگاہ کیا جانے؟ — یہ تو صرف اِک زبان ہے پیارے
میرے اشکوں میں اہتمام نہ دیکھ — عاشقی کی زبان ہے پیارے
ہم زمانے سے انتقام تو لیں — اک حسیں درمیان ہے پیارے

---

[1] اس اعلانِ نون کو میں جائز سمجھتا ہوں (جگرؔ)

عشق کی ایک ایک نادانی! علم و حکمت کی جان ہے پیارے
تُو نہیں، میں ہوں، میں نہیں، تُو ہے اب کُچھ ایسا گُمان ہے پیارے
رکھ قدم پھُونک پھُونک کر ناداں! ذرّے ذرّے میں جان ہے پیارے
کس کو دیکھے سے دل کو چوٹ لگی؟ کیوں یہ اُتری کمان ہے پیارے؟
تری برہم خرامیوں کی قسم! دلِ بہت سخت جان ہے پیارے
ہاں ترے عہد میں جگرؔ کے سوا
ہر کوئی شادمان ہے پیارے



درد بڑھ کر فغاں نہ ہو جائے یہ زمیں آسماں نہ ہو جائے
پھر کوئی مہرباں نہ ہو جائے سعیِ غم رائیگاں نہ ہو جائے
دُور ہے عرصۂ عدم آباد کم کوئی ناتواں نہ ہو جائے
ڈر ہے مجھ کو کہ میری عرضِ سکوت آپ ہی کی زباں نہ ہو جائے
دردِ دل کیا ہی مہماں ہے، اگر اشک بن کر رواں نہ ہو جائے
موت سے ڈر نہیں، مگر ہے یہ وہم عشق بے خانماں نہ ہو جائے
دل میں ڈوبا ہوا ہے جو نشتر میرے دل کی زباں نہ ہو جائے
قسمتوں سے ملا ہے دردِ حبیب کہیں آرام جاں نہ ہو جائے
عشق اپنی خوشی سے کون کرے عشق اگر ناگہاں نہ ہو جائے
آہ کیجیے، مگر لطیف تریں لب تک آ کر دھواں نہ ہو جائے
عشق کر ہی چکا تھا اپنا کام دلِ اگر درمیاں نہ ہو جائے
عشق میں جتنے بد گماں ہیں ہم
یُوں کوئی بد گُماں نہ ہو جائے



ادا جو آئے، وہ بے عیب، بے قصُور آئے خُدا وہ دن نہ کرے، آپ کو غرُور آئے!
نکل کے عشق جو حدِ ادب سے دُور آئے اُدھر سے کعبہ چلے، اس طرف سے طُور آئے
ذرا تو آنکھ کھلے، عقل میں شعُور آئے ہم اپنے آپ میں آئیں، تو وہ ضرُور آئے
جسے ذرا بھی غمِ عشق پہ غرُور آئے ترے حضور نہ جائے، مرے حضُور آئے
چلوں میں راہِ محبت میں بے نیازانہ مری بلا سے، اگر وہ بھی ناصبُور آئے

خود اپنی منزلِ دل محو ہوتی جاتی ہے
نظر میں جب سے مقاماتِ دُور دُور آئے

پہیں وہ شوق سے تنہا، مگر یہ کیا ممکن
ہمیں سرُور نہ آئے، انہیں سرُور آئے

ہزار سجدے کرے، رات رات بھر زاہد
جو دل ہی صاف نہ ہو، کیا جبیں میں نور آئے

زمانے تک تری گلیوں کی خاک چھانی ہے
مری نگاہ میں کیا جلوہ گاہِ طُور آئے

کسی کی مست خرامی کا واہ کیا کہنا!
کہ جیسے حافظِ شیراز چُور چُور آئے

الٰہی! جذبِ محبت کی بخش دے تقصیر
وہ آج دست بدل، سخت ناصبُور آئے

مری طرف سے بھی اے کاروانِ شوق سلام!
کہیں جو راہِ طلب میں مقامِ طُور آئے

انہیں ہے عشق سے چشمک، مگر یہ کون کہے؟
وہ خود حسین ہے، اس کو نہ کیوں غرُور آئے

عجیب چیز ہے میخانۂ تصور بھی
یہاں سے ہوش میں پہنچے، وہاں سے چُور آئے

نظر ہی اپنی، نہ اب دل ہی رہ گیا اپنا
سزا ملی ہے کہ ہم کیوں ترے حضُور آئے

اجل جو آتی ہے، آئے، مگر اسی صُورت
کہ جیسے زُلف پریشاں وہ رشکِ حُور آئے

مجاز ہو کہ حقیقت، یہاں تو حال یہ ہے
ترے حضُور سے اُٹھے، ترے حضُور آئے

وہیں سے ہم کو ملا ہے سکونِ دل کیا!
جہاں سے لوگ بہت ہو کے ناصبُور آئے

ہزار بار لکھے تو بہار، نامۂ شوق!
ترے بُلائے جگر آئے، وہ ضرُور آئے



پسینہ موت کا بن کر نہ کیوں لہُو آئے
ارے غضب کہ یُونہیں پا برہنہ تُو آئے!

کرے نہ کام جو بُلبُل کا نالۂ خونیں
نہ غنچے نیند سے چونکیں، نہ رنگ و بُو آئے

دیا ہے عشق نے وہ مرتبہ، بحمد اللہ!
کہ آنکھ تک نہ اُٹھاؤں اگرچہ تُو آئے



کیا گھڑی ہے، کیا سماں ہے، کس غضب کا جوش ہے
عشق کی بیتابیاں ہیں، حُسن کا آغوش ہے

وجد میں ہے مطربِ غم، کُل فضا خاموش ہے
تیرتے پھرتے ہیں نغمے، بزمِ جاں مدہوش ہے

کیسے کیسے مستِ صہبائے محبت کٹ مرے!
او نشیلی آنکھ والے، کچھ تجھے بھی ہوش ہے؟

ایک دل ہے سینۂ عاشق میں، لیکن الاماں!
ایک قطرہ ہے، مگر ایسا کہ دریا نوش ہے



دیدۂ یار بھی پُرنم ہے، خدا خیر کرے! آج کچھ اور ہی عالم ہے، خدا خیر کرے!
اُس طرف غیرتِ خورشیدِ جمال اور اِدھر زعمِ خود دارئ شبنم ہے، خدا خیر کرے!
دل ہے پہلو میں کہ مچلا ہی چلا جاتا ہے اور خود سے بھی وہ برہم ہے، خدا خیر کرے!
رازِ بیتابئ دل کچھ نہیں کھلتا، لیکن کل سے درد آج بہت کم ہے، خدا خیر کرے!
حُسن ہر گام پہ ہے سایہ فگن، دام فگن
عشق آزادِ دو عالم ہے، خُدا خیر کرے



عاشقی امتیاز کیا جانے؟ فرقِ ناز و نیاز کیا جانے؟
نگہِ شوق کی ہے سب تحریک حُسن تمہیدِ ناز کیا جانے؟
ہم سمجھتے ہیں رازِ رامش و رنگ زاہدِ پاک باز کیا جانے؟
ناخنِ عشق کتنے ٹوٹ گئے گرہَ نیم باز کیا جانے؟
سچ ہے، سب نیک و بد ہمیں سے ہے گردشِ چشمِ ناز کیا جانے؟
مسلکِ آشتی دیدہ و دل شوقِ ہنگامہ ساز کیا جانے؟
شیخ پندارِ عشق سمجھا ہے نازِ اہلِ نیاز کیا جانے؟
غیرتِ بندگی و ناچاری کوئی بندہ نواز کیا جانے؟
آئینہ کی نزاکتیں، ہے ہے! دستِ آئینہ ساز کیا جانے؟
آنکھ جو دیکھتی ہے، دیکھتی ہے دل کے راز و نیاز کیا جانے؟
سینۂ نَے پہ جو گزرتی ہے وہ لبِ نَے نواز کیا جانے؟
کثرتِ جلوہ و ہجومِ نظر عشقِ وحدت طراز کیا جانے؟
حُسن کی دل گدازیاں، توبہ! عشق یہ سوز و ساز کیا جانے؟
وہ حقیقت کہ جو گزرتی ہے لب افسانہ ساز کیا جانے؟
ہائے گُل کاریاں محبت کی دامنِ پاک باز کیا جانے؟
رہ روِ راہِ بے خودی ہے جگرؔ
وہ نشیب و فراز کیا جانے؟



دل گیا، رونقِ حیات گئی غم گیا، ساری کائنات گئی
دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی

دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں
ایک رات آئی، ایک رات گئی

تیری باتوں سے آج تو واعظ!
وہ جو تھی خواہشِ نجات گئی

اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعیٔ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں، لیکن
اک مسیحا نفس کی بات گئی

اب جنوں آپ ہے گریباں گیر
اب وہ رسمِ تکلفات گئی

ہم نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرزِ التفات گئی

ترکِ اُلفت بہت بجا، ناصح!
لیکن اس تک اگر یہ بات گئی

ہائے سرشاریاں جوانی کی!
آنکھ جھپکی ہی تھی کہ رات گئی

جلوۂ ذات، اے معاذ اللہ!
تابِ آئینۂ صفات گئی

نہیں ملتا مزاجِ دل ہم سے
غالباً دُور تک یہ بات گئی

قیدِ ہستی سے کب نجات جگرؔ؟
موت آئی، اگر حیات گئی



عشق میں تنہا نہیں شوریدہ سر میرے لئے
حُسن بھی بیتاب ہے، اور کس قدر میرے لئے

ہاں مبارک اب یہ معراجِ نظر میرے لئے
جس قدر وہ دُور تر، نزدیک تر میرے لئے

کھیل ہے بازیچۂ شام و سحر میرے لئے
دو گلِ بازی ہیں یہ شمس و قمر میرے لئے

وقف ہے صیّاد کی اک اک نظر میرے لئے
ہاں مبارک! یہ شکستِ بال و پر میرے لئے

گرم ہے ہنگامۂ شام و سحر میرے لئے
رات دن گردش میں ہیں شمس و قمر میرے لئے

میں ہوں وحشی آہ، کس صحرائے آفت خیز کا؟
ہے گلِ ویرانہ بھی بیگانہ تر میرے لئے

اس مقامِ عشق میں ہوں، مرحبا، اے بیخودی!
ذرّہ ذرّہ ہے جہاں گرمِ سفر میرے لئے

جذب ہو کر رہ گیا ہوں میں جمالِ دوست میں
عشق ہے تابندہ تر، پایندہ تر میرے لئے

میں نہیں کہتا کہ میں ہوں، تُو ہو، تیری خلوتیں
ہاں مگر سب سے جُدا خاص اک نظر میرے لئے

اللہ اللہ! میں بھی کیا نازک دماغِ عشق ہوں
نکہتِ گل بھی ہے وجہِ دردِ سر میرے لئے

پھر بھی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اک سراپا ناز کو
میں نے مانا کچھ نہیں حدِ نظر میرے لئے

رہ روِ راہِ طلب کو خضر کی حاجت نہیں
ذرّہ ذرّہ ہے چراغِ رہ گذر میرے لئے

اپنے دل میں جو ترے میں بھی سما سکتا نہیں
میرا ہر ہر سانس ہے زنجیرِ در میرے لئے

مجھ کو جنّت ہی جو دینا ہے، تو یارب بخش دے — بس یہی دامانِ تر، چشمانِ[1] تر میرے لئے
ترکِ مے سے اور بھی میں تو شرابی بن گیا — روز آجاتا ہے مینائے[2] سحر میرے لئے
جس نے زاہد سے بھی کافر کے اُڑا ڈالے ہیں ہوش — اس سے بھی کچھ اور، ساقی! تیز تر میرے لئے
وہ مرا ساغر بکف ہونا پشیمانی کے ساتھ — ابرِ رحمت کا وہ اُٹھنا جھوم کر میرے لئے
کل شبِ ماہتاب میں اک بُلبُلِ آفت نوا (قطعہ) — مرکزِ غم بن رہا تھا رات بھر میرے لئے
ناگہاں لب ہائے برگِ گل سے یہ آئی ندا — نالے کرتا ہے عبث، اے بے خبر! میرے لئے
میں بھی ہُوں اپنی جگہ خونینِ جگر، خونین کفن — تُو نہ اپنی جان کھو، اے مشتِ پر میرے لئے
بس یہ سُننا تھا کہ پائے گل پہ گر کر مر مٹا — بن گیا اک نقشِ عبرت عُمر بھر میرے لئے
زندگی اک تہمتِ بیجا ہے میری ذات پر — موت اِک اِلزام نا جائز جگر، میرے لئے

میں تو ہر حالت میں خوش ہُوں، لیکن اس کا کیا علاج
ڈبڈبا آتی ہیں وہ آنکھیں، جگر میرے لئے



نگاہِ شوق جگر وقفِ چار سُو کیا ہے؟ — جو دل حسیں ہو تو دُنیائے رنگ و بُو کیا ہے؟
خبر نہیں مجھے میں کیا ہوں، آرزو کیا ہے؟ — کسی نے جب سے یہ سمجھا دیا کہ تُو کیا ہے
جو دل میں ڈوب نہ جائے وہ گفتگو کیا ہے؟ — جو چھا نہ جائے، وہ پیغامِ آرزو کیا ہے؟
یہ چپکے چپکے دل و جاں سے گفتگو کیا ہے؟ — یہ چھیڑ چھاڑ، یہ اندازِ آرزو کیا ہے؟

یہی خبر نہیں اے وائے عشق و محرومی!
کہ آرزو کسے کہتے ہیں، جستجو کیا ہے؟



نہیں ہے، نہیں ہے، جوانی نہیں ہے — جوانی اگر جاودانی نہیں ہے
مقامِ تحیّر زبانی نہیں ہے — یہاں کوئی شے آنی جانی نہیں ہے
جگر! یہ مئے ارغوانی نہیں ہے — ارے آگ ہے آگ، پانی نہیں ہے

---

[1] کہ بہ چشمانِ دل مبیں جز دوست (سعدیؒ) یہ لفظ متروک کر دیا گیا ہے۔ لیکن مَیں جائز سمجھتا ہوں۔

[2] شرابی عموماً آخر شب تک پیتے پیتے بدمست ہو کر سو جاتا ہے۔ اور دن چڑھے بیدار ہوتا ہے۔ اس لئے صُبح صادق کے نشہ پاش منظر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ترکِ مے کے بعد اس لطیف منظر سے متاثر ہوتے رہنا بھی کچھ کم نہیں۔ (جگرؔ)

یہ کیا ہے، جو سحرِ جوانی نہیں ہے — کہ ہے اور پھر بدگمانی نہیں ہے
مرا قصۂ عشق فانی نہیں ہے — یہ مُردہ دلوں کی کہانی نہیں ہے
حریفانہ رکھتا ہوں رسمِ محبت — رگوں میں مری خون پانی نہیں ہے
مرا عشق زندہ، مرا عزم راسخ — مجھے شکوۂ ناتوانی نہیں ہے
محبت ہے اپنی بھی، لیکن نہ اندھی! — جوانی ہے، لیکن دِوانی نہیں ہے
سمجھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا — حقیقت ہے دُنیا، کہانی نہیں ہے
تجلّی جس سے ہونا پڑے دل ہی دل میں — وہ کچھ اور ہے، مہربانی نہیں ہے
مجھے اُن سے مطلب، اُنہیں مجھ سے مطلب — کوئی واسطہ درمیانی نہیں ہے
محبت منوّر، محبت معطّر — محبت نہیں تو جوانی نہیں ہے
نہ سنیئے، نہ سُنیے غم و درد میرا — یہ ہے آپ بیتی، کہانی نہیں ہے
وہ عالم ہے اب خشک آنکھوں میں اپنی — کہ طوفاں ہے برپا، روانی نہیں ہے
فسوں ہے، فسوں ہے، جسے عشق کہیے — جنوں ہے، جنوں ہے، جوانی نہیں ہے
محبت ازل سے مقدّرِ پڑی تھی! — یہ افتادِ غم ناگہانی نہیں ہے

جگر کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق
یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے



وہ مست ہوں کہ اُلٹ دی جب آستیں میں نے — دکھا دیے حرم و دیر سب یہیں میں نے
مٹا کے دل سے ہر اک نقشِ دل نشیں میں نے — تجھے بھی دیکھ لیا، پالیا یہیں میں نے
بنایا عشق کو یوں حُسن آفریں میں نے — تجلّیاں رُخِ فطرت سے چھین لیں میں نے
چھپا کے دل میں غمِ اشک آفریں میں نے — بنا تو لی ہے ستاروں کی سرزمیں میں نے
کبھی یہ وہم کہ میں کیا ہوں، میرا سجدہ ہی کیا — کبھی یہ فکر، جھکا دی اگر جبیں میں نے
تری نگاہ کے صدقے کہ پھر سے یاد آیا — بُھلا دیا تھا جو اک درسِ اوّلیں میں نے
نہ حُسن سے کوئی مطلب، نہ عشق سے سروکار — کچھ اس طرح کی بھی گھڑیاں گزار دیں میں نے
الٰہی، خیر! کہ دیکھا ہے خواب میں دمِ صبح — شباب و حُسن کا اک پیکرِ حزیں میں نے
مری یہ فطرتِ معصومِ عشق، ارے توبہ! — کسی نے جو بھی کہا، کر لیا یقیں میں نے
مگر جو تیری نگاہوں میں ہے، وہ چھیڑ کہاں — ہزار دیکھ لئے یوں تو نکتہ چیں میں نے
تجھے خبر ہو جو، ساقی! تو مجھ پہ رشک کرے — اُلٹ لئے ہیں جو دریائے آتشیں میں نے



مئے منصور پلا دے ساقی　　نور ہی نور پلا دے ساقی
جامِ بلّور پلا دے ساقی　　چشمِ بد دُور! پلا دے ساقی
پھر کبھی نام نہ لوں پینے کا　　اتنی بھرپُور پلا دے ساقی
تا کجا، ہستیِ ناکام مری　　شعلۂ طور پلا دے ساقی
تجھ کو اپنی ہی تجلّی کی قسم　　ساغرِ نُور پلا دے ساقی
مئے ظاہر تو بہت کچھ پی لی　　مئے مستُور پلا دے ساقی
تُو تو ساقی ہے، تجھے کام سے کام　　میں سہی چُور، پلا دے ساقی
تشنہ کاموں سے اب انکار ہی کیوں　　حسبِ دستُور پلا دے ساقی
ساغرِ ظلمتِ غم میں بھر کر　　بادۂ نُور پلا دے ساقی
کہہ گیا کیا یہ سیہ مستی میں　　شبِ دیجُور پلا دے ساقی
مئے گل رنگ کے جلوے کب تک　　حاصلِ طُور پلا دے ساقی
میں تو جب جانوں، مری توبہ کے بعد　　کرکے مجبُور پلا دے ساقی
صبرِ ایّوب کی تجھ کو سوگند!　　بیٹھے ہیں دُور، پلا دے ساقی
ساغرِ ہوش میں اب تُو بھر کے　　رُوحِ منصور پلا دے ساقی
تیری ہر شرط حقیقی و مجاز　　مجھ کو منظور، پلا دے ساقی
جانے کیا شے وہ اُفق تاب ہوئی　　میں ہوں مجبُور، پلا دے ساقی
ایک ساغر میں زمان اور مکاں　　کرکے معمُور پلا دے ساقی

کرکے حل اب تو مرے ساغر میں
دیدۂ حُور پلا دے ساقی



تقدیر سے شکایت، کوئی نہ آسماں سے　　شکوہ ہے صرف اپنے اک خاص مہرباں سے
کونین ہے عبارت اک عشقِ بے اماں سے　　نکلا یہی فسانہ، اُلٹا ورق جہاں سے
کس نے اُٹھا دیا ہے پردہ حریمِ جاں سے　　آنکھیں بھی مطمئن سی، آنسو بھی شادماں سے
اُس وقت کوئی دیکھے، اعجازِ سازِ فطرت　　خود حُسن نغمہ زن ہو جب عشق کی زباں سے
مدّت کے بچھڑے دو دل باہم جو مل رہے ہیں　　پھولوں کی بارشیں ہیں، درہائے آسماں سے



تھی جو بُنیاد شادی و غم کی!   دل نے وہ انجمن ہی برہم کی
اُس کے شانوں پہ زُلف برہم کی   خیر، یا رب! نظامِ عالم کی
آہ کی ہے صدا، نہ ماتم کی   کیا طبیعت بدل گئی غم کی
تیری نسبت سے تیری بخشش ہے   اللہ اللہ! راحتیں غم کی
اتنے ہی مجھ سے وہ قریب ہوئے   میں نے جتنی ہی آرزو کم کی
یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی   کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی
کوئی دیکھے تو کیا ہنسی آئے   ہائے ری بدحواسیاں غم کی
آئی تھی آج بھی نسیمِ سحر   آگ بھڑکا گئی جہنم کی
عشق کو کہیئے کس طرح معراج   یہ تو فطرت ہے ابنِ آدم کی
اُس سے پوچھو جمال شبنم کا   جس نے خود آرزوئے شبنم کی
اک خطا پر سزائے بے میعاد   ہائے تقدیر ابنِ آدم کی!
تو نے ہمدم یہ کس کا نام لیا   چھا گئیں دل پہ بدلیاں غم کی
جس کا جُھکنا محال تھا، سو آج   عشق نے وہ نگاہ بھی خم کی
عشق کا راز غیر کیا سمجھیں   پڑ نہ جائے نگاہ محرم کی
شانِ رحمت برس پڑی کیا کیا   اس خطا پر کہ ہر خطا کم کی
دُھن ہی اب اور ہے یہاں، ناصح   تجھ کو سُوجھی ہے شادی و غم کی
حُسن آیا تھا خود منانے کو   سو توجہ ہی عشق نے کم کی
خاطرِ حُسن تھی ہی کچھ برہم   دل نے دانستہ اور برہم کی
اللہ اللہ! ہستیِ شاعر   قلب غنچے کا، آنکھ شبنم کی
اِس زمانے کا انقلاب نہ پُوچھ   رُوح شیطاں کی، شکل آدم کی

اُس کی ہر شانِ مرحبا، لیکن
ہائے رے شانِ حُسنِ برہم کی



میری جانب نگراں ہے کوئی   اب زماں ہے، نہ مکاں ہے کوئی
وہیں میں بھی ہُوں، جہاں ہے کوئی   دل ہے یا تختِ رواں ہے کوئی
اب تو یوں محرمِ جاں ہے کوئی   جیسے رگ رگ میں نہاں ہے کوئی
گرم اشکوں میں رواں ہے کوئی (قطعہ) سرد آہوں میں نہاں ہے کوئی

میں نے گھبرا کے جو اک روز جگر ! دی یہ آواز، کہاں ہے کوئی
درد چیخا کہ مجھی میں ہے وہ شوخ غم پکارا کہ یہاں ہے کوئی
ہمہ نغمہ، ہمہ خوشبو، ہمہ رنگ (قطعہ) دوسرا تجھ سا کہاں ہے کوئی
تُو ہی اللہ بتا دے ناصح! ایسی سج دھج کا جواں ہے کوئی



اے غمِ عشق ترا کیا کہنا! پہلے تُو، بعد ازاں ہے کوئی
کیجئے شرحِ محبت کیوں کر کیا محبت کی زباں ہے کوئی
غیرتِ عشق! یہ کیا سُنتا ہوں؟ غیر از دوست کہاں ہے کوئی
نہیں ہٹتی، نہیں ہٹتی تری یاد یہ بھی کیا رشتۂ جاں ہے کوئی
کس کے دل پر نہیں اس کا سایہ (قطعہ) غم ہے یا سحرِ رواں ہے کوئی
ہمہ ساز و ہمہ سوز و ہمہ درد زندگی ہے کہ فغاں ہے کوئی
ہر نفس اب تو یہ دیتا ہے صدا کہ پسِ پردۂ جاں ہے کوئی

دل کی اب فکر کرے میری بلا
مجھ سے بڑھ کر نگراں ہے کوئی



شعر و الہام تو کیا، عرش بھی نازل ہو جائے دل جو اک شے ہے، حقیقت میں اگر دل ہو جائے
جس طرف آنکھ اُٹھے، حُسن مقابل ہو جائے عشق خود ہی نہ اگر پردۂ حائل ہو جائے
اپنی ہستی کے سوا مجھ سے بھی غافل ہو جائے دل بہر حال مرا دل ہے، مگر دل ہو جائے
حُسن کامل ہے ترا، اور بھی کامل ہو جائے میری گستاخ نگاہی بھی جو شامل ہو جائے
دونوں عالم سے فراغت مجھے حاصل ہو جائے عشق اگر حُسن بنے، حُسن مرا دل ہو جائے
حُسن سے عشق کچھ اس طرح مماثل ہو جائے جیسے تصویر سے تصویر مقابل ہو جائے
عشق ہی، کاش! مرے عشق کا حاصل ہو جائے یہی رہبر، یہی جادہ، یہی منزل ہو جائے
اُف رے تقدیرِ چمن، ہائے رے بیدادِ فلک! غنچہ کھلنے بھی نہ پائے کہ مرا دل ہو جائے
مجھ کو منظور دو عالم سے رقابت، لیکن وہ نگاہِ متبسم طرفِ دل ہو جائے
میں رُخِ عشق سے پردہ تو اُٹھا دوں، لیکن ڈر یہ ہے، تو نہ کہیں عشق پہ مائل ہو جائے
غیر تو غیر ہے، اے عشق! گوارا نہ کروں میرے عالم میں اگر خود بھی وہ شامل ہو جائے
ارتباط اب نہ بڑھا اور زیادہ اے دوست! مجھ کو ڈر ہے کہ ترا دل نہ مرا دل ہو جائے

حیف، وہ حُسن کا پندار جو کھا جائے شکست
ہائے وہ زعمِ محبت کہ جو باطل ہو جائے

دل کے آثار ابھی تک تو بہت اچھے ہیں!
کہیں اقرارِ محبت پہ نہ مائل ہو جائے

رنگِ چہرہ نہ اُڑے اور محبت برسے
لب کو جنبش نہ ہو اور شرحِ غمِ دل ہو جائے

میں تو مر جاؤں، مرا عشق کہیں کا نہ رہے
اک نفس بھی جو فراغت مجھے حاصل ہو جائے

مجھ کو دینا تھا غمِ عشق، نہ اس طرح مگر
کہ مرا عقدۂ دل ہی مجھے مشکل ہو جائے

ہر ستم مجھ کو گوارا، مگر اس شرط کے ساتھ
ہر ستم کے لئے مخصوص مرا دل ہو جائے

غیرتِ حُسن کا پھر کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا
درد بن کر نہ اگر عشق مرا دل ہو جائے

کیا بگڑ جائے ترا، اے مہِ خوبی و جمال!
گر یہاں بھی کوئی دم رونقِ محفل ہو جائے

عشق ہر رنگ میں ہے اپنی حقیقت کی دلیل
یہ وہ دعویٰ ہی نہیں ہے کہ جو باطل ہو جائے



پارہ ہائے جگر

آج ایسا نگہِ مست کا اِک وار ہُوا — دل کا کیا ذکر، سنبھلنا مجھے دشوار ہُوا



وہی ہے عشق، وہی حُسن ہے، وہی سب کچھ — مگر کسی سے کسی کا جواب نہ ہو سکا



اب کیا کریں، اے جوشِ طلب، تیری قسم، اور — بڑھتا ہے اگر شوق، تو رُکتے ہیں قدم اور
طرفینِ[1] غمِ عشق کے ہیں تازہ ستم اور — اب دیکھئے کیا ہو کہ نہ تم اور، نہ ہم اور



عشق کی اللہ ری آتش کاریاں — خُون کی بُوندیں ہیں یا چنگاریاں
قتل گہ میں آج ہولی ہے، جگر — چل رہی ہیں خون کی پچکاریاں



شکوہ تو کیا، ہو نہ سکی آہ تک — ہمّت اربابِ وفا کچھ نہیں
لُطف سے کچھ اُس نے کہا زیرِ لب — میں نے جو پوچھا، تو کہا "کچھ نہیں"



یونہی حیراں پریشاں روز صبح و شام کرتے ہیں — جنونِ عشق کے مارے کہیں آرام کرتے ہیں!
ہجومِ آرزو، شوقِ فراواں، دردِ بیتابی — وہ جس پہ چاہتے ہیں اُس پہ یوں اکرام کرتے ہیں



اک جگہ بیٹھ کے پی لوں، مرا دستور نہیں — میکدہ تنگ بنا دُوں، مجھے منظور نہیں!
قیدِ آدابِ محبت مجھے منظور نہیں — عشق دستور ہے خود، عشق کا دستور نہیں
برقِ غیرت مری ہستی کو جلا دے، تسلیم! — چھپ کے پردہ میں رہے حُسن، یہ منظور نہیں

---

[1] رائے ساکن پر یقیناً اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن اس قسم کے اعتراضات محض قدامت پرستی کی بناء پر ہوں گے، صاحبانِ فکر و نظر اس دُنیائے مکتبی سے آگے بڑھ چکے ہیں (جگر)

کیا انالحق کا ترانہ کہ اب اِس دُنیا میں
رسن و دار رہیں شبلی و منصور نہیں

☆——☆——☆

تجھی میں ہے جگرؔ اک حسنِ معتبر پنہاں! — بہار در برو میخانہ در نظر پنہاں
بہت اشارۂ پیہم، مگر لطیف ترین — ہزار ہا نگہِ ملتفت، مگر پنہاں
جگرؔ کو درسِ حقیقت بہت نہ دے، واعظ — وہ بے خبر تو بہ ظاہر ہے، باخبر پنہاں

☆——☆——☆

دل ہے قدموں پر کسی کے، سر جُھکا ہو یا نہ ہو — بندگی تو اپنی فطرت ہے، خُدا ہو یا نہ ہو
یہ جنوں بھی کیا جنوں، یہ حال بھی کیا حال ہے؟ — ہم کہے جاتے ہیں، کوئی سُن رہا ہو یا نہ ہو

☆——☆——☆

عبث دھمکا رہے ہیں عشق میں اہلِ وفا مجھ کو — مجسّم زندگی ہوں، چھُو نہیں سکتی قضا مجھ کو

☆——☆——☆

جلوہ وہ کونسا ہے جو صورت کُشا نہ ہو — اَے اعتبارِ شوق! جو تُو ہو تو کیا نہ ہو
خُود ہے جمالِ دید ہی، وجہِ حجابِ دید — دیکھو اسے، وہ مجھ کو اگر دیکھتا نہ ہو

☆——☆——☆

کس کی نگاہ کافر غمّاز بن گئی ہے — میری تمام ہستی آواز بن گئی ہے

☆——☆——☆

دیکھ لو رنگ و روئے ناکامی! — یہ نہ پوچھو کہ بیکسی کیا ہے

☆——☆——☆

گزر گیا ہوں، یوں بھی مَیں مناظرِ حیات سے — کہ جیسے خُود غرض نہیں حیات سے، ممات سے

☆——☆——☆

جب سے وہ آنکھ شرمسار سی ہے — دل کو تسکین بے قرار سی ہے
دیکھیئے، یاس بھی رہے نہ رہے — یوں تو ظاہر میں وضع دار سی ہے

☆——☆——☆

مرے گناہوں کا کیا ٹھکانا، خیال سے شرم آ رہی ہے
رواں ہیں آنکھوں سے اشکِ پیہم، حیات گنگا بہا رہی ہے

☆——☆——☆

جب سے مری آنکھوں میں تری جلوہ گری ہے　　دُنیا مرے نزدیک تبسم سے بھری ہے!
یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے، کہتے ہیں جسے حُسن؟　　جب دیکھیے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے



یہ چاہتا ہوں الٰہی، کہ کچھ دنوں کے لئے　　خود اپنے عشق میں وہ شوخ مبتلا ہو جائے
خدا کی شان، کہ شورشِ حجابِ راز بنے　　سکوت آئینہ روئے مدّعا ہو جائے



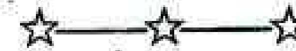
حُسن خود عشق کی صورت میں مقابل آئے　　کاش! ایسا ہو کہ تجھ پر ہی ترا دل آئے



جب اس طرف سے کوئی اہلِ نظر گیا ہے　　دل کی نزاکتوں پر عالم گذر گیا ہے



مجھے تو رشک آتا ہے غمِ جاناں کی ہستی پر　　بدل لے کاش! اپنی زندگی سے زندگی میری
اُسے صیاد نے کچھ، گُل نے کچھ، بلبل نے کچھ سمجھا　　چمن میں کتنی معنی خیز تھی اک خامشی میری
نگاہِ کرم کی ضرورت نہیں ہے　　کہ اب آپ مجھ میں تابِ محبت نہیں ہے
مجھے بھی ہے احساس اپنی خودی کا　　اگر اُن کو میری ضرورت نہیں ہے
محبت سے بھی ماورا ہے کوئی شے　　محبت ہی تنہا محبت نہیں ہے
کسے یاد رکھوں، کسے بھول جاؤں؟　　اب اتنی بھی، اے عشق! فُرصت نہیں ہے



جب نظر اپنی حقیقت آئی　　مُجھ پہ خود میری طبیعت آئی
جو مصیبت، جو قیامت آئی　　سب اسی دل کی بدولت آئی
دلِ مرحوم کے ماتم کے لئے　　بال کھولے شبِ فُرقت آئی
کوئی طوفاں بھی نہ ہو گا ایسا　　کیا اندھا دھند طبیعت آئی



کہاں تک عذابِ محبت اُٹھائیں　　بس اب وہ ہمیں، ہم اُنہیں بھول جائیں



کوچۂ یار ہے محبت ہے　　دَرد و دیوار سے محبت ہے
یار و اغیار سے محبت ہے　　گُل تو گُل، خار سے محبت ہے
میری صحرا نوردیاں، توبہ!　　ہر سرِ خار سے محبت ہے



میں اور تیرے عشق کے قابل، نہیں نہیں
مُجھ کو معاف کر کہ میں تجھ سا حسیں نہیں!
میرے سوا، زمان و مکاں ہوں اگر، تو ہوں
تیرے سوا زمان و مکاں بھی کہیں نہیں!



دل درد، جگر درد، دُعا درد، اثر درد
میں ہوں ہمہ تن درد، مری شام و سحر درد



جب تک شباب عشق مکمل شباب ہے
پانی بھی ہے شراب، ہوا بھی شراب ہے
جو خود نہ زندگی ہو، نہ پیغام زندگی
وہ حُسن قہر ہے، وہ محبت عذاب ہے
للہ! ان حدود میں رکھنا نہ تُو قدم
پیارے! جہانِ عشق، جہانِ خراب ہے



دیرینہ دوستی خوش انفاس کا لحاظ
اے محتسب! نزاکت احساس کا لحاظ



یہی حسن و عشق کا راز ہے کوئی راز اس کے سوا نہیں
کہ خدا نہیں تو خودی نہیں، جو خودی نہیں تو خدا نہیں



جان آنکھوں میں اٹک کر رہ گئی
ایک بجلی سی چمک کر رہ گئی



جہاں کی بزم آرائی ہے، میں ہوں
ہجوم رنجِ تنہائی ہے، میں ہوں



محبت کس کو کہتے ہیں، محبت کی بقا کیا ہے
خدائی کس کو کہتے ہیں، خودی کیا ہے، خدا کیا ہے



خودی کا اک تصوّر وارداتی اور لامحدود
نشاتی اور حیاتی اور ذاتی اور لامحدود
ہمہ تن وجد میں آ، رقص میں آ، جوش میں آ
حُسن کو ہوش میں لانا ہے تو خود ہوش میں آ



دل نے کچھ ایسی دُھن میں آج نغمۂ شوق گا دیا
عشق بھی جُھوم جُھوم اُٹھا، حُسن بھی مُسکرا دیا
مجھ کو خدائے عشق نے جو بھی دیا، بجا دیا
اُتنی ہی تابِ ضبط دی، جتنا ہی غم سوا دیا
آتشِ تر نے، ساقیا! کچھ نہ مجھے مزا دیا
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے تو نے یہ کیا پلا دیا
جذبِ جنوں نے آج تو گُل ہی نیا کھلا دیا
خود وہ گلے لپٹ گئے، عشق کا واسطا دیا
شوق نے بے خودی میں جب دستِ طلب بڑھا دیا
غیرتِ عشق نے وہیں پہلوئے دل دبا دیا

میں کہ تھا ایک مشتِ خاک حُسن جو مُسکرا دیا / عشق کی رُوح پھونک دی، رُوح کو جگمگا دیا
تُو رہے، تیرا غم رہے، میں رہوں، میرا دم رہے / کون تجھے بھلا سکا، کس نے تجھے بھلا دیا

قطعہ

میرے جنونِ عشق کی کیوں نہ ہو عاقبت خراب / مجھ کو ہنسا ہنسا کے آج، اُن کو رُلا رُلا دیا
میں بھی نہ لوں جو انتقام، مجھ پہ ہے، عاشقی حرام / دل نے تو کر کے اہتمام حُسن کا دل دکھا دیا



خیر ہو، اے نسیمِ ناز! پھیل نہ جائے بُوئے راز / تُو نے یہ کیا غضب کیا، غنچۂ دل کھلا دیا
میرے ہجومِ شوق پر، مُنہ سے تو کچھ نہ کہہ سکے / چہرے پہ رنگ آ گیا، ہاتھ میرا دبا دیا
حُسن بھی رشک سے بری ہو نہ سکا، نہ ہو بھی / اپنے سوا ہر ایک نقش، دل سے مرے مٹا دیا
شکوہ کریں ترا کہ شکر، ہائے، اے التفاتِ دوست! / جو نہ کہیں بھی جھک سکا، تُو نے وہ سر جُھکا دیا
بیٹھے ہیں سر جُھکائے کیوں، خاکِ مزار پر وہ اب / خاک سے پھر غرض ہی کیا، خاک میں جب ملا دیا
تُو مرے دل کی دھڑکنیں، رہنے دلے، چارہ گر، یونہی / ہاں، انہی دھڑکنوں نے تو مجھ کو مرا پتا دیا
ترکِ تعلقات سے عشق کہیں ہے بے نیاز / کہنے کی بات ہے فقط، کس نے کسے بھلا دیا
حُسن ہے حُسنِ بے اماں، ضد نہ کر اے غمِ نہاں / پھر یہ نگاہ و دل کہاں، پردہ اگر اُٹھا دیا
قسمتِ حُسن و عشق سے مجھ کو نہیں ہے کچھ گلہ / تجھ کو غرور اگر دیا، مجھ کو بھی حوصلہ دیا
سکرِ شباب و یادِ یار، دردِ فراق و انتظار / آنکھ کھلی سُلا دیا، آنکھ لگی جگا دیا
کفر کہاں، کہاں جگر! او بت سنگ دل مگر / ہائے رے شوقِ فتنہ گر، تجھ کو خُدا بنا دیا



فتنۂ روز گار میں امن ہے کیا، قرار کیا / حاصلِ زیست غم سہی، غم کا بھی اعتبار کیا
عشق کمالِ ہوش ہے، ہوش سے ننگ و عار کیا / سینۂ چاک چاک کر، دامنِ تار تار کیا
دیدہ و دل پہ کس کا بس، جان پہ اختیار کیا / ہو چکے اُن کے جب ہمیں، اُن پہ کریں نثار کیا
تیری نصیحتیں بجا، یہ تو بتا، اے ناصحا! / اور ہے عشق کے سوا مقصدِ حُسنِ یار کیا
عشق خزاں مزاج سے لطفِ جمال پوچھیے / جن کی نظر ہے خود بہار، اُن کے لئے بہار کیا
ناز سے مُسکرا کے دیکھ، چشمِ حیا اُٹھا کے دیکھ / دل سے حریف کے لئے نیچی نظر کا وار کیا
سوزِ تمام چاہیے، رنگ و دوام چاہیئے / شمع تہِ مزار ہو، شمع سرِ مزار کیا
کارِ عظیم چاہیئے طبعِ سلیم چاہیئے! / عزمِ صمیم چاہیئے، فکرِ مآلِ کار کیا
میں نے کیا ہے جُرمِ عشق، مجھ سے ہوئی خطائے شوق / خواہشِ عفو کس لئے بخششِ حسنِ یار کیا

فطرتِ شوق کی قسم، غیرتِ عشق کی قسم!
دولتِ دو جہاں سہی، دولتِ مستعار کیا
منزلِ عشق میں، جگر! غیر تو پھر بھی غیر ہیں
دل پہ بھی اعتماد کیوں، اپنا بھی اعتبار کیا



مانا کہ ہم پہ جور و جفا کیجئے گا آپ
لیکن ہمیں نہ ہوں گے، تو کیا کیجئے گا آپ
ہر چند ضبط حد سے سوا کیجئے گا آپ
آنسو نہ تھم سکیں گے، تو کیا کیجئے گا آپ
آنکھوں کی نیند، دل کی خلش کا نہیں علاج
بستر سے آہ کرکے اُٹھا کیجئے گا آپ
تنہائیاں تو ایک طرف، سب کے سامنے!
پہروں اُداس اُداس رہا کیجئے گا آپ
زُلفِ رمیدہ بو جو پریشاں نہ رہ سکی
روئے پریدہ رنگ کو کیا کیجئے گا آپ
ہونا ہے ایک دن جنہیں مشہورِ خاص و عام
کس دل سے وہ فسانے سُنا کیجئے گا آپ
چھپ چھپ کے جب نہ رو بھی سکیں گے بقدرِ ظرف
گھٹ گھٹ کے دل ہی دل میں رہا کیجئے گا آپ
ہر چند لائیے گا زباں پر نہ رازِ عشق
نظریں پکار اُٹھیں گی، تو کیا کیجئے گا آپ
چہرے پہ ہم سنوں کی تبسم تو کیا، مگر
اک فرضِ نا گوار ادا کیجئے گا آپ
اُتنا ہی اور ہو کے رہے گا غمِ آشکار
جتنی ہی احتیاط سوا کیجئے گا آپ
رہتا نہیں ہے جس میں کہ یارائے صبر و ضبط
نہ جانے، اُس جنون میں کیا کیجئے گا آپ
جب کچھ نہ بن پڑے گا مداوائے دردِ ہجر
رو رو کے مغفرت کی دُعا کیجئے گا آپ



ذرّوں سے باتیں کرتے ہیں، دیوار و در سے ہم
وابستہ کس قدر ہیں تری رہ گذر سے ہم
دیکھا جہاں بھی حُسن، وہیں لُوٹ ہو گئے
تنگ آ گئے ہیں اپنے مزاجِ نظر سے ہم
چھیڑیں کسی سے اور ہمارے ہی سامنے
لڑتے ہیں دل ہی دل میں نسیمِ سحر سے ہم
اتنی سی بات پر ہے بس اک جنگِ زرگری
پہلے اُدھر سے بڑھتے ہیں وہ، یا اِدھر سے ہم
کیونکر نہ ہو نظامِ دو عالم میں ابتری
کچھ بے خبر سے آپ ہیں، کچھ بے خبر سے ہم
حیرت خود ایک محشرِ خاموش بن گئی با!
بچ کر چلے تھے فتنۂ شام و سحر سے ہم
ذرّوں کو حُسن و عشق سے معمور کر دیا
دامن فشاں گذر گئے جس رہ گذر سے ہم
کوئی حسیں حسیں ہی ٹھہرتا نہیں، جگر!
باز آئے اس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم



نظمیں

مبارک بادِ صحت یابی

بفضلِ خُدا غسلِ صحت مبارک! مبارک یہ جشنِ مسرّت مبارک!
افق سے وہ پھوٹی کرن زندگی کی یہ آثارِ صبح سعادت مبارک!
یہ ہستی، یہ شملہ، یہ رونق سلامت یہ شوکت، یہ سطوت یہ عظمت مبارک!
یہ حُسن و جوانی، یہ علم و معانی یہ تائیدِ فیضانِ رحمت مبارک!
سعد الظفر خاں بہادر! تمہیں بھی رشید الظفر خاں کی صحت مبارک!
بایں سادگی و بہ ایں پاک فطرت بہ آرائش و زیب و زینت مبارک!
جو یہ اُن کے شیدا تو وہ اُن کے عاشق بہم بھائی بھائی کی اُلفت مبارک!
الٰہی! رہے تا ابد یہ بھرا گھر بھرے گھر کو بھرپور عشرت مبارک!
دُعا ہے کہ مل کر رہیں سب یہ اک دن تمہیں خدمت ملک و ملّت مبارک!
سبھی کچھ مبارک، تمہیں اور مجھ کو خود اپنی یہ نذرِ عقیدت مبارک!
بہ خلق و مروّت، بہ لُطف و محبت دلِ غیر پر بھی حکومت مبارک!
جگر پر عنایت تری روز افزوں اُسے مفت خوری کی عادت مبارک!



ایک شاعر کا پیغام

ایک مغرب زدہ ناظم کے نام

قوم و وطن کے مُدّعی، کون و مکاں پر چھائے جا فکر و عمل کی وسعتیں تنگ نہ کر بڑھائے جا
تو کہ ہے تنگِ زندگی، درس ترا درندگی زندگی و درندگی، یوں نہ بہم ملائے جا

اے کہ تیری ذہنیت ساختۂ فرنگیاں — خوب فریب کھا چکا، اب نہ فریب کھائے جا
تیرے تمام خلوتیں، شاہد و مطرب و شراب — بزم میں انقلاب کا شور مگر مچائے جا
تیرے فریب کے لئے کم نہیں پست ذوقیاں — بھر کے ہر ایک تازہ روپ، شعبدے تو دکھائے جا
تجھ کو خدا سے کیا غرض، چھوڑ خدا کا تذکرہ — مارکس کا تُو غلام ہے، مارکس کے گیت گائے جا
جہل ترا تری سرشت، علم ترا متاعِ غیر — حکمت و شعر کہہ کے تو سب کو یقیں دلائے جا
تیری نگاہ و فکر میں عصمتِ حُسن کچھ نہیں — اپنی یہ بُزدلی مگر مصلحتاً چھپائے جا
لُوٹ کے دوسروں کا مال، نوحۂ مفلسی سُنا — کھا کے پلاؤ قورمہ بھوک کے گیت گائے جا
اہلِ دُوَل کے سامنے دستِ ہوس ترا دراز — ہٹ کے وہاں سے گالیاں اِن کو مگر سُنائے جا
جب تیری مضحکات پر بزم کی بزم ہنس پڑے — داد سمجھ کے اپنا سر ناز سے تُو ہلائے جا



انتقالِ نواب سعید الملک

وہ جس کی دید سے ہوتا تھا حاصل — فراغِ دل، فروغِ زندگانی
جگر! موت ایسے کامل قدرداں کی — حقیقت میں ہے مرگِ قدردانی
یہ غم ہے ماورائے نوحہ خوانی — جوانی اور مرگِ ناگہانی!
بہت کچھ حسرتِ ماتم ہے، لیکن — حقیقت میں یہ غم ہے جاودانی
اُٹھی ہے آہ! دُنیا سے وہ ہستی — جو تھی ہر بات میں آپ اپنی ثانی
سعید الملک نواب، ابنِ نواب — بہارِ گلشنِ شاہِ جہانی
سراپا .... اخلاق و اخلاص — مجسم صورتِ پاکیزہ جانی
بہادر، شیر افگن، مردِ میداں — ....
دلوں پر کی ہے جس نے حکمرانی — ....

(ناتمام)



عید

ہر قوم کی ہے عید، ہر اک اِنس و جاں کی عید — لیکن نہیں تو مسلمِ حسرت نشاں کی عید
چھوٹی مسرتوں کا اگر نام عید ہے — بیشک ہے پھر تو ملّتِ اسلامیاں کی عید

ہم سایہ کے گھر میں (ہے) جو ناقہ، ہوا کرے — اپنی تو ہو ہی جاتی ہے نام و نشاں کی عید
خود غرضیوں کی آڑ میں ملّت فروشیاں — کہتے ہیں اس کو مُسلم ہندوستاں کی عید
احساس تک ہے وحدتِ قومی کا محوِ خواب — یہ حال ہو تو کیسی مسّرت کہاں کی عید
اپنی بلا سے، کوئی جئے یا کوئی مرے — اپنی تو ہو ہی جاتی ہے نام و نشاں کی عید



رُباعی

مریض قوم کے درماں مہاتما گاندھی — دلوں کی شمعِ فروزاں مہاتما گاندھی
تمام درد و خلوص و محبت و ایثار — حقیقتہً تھے اک انساں مہاتما گاندھی



مہاتما گاندھی

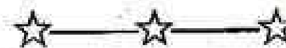
گاندھی[1] جی وہ خُلقِ مجسّم — گاندھی جی وہ ذاتِ مکرّم
گاندھی جی وہ محسنِ اعظم — سوگ ہے جن کا عالم عالم



آنکھیں اُن کے سوگ میں گریاں — سینے اُن کے غم میں ویراں
ہندو ہو یا کوئی مُسلماں — جس کو دیکھو حیراں، حیراں



ذرّہ ذرّہ، صحرا صحرا — قطرہ قطرہ، دریا دریا
بستی بستی، دُنیا دُنیا — ماتم ماتم، نوحا نوحا



اُن کا مذہب وحدانیت — اُن کا عقیدہ رُوحانیت
اُن کا مسلک انسانیت — اُن کی فضا نورانیت[2]



---

1. جگر کی بیاض نمبر ۴ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی) 2. کذا

اُن کے دل میں سب کی محبت اُن کی نظر میں سب کی عزّت
سب کی عزّت، سب کی عظمت سب کی سیوا، سب کی خدمت



اُن کا فیضِ عام مُسلسل! اُن کا دورِ جام مُسلسل
اُن کا ہر اقدام مُسلسل بات مکمل، کام مُسلسل



اُن کی سیاستِ کی گہرائی تھاہ کسی نے جس کی نہ پائی
راجندر اور آزاد، ڈسائی! اِک حد تک اِن سب کی رسائی



آہ! وہ اُن کی سادہ بیانی شبنم شبنم، پانی پانی
مدّھم مدّھم جس کی روانی لیکن اِک دریائے معانی



انسانوں کو مٹا کر ذاتیں ایک بنا دینے کی گھاتیں!
کس کے دن اور کس کی راتیں کون سنے یہ بہکی باتیں



جنگِ آزادی کے رہبر پریم اہنسا اُن کا لشکر
ظاہر میں طرف ایک قلندر باطن میں دارا و سکندر



دامِ غلامی توڑ کے نکلے رُوئے حوادث موڑ کے نکلے
نقشِ محبت جوڑ کے نکلے ٹوٹے دلوں کو جوڑ کے نکلے



عمر یونہی خدمت میں گذاری لاغر جسم اور گٹھڑی بھاری
بھارت ماتا خود یہ پکاری پریم کا داتا، پریم پجاری



کاش کہ ہم سب اتنا سمجھیں ہم پہ ہیں احساں کیا کیا سمجھیں
مل کر سوچیں، تنہا سمجھیں فرضِ عقیدت اپنا سمجھیں



ڈوب کے پھر سے اُبھرنا سیکھیں تقلید اُن کی کرنا سیکھیں
مخلص بن کے گذرنا سیکھیں جینا سیکھیں، مرنا سیکھیں



انساں ہے جو انسان کا دشمن عصمت اور ایمان کا دشمن!
ننھی ننھی جان کا دشمن وہ ہے ہندوستان کا دشمن



ہندو مُسلم مل کے گائیں گاندھی کا پیغام سنائیں
پھُول محبت کے برسائیں جنت اِس دُنیا کو بنائیں
(ناتمام)



یومِ آزادی

زبانِ اہلِ ہوس پر کلامِ آزادی[1] ہے اک فریب مُسلسل بنامِ آزادی
وہی سلاسل و زنداں، وہی ہے طوق و رسن اسی کو کہتے ہیں کیا احترامِ آزادی
قدم قدم پہ نمائش ہے کچھ، حقیقت کچھ اسی کا نام مگر ہے نظامِ آزادی
اقلیت کے لئے بند رہے درِ مقصود یہ دو برس کا ہے حاصل بنامِ آزادی
خود اپنے نشہ ...... میں جھومنے والے! ابھی ہے دُور بہت صبح و شامِ آزادی
وہی سیاستِ باطل، وہی نظامِ کہن بس اور کیا ہے ...... نقشِ دوامِ آزادی



اُس[2] غلامی پہ آپ ہیں آزاد آج بھی خوش ہے رُوحِ استبداد
ہوسِ مُلک و مال کی خاطر عظمتِ ملک و قوم ہے برباد



لوگ کہتے ہیں، وطن آزاد ہے میں سمجھتا ہوں، وطن برباد ہے
وہ وطن، وہ کشورِ ہندوستاں وہ چمن، وہ جنتِ رُوحانیاں
ہائے، وہ گہوارۂ صدق وصفا ہائے ، وہ سیارۂ مہر و وفا

---

[1] حسب روایت نیاز گونڈوی [2] مسودہ "آتشِ گل" نمبر ۱۶ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)

ہر درد کو بدلتی ہوئی انبساط سے[1] — ہر غم کو خوشگوار بناتی چلی گئی
ہر موجِ بحرِ حُسن سے خود کھلتی ہوئی — ہر آرزو کی پیاس بجھاتی چلی گئی



تکیہ

عکسِ[2] رُوئے نگار ہے تکیہ — واہ کیا پُر بہار ہے تکیہ
ہم سے پُوچھو تو دستِ صنعت کا — طُرفہ اک شاہکار ہے تکیہ
رُوح پرور بھی، خواب آور بھی — جیسے آغوشِ یار ہے تکیہ
جب اِسے دیکھئے کسی کے لئے — ہمہ تن انتظار ہے تکیہ
راحتِ جانِ ہر امیر و فقیر! — رحمتِ کردگار ہے تکیہ
جس جگہ دیکھئے طلب اس کی — شاہدِ روزگار ہے تکیہ
مذہب و ملک و قومِ سے آزاد — کیا وسیع الشعار ہے تکیہ
اِک جہاں کو پیامِ خواب مگر — آپ شب زندہ دار ہے تکیہ
شاہدِ خوابِ ناز کے رُخ کا — کیا ہی سادہ سنگھار ہے تکیہ
دردمندانِ شامِ فُرقت کا — مونس و غمگسار ہے تکیہ
شب کی بے تابیاں ہیں محو اس میں — درد کا پردہ دار ہے تکیہ
موجِ راحت ہے تار تار اس کا — اور کبھی خار خار ہے تکیہ
عہدِ رنگین و دَورِ غمگیں کا — زندہ اک یادگار ہے تکیہ
داستانیں ہیں اس میں لاکھوں دفن — اک جہانِ مزار ہے تکیہ
دیکھ لو حُسن و عشق کے جلوے — ان کا آئینہ دار ہے تکیہ
اس کی ہر سطر مستقل تاریخ — کیا حقیقت نگار ہے تکیہ
راز جو چاہیئے بیاں کیجئے — لائقِ اعتبار ہے تکیہ
شب کی تنہائیوں کے عالم میں — مونسِ جانِ زار ہے تکیہ
درد کو اس کے کوئی کیا جانے — آپ اپنی پُکار ہے تکیہ

---

[1] حسب روایت نیاز گونڈوی [2] جگر کی ایک ڈائری مملوکہ حمید صدیقی۔

اس کی توصیف سب بجا، لیکن کاہلی کا شکار ہے تکیہ
طبیہ نے اسے بنایا ہے قابلِ افتخار ہے تکیہ

☆——☆——☆

ساقی سے خطاب

وطن کا کیا قصور اس میں، وطن کو دوش کیوں دیجے وطن دشمن بنے ہیں خود محبانِ وطن ساقی

☆——☆——☆

وہ پاکستان ہے ساقی، یہ ہندوستان ہے ساقی مگر انسانیت کا ہر جگہ فُقدان ہے ساقی
یہاں سرمایہ داری، چور بازاری کے میلے ہیں یہاں اپنی حکومت ہے، یہ ہندوستان ہے ساقی

☆——☆——☆

یہاں کے ہوٹلوں میں گوشت بک جاتا ہے بچوں کا یہاں فرقہ کشی کی ذہنیت بھی عام ہے ساقی

☆——☆——☆

جواں رندوں کے اس فقرے پہ کیا ارشاد ہے ساقی
"زمانہ ہے نیا اور زائد المیعاد ہے ساقی"
کہاں میرا نشیمن تھا، اب اس کی کیا خبر، لیکن
کہیں میں بھی چہکتا تھا، بس اتنا یاد ہے ساقی
یہ آبادی، یہ ویرانہ، یہ ہنگامے، یہ سنّاٹے
زمانہ کس قدر مجموعۂ اضداد ہے ساقی
نہیں دیتا کسی کو جامِ مے بارِ دِگر ساقی
زمانے کے تقاضوں کی بھی رکھتا ہے خبر ساقی
یہ سوز و ساز کا عالم، یہ اشک و آہ کی دُنیا
بجا ہے، اس کو کہتے ہیں اگر دارالمحن ساقی
سلامت تیری ہستی، میری مستی، تیرا مے خانہ
مبارک میری گستاخی، مرا دیوانہ پن ساقی

یہ عالم گیر شیطانی سیاست، اے معاذ اللہ!
نہیں انسانیت کو اب مجالِ دم زدن ساقی
جہاں جھوٹی صداقت ہو، ہمیں اُس سے نہیں مطلب
جہاں سچی محبت ہو، وہی میرا وطن ساقی
جہاں اعلیٰ سیاست کا تخیل تک نہیں ممکن
جہاں اک جنسِ کاسد ہو حقیقی علم و فن ساقی



نذرِ غالبؔ

اے وہ کہ تری ذاتِ گرامی بہ ہمہ رنگ
قدرت کی جو ہمراز تو فطرت کی ہم آہنگ
اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا نغمۂ فطرت
اے وہ کہ ہر اک نقش ترا روکشِ ارژنگ
اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبشِ لب سے
اک جنتِ شاداب ہر اک غنچۂ دل تنگ
اے وہ کہ تری فکر بہ ہر طرز و بہ ہر صنف
ہم شعلہ وہم شبنم وہم شیشہ وہم سنگ
اقلیمِ سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے
ہم نغمہ وہم دشنہ وہم نکہت وہم رنگ
ہر پھول ترے باغ کا فردوس بہ دامن
ہر خار ترے دشت کا انگشت شفق رنگ
اک گوشۂ دامن میں مرے دجلہ وجیحوں
اک موجِ نفس میں تری رقصاں جمن و گنگ
تو نظم میں بھی، نثر میں بھی مجتہد العصر
لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ
تو نے اسے گنجایشِ کونین عطا کی
ہر چند بہت تھا ابھی دامانِ غزل تنگ
لاریب کہ اس ذات سے واقف تھی تری ذات
افسانہ ہمہ رنگ و حقیقت ہمہ بے رنگ
الحق کہ تری وسعتِ تخیل کے آگے
صحرا کفِ خاکستر و گلشن قفسِ رنگ



گیت

(ایک آزاد ملک و وطن کے ایک نو وارد مسافر سے)
شاعر کا خطاب

بھاگ مُسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ
بھاگ مُسافر بھاگ ....!
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مُسافر بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ

☆——☆——☆

دیس کے اپنے کرتا دھرتا اکثر ہیں وہ لوگ
دل میں جن کے کنکر پتھر فطرت جن کی گھاگ
بھاگ مُسافر بھاگ ....!
گاندھی جی کا نام زباں پر من کے اندر روگ
کام نہیں بے جھانسا پٹی، بات نہیں بے لاگ
بھاگ مُسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ
جنتا جاہل ننگی بھوکی اور یہاں کچھ لوگ
اپنے اپنے رنگ محل میں بیٹھے اڑائیں کاگ
بھاگ مُسافر بھاگ ....!
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مُسافر بھاگ

بھولی بھولی صورت والے پوٹ ہیں وِس کی پوٹ
گوری چٹی رنگت والے ناگ ہیں کالے ناگ

ناگ ہیں کالے ناگ مُسافر، ناگ ہیں کالے ناگ
بھاگ مُسافر، بھاگ مُسافر، بھاگ مُسافر بھاگ

میرے وطن سے، میرے چمن سے بھاگ مُسافر بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ



کوچے کوچے، گوشے گوشے، لوٹ مچی ہے لوٹ
جنگل جنگل، بستی بستی آگ لگی ہے آگ

بھاگ مُسافر بھاگ ....!

تیرے وطن میں میل محبت، فرض کا عام احساس
میرے وطن میں پھوٹ عداوت، اپنے اپنے بھاگ

بھاگ مُسافر بھاگ ....!



ہولی آئی ہولی آئی، اب ہے یہاں یہ ریت
دولت چھینیں عصمت لوٹیں، خون سے کھیلیں پھاگ

خون سے کھیلیں پھاگ مُسافر، خون سے کھیلیں پھاگ
بھاگ مُسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ

آزادی کی بھیک سے ملتا آخر کیا انعام
فتنے جاگے، بھیروں ناچا، موت نے چھیڑا راگ

موت نے چھیڑا راگ مُسافر، موت نے چھیڑا راگ
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مُسافر بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ



کیا چیز غمِ عشق کی دیوانہ وشی ہے
رونا ہے تو رونا ہے، ہنسی ہے تو ہنسی ہے

ہر چند کہ تکرارِ نظر بے ادبی ہے
پر کیجئے کیا، عشق کی فطرت ہی یہی ہے

آسان نہیں جہدِ مسلسل سے گزرنا
ہر گام یہاں مرحلۂ خود شکنی ہے

اک طرزِ تصوّر کے کرشمے ہیں بہ ہر رنگ
اے دوست یہ دُنیا نہ بُری ہے نہ بھلی ہے

اک منزلِ بے نام نہ حسرت نہ تماشا
اک عالمِ حیرت کہ نہ غم ہے نہ خوشی ہے

بن جاؤں نہ بے گانۂ آدابِ محبت
اتنے نہ قریب آؤ مناسب بھی یہی ہے

وہ ظلم بھی کرتے ہیں تو فرماتے ہیں احساں
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو خاطر شکنی ہے

[1] یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حُسن
جب دیکھیے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے



---

[1] شعر ''شعلۂ طور'' شائع ہو چکا ہے۔ اب اس غزل میں شامل کر لیا گیا ہے

دردِ جگر

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر میں عیاں ہوتا ہے
سخت خوں ریز جب آشوبِ جہاں ہوتا
نہیں معلوم یہ انسان کہاں ہوتا ہے
جب کوئی عشق میں بربادِ جہاں ہوتا ہے
مجھ کو محسوس خود اپنا ہی زیاں ہوتا ہے
حُسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے
ہائے وہ وقت کہ جب حُسن پہ آتا ہے شباب
اُف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے
وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں کہ جب
دل پہ احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے
کہیں ایسا تو نہیں وہ بھی ہو کوئی آزار
تجھ کو جس چیز پہ راحت کا گماں ہوتا ہے
ہائے وہ سلسلۂ اشک کہ جو تیرے حضور
دل میں رہتا ہے نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے



لمعاتِ طُور

شکستِ توبہ

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا، لہرا کے پی گیا
بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے، تھرّا کے پی گیا
زاہد یہ میری شوخیٔ رندانہ دیکھنا!
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گے
سر مستیٔ ازل مجھے جب یاد آگئی
دُنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گے
آزردگیٔ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گے
اے رحمتِ تمام! مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گے
پیتا بغیر اذن، یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گے
اُس جانِ میکدہ کی قسم، بار ہا، جگر!
کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا



غمِ انتظار

نظر ہے وقفِ غمِ انتظار، کیا کہنا
کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار، کیا کہنا!
یہ چشمِ مست، یہ ابرو، یہ زلف، یہ خدو خال
یہ لب، یہ رُخ، یہ جبیں، یہ عذار، کیا کہنا!
شباب اور مکمل شباب، ارے توبہ!
بہار اور مجسّم بہار، کیا کہنا!
تصادمِ نگہِ شوق، اے معاذ اللہ!
تبسّمِ نگہِ فتنہ کار، کیا کہنا!
فروغِ حُسن و نوائے سرود و طرفِ چمن
شرابِ عشق و لب جوئے یار، کیا کہنا!
گل بنفشہ و نسرین و نسترن، کیا خوب!
بہار و سایۂ ابر بہار، کیا کہنا!
بیانِ درد و زبانِ خموش و عرضِ نیاز
جبینِ شوق و کفِ پائے یار، کیا کہنا!

گذارشِ دلِ غم آفریں، معاذ اللہ! نگارشِ غمِ ہمت شکار، کیا کہنا!
تمام شوقِ شکایت، تمام مہر و وفا فسانۂ دلِ بے اختیار، کیا کہنا!
فسونِ نیم نگاہی و سحرِ استغنا سکوتِ حُسن و لبِ نغمہ بار، کیا کہنا!
وفورِ بے خودی و ضبطِ غم، جزاک اللہ! سرورِ بادۂ نا خوشگوار، کیا کہنا!
شراب ریز نشیلی نگہ، ارے توبہ! پیالہ گیر کفِ رعشہ دار، کیا کہنا!
سبک روانیٔ اشک و خنک نسیمِ کرم نشاطِ دردِ دلِ بے قرار، کیا کہنا!
کرم نما ستمِ نازِ حُسن، اے توبہ! ستم نما کرمِ خاصِ یار، کیا کہنا!
نگاہِ ناز کے پیہم اشارہ ہائے لطیف شکستِ شیشۂ دل بار بار، کیا کہنا!

حریمِ حُسن کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں، جگرؔ
یہی اگر ہے غمِ انتظار، کیا کہنا!



تصویر و تصوّر

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت، وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مُسکرا رہے ہیں
وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسّم، وہی ترنم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا، وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں
خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
شباب رنگیں، جمال رنگیں، وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے مظہر، تمام رنگینیوں کے منظر
سنبھل سنبھل کر، سمٹ سمٹ کر، سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں
بہار رنگ و شباب ہی کیا، ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے، جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

طیور سرشارِ ساغرِ مل، ہلاکِ تنویرِ لالہ و گل!
سب اپنی اپنی دھنوں میں مل کر عجب عجب گیت گا رہے ہیں
شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے، اُچھل رہی ہے، پیے ہوئے ہیں، پلا رہے ہیں
خود اپنے نشے میں جھومتے ہیں وہ اپنا مُنہ آپ چومتے ہیں
خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں، ہلاکِ ہستی بنا رہے ہیں
فضا سے نشہ برس رہا ہے، دماغ پھولوں میں بس رہا ہے
وہ کون ہے جو ترس رہا ہے، سبھی کو میکش پلا رہے ہیں
زمین نشہ، زمان نشہ، جہان نشہ، مکان نشہ
مکان کیا، لامکان نشہ، ڈبو رہے ہیں، پلا رہے ہیں
وہ رُوئے رنگیں، وہ موجۂ یم، کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیِ حُسن کا ہے عالم، عرق عرق ہیں، نہا رہے ہیں
یہ مست بُلبُل بہک رہی ہے، قریب عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے، وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں
یہ موجِ دریا، یہ ریگِ صحرا، یہ غنچہ و گل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں، یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موجِ دریا ٹھہر گئی ہے
سکوتِ نغمہ بنا ہوا ہے، وہ جیسے کُچھ گنگنا رہے ہیں
اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدّر، رہے گا لیکن یہ نقش دل پر
ہم اُن کا دامن پکڑ رہے ہیں، وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں
یہ اشک جو بہہ رہے ہیں پیہم، اگرچہ سب ہیں یہ حاصلِ غم
مگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بھی کُچھ مُسکرا رہے ہیں
ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی، یہ دیکھتا ہوں نئی تجلّی
طلسمِ صورت مٹا رہے ہیں، جمالِ معنی بنا رہے ہیں
خوشی سے لبریز شش جہت ہے، زبان پر شورِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں



نرگسِ مستانہ

(خطاب بہ اصغرؔ نور اللہ مرقدہٗ)

اپنا ہی سا اے نرگسِ مستانہ بنا دے
میں جب تجھے جانوں، مجھے دیوانہ بنا دے
ہر قید سے ہر رسم سے بیگانہ بنا دے
دیوانہ بنا دے، مجھے دیوانہ بنا دے
اک برقِ ادا خرمنِ ہستی پہ گرا کر
نظروں کو مری طُور کا افسانہ بنا دے
ہر دل ہے تری بزم میں لبریزِ مئے عشق
اک اور بھی پیمانے سے پیمانہ بنا دے
تو ساقیٔ میخانہ بھی، تو نشّہ و مے بھی
میں تشنۂ مستی، مجھے مستانہ بنا دے
اللہ نے تجھ کو مے و میخانہ بنایا
تو ساری فضا کو مے و میخانہ بنا دے
تو ساقیٔ میخانہ ہے میں رندِ بلا نوش
میرے لئے میخانہ کو پیمانہ بنا دے
یا دیدہ و دل میں مرے تو آپ سما جا
یا پھر دل و دیدہ ہی کو ویرانہ بنا دے
قطرے میں وہ دریا ہے جو عالم کو ڈبو دے
ذرّے میں وہ صحرا ہے کہ دیوانہ بنا دے
لیکن مجھے ہر قیدِ تعیّن سے بچا کر
جو چاہے وہ، اے نرگسِ مستانہ بنا دے

عالم تو ہے دیوانہ جگرؔ حُسن کی خاطر
تو اپنے لئے حُسن کو دیوانہ بنا دے

کب تک نگہِ یار نہ ہو گی متبسّم
تو اپنا ہر انداز حریفانہ بنا دے
منکر تو نہ بن حُسن کے اعجازِ نظر کا
کہنے کے لئے اپنے کو بیگانہ بنا دے
جب تک کرمِ خاص کا دریا نہ اُمڈ آئے
تو اور بھی حال اپنا سفیہانہ بنا دے
بُت خانے میں آنکلے تو کعبہ کی بنا ڈالی
کعبہ میں پہنچ جائے تو بُت خانہ بنا دے
جو موج اُٹھے دل سے ترے جوشِ طلب میں
سر رکھ کے وہیں سجدۂ شکرانہ بنا دے
جب مائلِ الطاف نظر آئے وہ خود بیں
تو ہر نگہِ شوق کو افسانہ بنا دے
کونین بھی مل جائے تو دامن کو نہ پھیلا
کونین کو بُھولا ہوا افسانہ بنا دے
پھر عرض کر اس طرح جگرؔ شوق و ادب سے
بے باک اگر جرأتِ رندانہ بنا دے
تجھ کو نگہِ یار! قسم میرے جنوں کی
ناصح کو بھی میرا ہی سا دیوانہ بنا دے

میں ہوں ترے قدموں میں، مجھے کچھ نہیں کہنا
اب جو بھی ترا لطف کریمانہ بتا دے



یادِ ایّام

ذوقِ صورت سازو شوقِ جلوہ ساماں داشتم
یاد ایامے کہ منزل منزلِ جاں داشتم

دست در دستِ نگارِ شوخ و سیرِ کوہِ طور
بود حاصل ہر تمنائے کہ پنہاں داشتم

از جمالِ حُسنِ ساقی، صد بہاراں در نظر
وزِ فروغِ بادہ بر خود صد گلستاں داشتم

در فضائے آسمانِ حُسن، چوں سیارگاں
اصغر وہم شاد وہم اختر غزل[1]خواں داشتم

گہ بزیرِ طور، پیہم دعوتِ ذوقِ نظر
گہ بہ مقفش دولتِ حُسنِ خراماں داشتم

آہ، آں ساعت کہ از فیضِ جمالِ ہم نشین
ہر نفس در ہر نظر، جنت بداماں داشتم

حسرتِ آفت سرشت و آرزوئے بے قرار
آنچہ در دل داشتم، بیحد و پایاں داشتم

محشرستاں بودم و از فیض دردِ مستقل
پیشِ چشم شوق ہر سو محشرستاں داشتم

کیست؟ کو گوید بہ سرکار از دلِ بیکس پیام
چوں تو کافر ماجرا سروِ خراماں داشتم

ہم چمن آوارہ ام ہم سر بہ صحرا دادہ ام!
من جگر ہستم، ہماں کامروز دور افتادہ ام

یاد ہیں اب تک جگر وہ بیقراری کے مزے
درد پیہم کی لگاوٹ، زخم کاری کے مزے

وہ جبینِ شوق اپنی، وہ کسی کے پائے ناز
سجدہ ریزی کی لطافت، اشکباری کے مزے

حُسن کی سرشاریاں، خوابِ جوانی کی بہار
عشق کی بیتابیاں، شب زندہ داری کے مزے

کہیے کیا کیفیتِ ناز و نیازِ حُسن و عشق
راز داری جانتی ہے راز داری کے مزے

وہ سکونِ بیخودی وہ جلوۂ حیرت فروش
وہ جنونِ شوق، وہ بے اختیاری کے مزے

شوق کی رُو داد پر وہ حسن کی بے مہریاں
عشق کی فریاد پر وہ شرمساری کے مزے

آنکھوں آنکھوں میں تقاضا کچھ نگاہِ ناز کا
دل ہی دل میں اُف! وہ ذوقِ جاں نثاری کے مزے

انتہائے سادگی و شوق سامانی کے لُطف
ابتدائے عاشقی و خام کاری کے مزے

دل مجسّم درد ہے، دل ہی سے اک دن پوچھیے
شام سے لے کر سحر تک دم شماری کے مزے

---

[1] جناب شیخ اصغر حسین مین پوری، جناب شاد مین پوری اور جناب اختر رام پوری (جگر)

ہر جمالِ نو کی پیہم، اللہ اللہ! شانِ خاص
ہر خیال تازہ کی نااستواری کے مزے
عشق کے مضبوط ترکِ عہد مطلب کی شکست
حسن کی نامستقل غفلت شعاری کے مزے
وہ اک آہِ آتشیں کا جانِ مضطر سے سلوک
وہ نگاہِ شرگیں کی غم گساری کے مزے
اپنی ہر لغزش سے پیدا عشق کا لطفِ یقیں
اُس کے ہر انداز پر بے اعتباری کے مزے
آہ وہ دورِ محبت کی گذشتہ لذّتیں
خوشگواری کے مزے ناخوشگواری کے مزے
ہر نفس ہے اب تو اعلانِ شکستِ آرزو
اب کہاں بے گردگی میں پردہ داری کے مزے؟
قطرہ قطرہ موجِ صہبا ذرہ ذرہ جامِ جم
اب کہاں سے لایئے اُس میکساری کے مزے؟

شور مستانہ کجا و جلوۂ ساقی کُجا
آہ، آں منظر کجا و آں مئے باقی کُجا

اے کہ وابستہ ترے دم سے نظامِ آرزو
سُن پیامِ آرزو، بعد از سلامِ آرزو
تو کہ جانِ حُسن ہے اور حُسن تیری جان ہے
ہاں مبارک ہو تجھے عیشِ دوامِ آرزو
تیری ہر موجِ تبسم، تیری ہر موجِ نظر
ایک برقِ طور تھی، بالائے بامِ آرزو
تیرا روئے آتشیں، سجودِ صبح دلبری
تیری زلفِ عنبریں، معبودِ شامِ آرزو
چشم و دل پر وہ عنایت وہ کرم وہ مرحمت
اللہ اللہ! تو کرے یوں احترامِ آرزو
میں نہیں بھولا تجھے تجھ کو بھی شاید یاد ہو
مجھ پہ وہ چھایا ہوا کیفِ تمامِ آرزو

حرفے از دردِ دل بے مدّعائے گفتن است
ماجرائے گفتن وصد ماجرائے گفتن است



مجذوب کی صدا

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر؟ جو ہوں تو کیا ہوں میں
بیان جرمِ محبت ہے، جانتا ہوں میں
خطا معاف کہ مجبورِ التجا ہوں میں
فریب خوردہ و رنگینیٔ ادا ہوں میں
نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں
کمالِ بے بصری پر بھی کیا بلا ہوں میں
وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے، یہ دیکھتا ہوں میں
تمام اصل و حقیقت کا آئنا ہوں میں
خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں
کرشمہ سازی ہنگامۂ جہاں معلوم
خود اپنے حُسنِ صفائی پہ مبتلا ہوں میں

جہانِ عشق میں آوارگی نہ پوچھ مری
ازل سے گرم روِ عرصۂ بلا ہوں میں

گواہ ہیں مری رسوائیاں محبت میں
تمام شوق ہوں اور شوقِ بر ملا ہوں میں

جنونِ عشق میں عریانیوں پہ میری نہ جا
بہت قریب، بڑا دیر آشنا ہوں میں

نبود و بود کا کل راز جس میں مضمر ہے
بساطِ عجز پہ وہ نقشِ ابتدا ہوں میں

فتادگی مرا شیوہ شکستگی مری شان
خود اپنی راہِ حقیقت کا رہنما ہوں میں

سمجھ میں خاک نہ آئیں گے معنی و مطلب
مجھے نہ سن کہ بہت دُور کی صدا ہوں میں

گراں ہے میری لطافت پہ یہ غبارِ وجود
اُسے بقا مری سمجھو، اگر فنا ہوں میں

کدھر ہے؟ منظرِ ہستی کے دیکھنے والے!
یہ ساز وہ نہیں، جس ساز کی صدا ہوں میں

وہ جام اک مئے بے رنگ کا پلا ساقی!
کہ بھول کر بھی نہ پھر محوِ ماسوا ہوں میں

بجا ہے حُسن اگر مجھ پہ اعتماد کرے
دل ربودہ و آہِ شکستہ پا ہوں میں

نگاہِ شوق کو بھی رخصتِ کلام نہ دی
مزاجِ حُسن سے کس درجہ آشنا ہوں میں

قدم ذرا جو ہٹے جادۂ وفا سے کہیں
ہر ایک ذرہ پکارا کہ دیکھتا ہوں میں

کُھلا ہوا ہے مرے سامنے صحیفۂ عشق
سمجھ رہا ہوں، مگر کیا سمجھ رہا ہوں میں

مٹائے لاکھ زمانہ، مٹا نہیں سکتا
اگر یہ سچ ہے کہ تیری ہی اک ادا ہوں میں

ہر ایک شے نظر آتی ہے خود مری تصویر
جہاں سے منظرِ فطرت کو دیکھتا ہوں میں

فضائے دہر کی ہر موج جس سے رقص میں ہے
وہ ایک نغمۂ بے ساز و بے صدا ہوں میں

جہاں نہ پھونک دیں آتش نوائیاں میری
کہ سوز سینۂ ربابِ با صفا ہوں میں

تصوّرات کی آئینہ بندیاں بے سُود
تعیّنات کی دُنیا سے ماورا ہوں میں

مجھے تلاش کر، اے بیخودیٔ شوقِ سجود!
پہنچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

مجھے نہ چھیڑ بہت، اے نسیمِ صبحِ کرم!
تمام شوق و شکایت کا ماجرا ہوں میں

مٹا نہ صفحۂ ہستی سے میرا نقشِ وجود
کہ فخرِ عاشقی و نازشِ وفا ہوں میں

جگرؔ، یہ ہرزہ سرائی مری، یہ بے ربطی
یقیں ہوا کسی ”مجذوب کی صدا“ ہوں میں



نغمۂ اِسلام

ہر طرف غل ہے، وہ آیا جگر بادہ پرست　　اثر نشۂ صہبا سے سراپا بدمست
شعرِ حافظ بزباں، جام بکف، شیشہ بدست　　بے خبر از ہمہ عالم، چہ بلند است وچہ پست
شورِ مستانہ کہاں اور سخنِ وعظ کہاں
آج یہ رند کہاں، انجمنِ وعظ کہاں

جمع مومن بھی ہیں، عالم بھی ہیں، دیندار بھی ہیں　　معتدل رنگ کے بھی لوگ ہیں، احرار بھی ہیں
واقفِ رازِ سرا پردۂ اسرار بھی ہیں　　دیں کے طالب بھی ہیں، دنیا کے طلبگار بھی ہیں
کیا سمجھ کر یہ چلے آئے ہیں اپنے جی میں
ان سے پوچھو تو کوئی، آپ ہیں کس گنتی میں

جانتا ہوں کہ ہوں دراصل میں ننگ اسلام　　کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ خوفِ انجام
میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام　　وہی میخانہ و ساقی، وہی بادہ، وہی جام
مجھ کو اپنی روش خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریا کاریٔ دیندار نہیں

باہمہ رندی و سرمستی و عشرت طلبی　　ہوں درِ احمد مرسل کا غلام نسبی
"مرحبا سیدِ مکّی مدنی العربی　　دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی!"
کیوں نہ پھر رحمتِ باری کا طلبگار ہوں میں
ہاں مجھے فخر ہے اس پر کہ گنہگار ہوں میں

وہ رسولِ عربی، فخرِ رسولانِ سلف　　ذاتِ اقدس سے ملا جس کی زمانے کو شرف
جس پہ نازل ہوا قرآن سا کامل مصحف　　جس کے تابع جن وانساں، ملائک کی بھی صف
اک وہی شمعِ نبوّت جو ضیا بار ہوئی
ساری تاریک فضا مطلع الانوار ہوئی

ہر زمانے میں پیمبر بھی، نبی بھی آئے　　مصلحِ ملّی و مُلکی بھی، رشی بھی آئے
حق کے جوئندہ بھی اور حق کے ولی بھی آئے　　واقفِ محرمِ سرِ ازلی بھی آئے
آئے دنیا میں بہت پاک مکرّم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالم بن کر

کس نے جامِ مئے توحید پلایا سب کو؟ کس نے پیغامِ مساوات سُنایا سب کو؟
راستہ کس نے حقیقت کا دکھایا سب کو؟ کس نے اس حُسن کا دیوانہ بنایا سب کو؟
تم نے دیکھا ہے بہت دفترِ پیغام اس کا
اور ایسا کوئی گذرا ہو تو لو نام اس کا
تم میں صدیقؓ سا گذرا ہو تو للّٰہ! دکھاؤ تم نے فاروقؓ سا دیکھا ہو تو للّٰہ! دکھاؤ
کوئی عثمانؓ سا آیا ہو تو للّٰہ دکھاؤ کوئی حیدرؓ سا جو پایا ہو تو للّٰہ! دکھاؤ
ثانیٔ احمدؐ بے میم تو کیا لاؤ گے
اس کی اُمت کی مثالیں بھی نہیں پاؤ گے
غم نہ کر مُسلمِ حیرت زدہ و مُہر بلب آشنا رنگِ فنا سے نہیں تیرا مذہب
یہ حوادث ہیں ترے تیری ترقی کے سبب تیرے حامی ہیں نبی، تیرا نگہبان ہے رب
فتنے اکثر بہت اس طرح کے اُٹھوائے گئے
ایسے دجّال زمانے میں بہت آئے، گئے



ہلالِ عید

آہ اور عشرت فزائے روحِ انسانی ہلال! آہ او قدرت نمائے شانِ یزدانی، ہلال!
آہ او فطرت لِقائے بزمِ نورانی، ہلال! آہ او صورت کشائے ذوق وجدانی، ہلال!
تُو نویدِ انبساطِ خاطرِ پژمردہ ہے
حسرت اُس مایوس پر، اس پر بھی جو افسردہ ہے
دیکھتا ہوں میں تجھے، تو دیکھتا ہے میرا حال جانِ مضطر، قلب آزردہ، پریشاں سر کے بال
تو دلیلِ اوج و رفعت، میں سراپا پائمال آہ یہ دن، آہ یہ شب، آہ یہ شامِ ملال
از دلِ افگارِ جنوں وجہ دلِ افگاری مپرس
آہ غم خوارِ غم! حالِ غم آزادی مپرس
حال میرا پوچھتا ہے، مجھ سے تُو، اے بے خبر! ہو چکی تاریک چشمِ یاس میں شام و سحر
آہ وہ غم کی کہانی بڑھ گئی ہے کس قدر! جس کو میں سمجھے ہوئے تھا داستانِ مختصر
سال بھر پیچھے عیادت کو مری آیا ہے تُو
لا، دوائے اضطرابِ درد کیا لایا ہے تُو

خیر تو خاموش ہے، تو ہم سمجھتے ہیں یہ راز　　　خیر، تو چپ ہے، تو ہم خود ہی بجاتے ہیں یہ ساز
اُٹھ گئی تھی جب سے تیری جانب اک انگشتِ ناز　　　ہے اسی دن سے طبیعت تیری اس درجہ گداز

تیرے گھٹنے اور بڑھنے میں بھی پنہاں بھید ہے
تُو قتیلِ غم نہیں ہے، زندۂ جاوید ہے

مجھ میں تجھ میں، اک زمین و آسماں کا فرق ہے　　　میں ہوں مضطر، تو ہوائے دلکشی میں غرق ہے
تیرے آگے زرد چہرہ آفتابِ شرق ہے　　　اور میرے واسطے تیری جھلک ہی برق ہے

ہاں، مگر اک امتیازِ عاشقی مجھ میں بھی ہے
جانتا ہوں میں کہ جو مجھ میں ہے، وہ تجھ میں بھی ہے

فرق اتنا ہے کہ تُو ہے کامیابِ آرزو　　　ذرّہ حسرت ہوں میں، تو آفتابِ آرزو
اُٹھ چکا ہے تیری نظروں سے حجابِ آرزو　　　اور اب تک گم ہوں میں زیرِ نقابِ آرزو

لاکھ پر بھاری ہے تیری ایک ہستیِ نحیف
دیکھ لینے سے ترے کھل جاتی ہے چشمِ ضعیف

اک زمانہ تھا کہ تھی میری طبیعت بھی گداز　　　اب تو ہوں اک ہستیِ موہوم کا خاموش ساز
جتنے سجدے تھے جبیں میں، کر چکا صرفِ نیاز　　　ہو چکی مہمانیٔ غم اُٹھ چکے اب دل کے راز

بدر تھا پہلے، مگر اب میں ہلالی ہو گیا
ہجر میں اتنا گھلا، نقشِ خیالی ہو گیا

آ، کہ رخصت تجھ سے ہو لُوں، تیری رخصت دیکھ لوں　　　آ کہ دم بھر اور اپنا نقشِ حسرت دیکھ لوں
آ کہ تیرے آئینے میں خطِ قسمت دیکھ لوں　　　آ کہ اپنے دیکھنے والے کی صُورت دیکھ لوں

دیکھ کر صورت تری، جان اپنی دے دوں گا تجھے
اب کے دیکھا ہے تجھے، اب کے نہ دیکھوں گا تجھے

(ناتمام)

برخویش نگاہے کن

نورِ مطلق کی ضیا اس عرش کے تارے میں دیکھ　　　اپنی خوابیدہ حقیقت دل کے گہوارے میں دیکھ
اعتبارِ حُسن پر یہ شورش و مستی تری!　　　کچھ خبر بھی ہے تجھے، کیا چیز ہے ہستی تری
ختم ہونے کے قریب آیا ہے افسانہ ترا　　　خود پیامِ مرگ ہے محدود ہو جانا ترا
قعرِ پستی سے اُبھر اور اپنی خود آواز بن　　　نغمہ بنتا ہے اگر، نغمۂ بے آواز بن

تو چھپاتا کیوں ہے اپنے حُسنِ عریانی کا راز
بوئے گُل کی طرح پھیلا دے پریشانی کا راز

اک جدائی کے سبب ہنگامہ برپا ہو گیا — مل گیا دریا سے جب قطرہ تو دریا ہو گیا
تشنگی کو بحرِ ناپیدا کنارِ دل بنا — پھر انہیں موجوں کو تو کشتی بنا ساحل بنا
ہر نفس میں تیرے پوشیدہ ہے میخانہ ترا — کل فضائے دہر اک چھوٹا سا پیمانہ ترا
زندگی کا رازِ پنہاں انتشارِ غم میں ہے — اک پیامِ مستقل ہر نغمۂ برہم میں ہے

غم سے وابستہ ہے ہر عنوانِ بابِ زندگی
ہے یہی بسم اللہ اُمّ الکتابِ زندگی

(ناتمام)

تخمیس بر غزلِ اُردو

غمِ عاشقی ہے، فغاں گو بگو ہے — ہر اک لحظہ منتظر نیا رُوبرُو ہے
کہیں سبزہ و گل، کہیں دشتِ ہُو ہے — تری آرزو ہے، تری جستجو ہے
خیال ایک جانب، نگہ چار سُو ہے

محبت ہی ناظم، محبت ہی ناثر — محبت دکھاتی ہے کیا کیا مناظر
محبت ہی باطن، محبت ہی ظاہر — محبت ہی اوّل، محبت ہی آخر
محبت ہی میں ہوں، محبت ہی تُو ہے

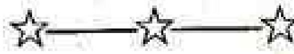
ترا وصل اچھا، ترا ہجر پیارا — جو منظور تجھ کو ہمیں سب گوارا
ترا شعلۂ عشق آنکھوں کا تارا — پھڑکتی ہوئی جان کا غم سہارا
دھڑکتے ہوئے دل کی تسکین تُو ہے

وہ عارض شگفتہ گلِ باغِ جنت — وہ پیشانی صافِ صبحِ سعادت
وہ چشمِ سیہ، سایۂ ابرِ رحمت — وہ رنگِ نزاکت، وہ حُسنِ لطافت
کلی کا تبسّم ہے، پھولوں کی بُو ہے

کہیں عشق ہی عشق ہے مست و رُسوا — کہیں حُسن ہی حُسن ہے بادہ پیما
غرض چھان ڈالی محبت کی دنیا — ان آنکھوں نے دیکھا یہی اک تماشا
کہیں میں ہی میں ہوں، کہیں تُو ہی تُو ہے

وہ کہتے ہیں سب، دل کے انداز کہیے — محبت کا انجام و آغاز کہیے
ہر اک راز بے پردۂ راز کہیے — کہاں تک غمِ عشقِ شیراز کہیے

کہ ہر آرزو مختصرِ آرزو ہے!



تخمیس بر غزل فارسی

گہے لختِ لختِ جگری فروشم — گہے حاصلِ چشمِ تر می فروشم
بہر گام لعل و گہر می فروشم — نہ تنہا دل و جان و سر می فروشم
دو عالم بہ تیغ نظر می فروشم

ازل سے ہوں خو کردۂ یاس و حرماں — مری طبعِ خود دار ہے ناپشیماں
مبادا کہ ہو مشکلِ شوق آساں — من آں دردِ مندم کہ در درد دو درماں
دعا می فروشم، اثر می فروشم

جُدا ہے زمانے سے میرے طبیعت — گوارا نہیں ایک دم، ایک حالت
وہی میں، وہی تو، وہی چشمِ رحمت — چہ ایذا پسندم کو در عینِ قربت
بشام جدائی سحر می فروشم

سنے تھے بہت میں نے بھی ہی فسانے — نگاہوں میں پھرتے تھے اگلے زمانے
دکھایا مجھے بھی ہی عشق و فنا نے — بہر لحظہ می گیرم ازغیب جانے
بہر لمحہ جانِ دگر می فروشم

ترے ہاتھ سے ہوں شہادت کا خواہاں — نہ رکھ میری گردن پہ غیروں کا احساں
یہ جاں تیرے صدقے، یہ دل تیرے قرباں — بہ تیغِ اشارت سر افراز گرداں
بگردِ سرائے تو سر می فروشم

بلندی ہی باقی رہی اب نہ پستی — فدا تجھ پہ میں اور مری مے پرستی
یہی ہے بس اب حاصلِ حُسنِ ہستی — خوشا ذوق و مستی کہ ہم ذوق و مستی
سرت گردم و بے خبر می فروشم

غزل می سرایم چہ حال و چہ قال است — خیالِ است مستی و مستی خیال است
بجانِ محبت! کہ خونم حلال است — جگر، ایں چہ شور و جگر ایں چہ حال است
کہ سر دادم و باز سر می فروشم



مثنوی عرفانِ خودی

(المعروف بہ "سرورِ حقیقت")

میرا نہیں غیر کوئی محرم — سب مجھ میں ہے کائناتِ عالم
غنچوں میں نہاں ہیں میرے اسرار — پھولوں میں عیاں ہیں میرے انوار
ذرّوں میں چمک ہے میرے دم سے — قطروں میں جھلک ہے میرے دم سے
ہر بام ہے کوہِ طور میرا — عالم پہ محیط نور میرا
ہے جسم میں سب کے جان مجھ سے — وابستہ ہے کُل جہان مجھ سے
میں جسم بھی اور جان بھی ہُوں — میں دل میں ہوں اور زبان بھی ہُوں
یعنی یہ جہاں نہیں ہے میں ہُوں — یہ کون و مکاں نہیں ہے، میں ہُوں
کعبے کی مرے سبب سے بنیاد — بُت خانہ مرے قدم سے آباد
ناقوس کہیں، کہیں اذاں ہُوں — نغمہ ہوں کہیں، کہیں فغاں ہُوں
ہر قلب میں ہے مقام میرا — فیضان ہے سب پہ عام میرا
حُسن اِک نگاہِ ناز میری — عشق اک صفتِ نیاز میری
دریا میری چشمِ تر سے پیدا — صحرا مری خاکِ در سے پیدا
کیا ان کا بیاں کریں زبانیں — محدود نہیں ہیں یہ میری شانیں
ہوش و خرد و ہوس سے باہر — میں اُن کی دسترس سے باہر
اک بحر ہے میرے ظرف میں گم — کُن میرے ہر ایک حرف میں گم
خود موت ہوں، خود حیات ہوں میں — خود ذات ہوں، خود صفات ہوں میں
سب اصل و مجاز میرے انداز — کونین کا راز میرے انداز
کُھلنے پہ جو آئیں میرے اسرار — اوراق ہوں دو جہاں کے بیکار
اک بات میں سینکڑوں ترنم — اک چپ میں ہزار ہا تکلّم!

چہرے سے جو میں نقاب اُٹھا دوں　　پروانوں کو شمع سے چھڑا دوں
دامن کو اگر نچوڑ دُوں میں　　دریا کا غرور توڑ دُوں میں
احساس کی آنکھ سے ہوں مستور　　ادراک کی سرحدوں سے ہوں دُور
کیوں کر ہوں مرے شمار عالم　　ہر سانس میں ہیں ہزار عالم
لیکن بخدا، خدا نہیں ہُوں!　　اس کفر میں مبتلا نہیں ہوں!
یہ شانِ عبودیت ہے میری　　خود ذات میری صفت ہے میری
پابندِ شریعتِ نبیؐ ہوں　　خاکِ درِ دولتِ غنیؔ[1] ہوں



واسوخت درغزل

دل ہی کو صنم بنائیں گے ہم　　آئی گے کہیں نہ جائیں گے ہم
تجھ سے بھی سوا حسین بن کر　　اپنا سا تجھے بنائیں گے ہم
وہ دن بھی قریب ہیں کہ ظالم!　　تو روئے گا مسکرائیں گے ہم
باطن میں ترے قریب رہ کر　　ظاہر میں نظر نہ آئیں گے ہم
زندہ ہی رہے گی مستی عشق!　　مرنے پہ بھی مر نہ جائیں گے ہم
چھٹتا ہے کہیں ترا تصور　　ساتھ آئے ہیں ساتھ جائیں گے ہم



کوئی جو نہیں، نہ ہو ہمارا　　اللہ سے لو لگائیں گے ہم
تعمیر کنشتِ دل کو ڈھا کر　　اک کعبۂ نو بنائیں گے ہم
رو پوش تری نظر سے ہو کر　　پہروں تجھے یاد آئیں گے ہم
باطن میں ہو جو بھی دل کی حالت　　ظاہر میں بہت ستائیں گے ہم
ہر بات میں کرکے بات پیدا　　جب چاہیں گے، روٹھ جائیں گے ہم
پہلے دے کر فریب وعدہ　　اُمیدِ کرم دلائیں گے ہم
پھر کرکے خرابِ شوق برسوں　　صورت نہ تجھے دکھائیں گے ہم
جنگل جنگل رُلانے والے!　　کونے کونے رُلائیں گے ہم
دیوانہ کی بڑ سمجھ نہ اس کو　　جو کہتے ہیں کر دکھائیں گے ہم

---

[1] مرشدی وملجائی حضرت مولانا قاضی سیّد عبدالغنی منگلوریؒ (جگرؔ)

بیزار جگرؔ کی شرم رکھ لے
کہہ دے، ترے ناز اُٹھائیں گے ہم



میرے لئے

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لئے — ہائے! وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے
ہر نفس میں ایک دُنیائے محبت نو بہ نو — ہر نظر میں اک پیامِ تازہ تر میرے لئے
حیف! وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف — ہائے! وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے
وہ رُخِ رنگیں پہ انوارِ محبت زرد زرد — وہ لبِ نازک پہ طوفانِ دگر میرے لئے
سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حُسنِ حزیں! — چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے
سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم — خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میرے لئے
جوشِ غم، جوشِ حیا، آغازِ عشق، احساسِ حسن — کشمکش ہی کشمکش آٹھوں پہر میرے لئے
سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تر — سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے
وہ سرک جانا یکایک روئے تاباں سے نقاب — حیرت افزا رونق دیوار و در میرے لئے
ہر ادائے جاں نوازی، حسن خیز و عشق خیز — پھر بھی ہر اک سعیٔ پیہم بے اثر میرے لئے
اُف! وہ آغوشِ تہی، بیتاب آغوش دگر — اُف! وہ دردِ شوق محتاجِ اثر میرے لئے
ہائے وہ رنگین رُخ وسیمیں تن و زریں کمر — ہائے! وہ لعلیں لب و سلکِ گہر میرے لئے
شبنم آلودہ وہ آنکھیں، وہ گلاب افشاں جبیں — وہ دھڑکتا دل، وہ گھبرائی نظر میرے لئے
اس نگاہِ ناز میں وہ ہلکی ہلکی جنبشیں! — معنیٔ بے لفظ و شرحِ مختصر میرے لئے
میں سراپا بے نیازِ ربط و ضبطِ حُسن و عشق — وہ مجسّم حسن و عشقِ معتبر میرے لئے
وہ مری آزاد فطرت وہ مری تمکین و ہوش — وہ شکستِ حُسن، وہ نیچی نظر میرے لئے
اوّل اوّل آہ، وہ دل میں میرے احساسِ عشق — آخر آخر اُف، وہ نوکِ نیشتر میرے لئے
لحظہ لحظہ وہ میرا پیہم سکوتِ مضطرب — لمحہ لمحہ عالمِ نوعِ دگر میرے لئے

اُف وہ کہنا اُس کا پھر باہوں میں باہیں ڈال کر
میں جگرؔ کے واسطے ہوں اور جگرؔ میرے لئے



رُباعی

صد شکر کہ پہلو میں میرے دل نہ رہا — وہ کشتۂ صد فریب منزل نہ رہا
یہ کیا کم ہے کہ تیرا بندہ ہے جگر — اس کا کیا غم کہ تیرے قابل نہ رہا



بادۂ شیراز

غزلیات

اے کہ می پرسی ز کارِ ما و جہد کارِ ما — چاک شد از دست ماہر پردۂ اسرارِ ما
مادیک نظارۂ نقش و نگارِ حسنِ خویش — شاہدِ طنازِ فطرت آئینہ بردارِ ما
صد حقیقت عرض میکرد، اے سکوتِ بیخودی! — پردہ دارِ حرف مطلب شد لبِ گفتارِ ما

صد بہارِ خلد، یعنی خندۂ دز دیدہ است
شورِ محشر چیست؟ غوغائے پسِ دیوارِ ما



بیا، بجانِ ما ببیں سرورِ جاودانِ ما — ہزار بادہ می چکد زجانِ ما بہ جانِ ما
شراب و ساغر و سبو گل و بہار آب جو — دو صد جہانِ رنگ و بو، نمود یک جہانِ ما
گلے و جامِ سرخوشی، خوشی و صد شگفتگی — شگفتگی وصد خوشی زسر خوشی شانِ ما
نسیم شُکرِ غم کند، وظیفہ دم بدم کند — سرِ نیاز خم کند بہ خاک آستانِ ما
بیا، بنوش جامِ مے، چہ جامِ مے، تمامِ مے — کہ ما و اذنِ عامِ مے، خوش است ارمغانِ ما
کنوں بسوئے ماگر، بہ رنگ و بوئے ماگر — بہ حسنِ روئے ماگر، چہ حاجتِ بیانِ ما

بہ ہر زمیں کہ جستہ ایم، طلسمِ تازہ بستہ ایم
غرور ہا شکستہ ایم گواہِ ما بیانِ ما



آوارہ ہر نگاہ زجرمِ نگاہِ کیست؟ — دیدن گناہِ ماست، نہ دیدن گناہِ کیست؟
دیوانہ وار جاں بفشاندن گناہِ من — بیگانہ وار رُخ نہ نمودن گناہِ کیست؟

پیدا زہر نگاہ خریدم ہزار حُسن — پنہاں بیک نگاہ ندیدم نگاہِ کیست
مُطرب! بزن سرود بہ اندازِ دلبری — ایں دشنہ باز خواں کہ "نگا ہم نگاہِ کیست؟"
سر مستیم رُود بے دل ز سینہ ہا — عکس نگاہ و پرتوِ زلفِ سیاہِ کیست؟
عالم ہمہ نگاہ و صدائے زہر نگاہ — ایں عالمِ نگاہ فریب نگاہِ کیست؟
شغلِ گناہ کردن و رفتن، گناہِ من — ذوقِ گناہ دادن و دیدن گناہِ کیست؟
ساقی! بریز بادہ و ازکیفِ سرمدی — آں ہم یکے ناگہ کو گویم نگاہِ کیست؟
ہستی تمام مستی، و مستی تمام کفر — دائم بہ جام و میکدہ کافر نگاہِ کیست؟
مست اند اہلِ درد و نہ بینند یک نفس — درد امنِ نسیم سحر خاکِ راہِ کیست؟

صد نقش سجدہ تا درِ بُت خانہ دیدہ ام
ایں ہم جگر اشارہَ طرفِ کلاہِ کیست؟



بوئے دل ازغبار می آید — شاید آں شہ سوار میں آید
ایں ندائے زدار می آید — "جاں فدا کن کہ یار می آید"
عشق در ہر دیار نالہ کند — حسن از ہر دیار می آید
سینہ خالی کنید از دل ہا — یار بہرِ شکار می آید
مژدہ اے دل! کہ بہرِ استقبال — رحمتش بے قرار می آید
ہم نشیں رازِ عشق می پرسد — نالہ بے اختیار می آید

من بہ پنہاں جگر تلاش کنم
اور مگر آشکار میں آید



مست و سرشار و زمیں بوس صبا میں آید — مژدہ، اے دل! کہ مسیحا بہ قفا می آید
برو، اے ناصح ناداں! مکن اُو را بدنام — کز جفا ہاش مرا بوئے وفا میں آید
خواہ در صومعہ رو، خواہ بہ میخانہ نشیں! — اور بہ ہر رنگ کہ خواہی بخُدا! می آید
دِلم از سوزِ تغافل ہمہ تن شعلہ بجاں ست — در کنم شکوہ، ازاں نیر حیا می آید

دین ایں نیست کہ جاں تازہ چرا کرد نسیم
دیدن ایں است کہ آخر ز کُجا می آید



لب بہ بستند و بہر موئے زبانم دادند ۔۔۔ پا شکستند و بہر سوئے نشانم دادند
تاب از دل بربودند و فغانم دادند ۔۔۔ تیر از دست ببردند، کمانم دادند
دلِ سرگشتہ و چشمِ نگرانم دادند
آنچہ دادند، پئے شورشِ جانم دادند



گویند کہ ہم زاہد در دیدہ بصر دارد ۔۔۔ دارد بصرے، امّا تعیینِ نظر دارد
از ذات و صفاتِ او، آں کس کہ خبر دارد ۔۔۔ ہر لحظہ و ہر ساعت دُنیائے دگر دارد
بے کیفیِ دردِ عشق، صد کیف و اثر دارد ۔۔۔ زیں سرِّ نہاں، لیکن ہر کس نہ خبر دارد
زیں اصل و نزاکت ہا زاہد چہ خبر دارد؟ ۔۔۔ کو حُسنِ نظر دارد، جنّت بہ سقر دارد
آں کس کہ بجویش آمد، در بے خبری گم شد ۔۔۔ واں کس کہ زخود گم شد، از جملہ خبر دارد
لرزیدن و رقصیدن، اے صوفیِ بے معنیٰ! ۔۔۔ ایں جملہ کہ تو داری، ہر شعبدہ گر دارد
در عینِ وصالِ او، یابم اثرِ دوری ۔۔۔ اے پیر رہِ عشقم! ایں پردہ کہ بردارد؟
از حُسنِ عمل غافل، یک لحظہ مباش اے دل! ۔۔۔ ہر شے کہ تو می بینی، واللہ کہ نظر دارد
مفتی بحقِ منصور، بنوشت عجب فتویٰ ۔۔۔ کافیست پئے قتلش ایں جرم کہ سر دارد
در عینِ فنائے عشق از خضر چہ کار، اے دل؟ ۔۔۔ ایں رہ کہ بہ پیماید از سایہ حذر دارد
آں مے کہ بہ میخانہ، آتش زند اندر دل ۔۔۔ در خانقہِ زاہد تاثیرِ دگر دارد
من عاشقِ آں شوخم کو از سرِ محبوبی ۔۔۔ مانوس دلے دارد، بیگانہ نظر دارد
باجملہ قدح خوراں ہر چند کہ ربطے ہست ۔۔۔ با دُرد کشاں ساقی پیمانِ دگر دارد
در عاشقی و مستی، ہشیار بیا، اے دل! ۔۔۔ ہر ذرہ دریں صحرا طوفانِ شرر دارد
آں رندِ خراباتت، نامش کہ جگر خوانی
بر روئے صفائے تو "ہم از تو نظر دارد"



کسے کہ چشمِ بیدارے ندارد ۔۔۔ ز انوارِ خودی کارے ندارد
جنونِ عشق، اے دل مُستند نیست ۔۔۔ اگر ہر آبلہ خارے ندارد
جنونِ عشق مارا قید کر دست ۔۔۔ دراں زنداں کہ دیوارے ندارد



دل بہ تمنا بمرد، جاں بہ مسیحا رسید ذرّہ بہ صحرا برفت، قطرہ بہ دریا رسید
ایں غمِ دُنیا و دیں تا بہ کجا روز و شب خیز، کہ بادِ بہار، بادے و مینا رسید



خبر بیچ زمنزل گہ جاناں نہ رسید عمر آخر شدو افسانہ بپایاں نہ رسید



ازشبا بش شراب می ریزد ز آفتاب، آفتاب می ریزد
عجب ہنگامہ زیرِ بام کردند تماشا خاص و سودا عام کروند
تنگ ظرفی خمارے کرد پیدا ے دو شینہ را بد نام کروند



در رہِ عشق شادماں بگور! ہم جواں خیز و ہم جواں بگور !!
پردہ بردار از رُخِ عالم و ندراں بزم ناگہاں بگور!!
گاہ نعرہ کناں و مست بروا گاہ با نالہ وفغاں بگور!!
سینہ بشگاف و جلوہ حاصل کن! جاں بکف آر واز جہاں بگور!!
گر تو داری ہوائے ملکِ حبیب خیزو از قیدِ جسم و جاں بگور!!
پابجولاں بہ پیش یار بروا دست افشاں زایں و آں بگور!!
رہِ منزل شدست خارستاں! باز با چشم گل فشاں بگور!!
درد اگر نیست، نالہ سنج مشو! گر مکیں نیست، ازمکاں بگور!!
لطفِ نظارۂ جمالِ حبیب حاصلِ این ست و ہم ازاں بگور!!
ہم چوں نقشِ قدم جگر منشیں
صورتِ گردِ کارواں بگور!!



کعبہ درپائے یار دیدم دوش ایں چہ گفتی جگر خموش، خموش
حسن پنہاں و جلوہ ہاست بجوش اصل خاموش و فرعہا بخروش
سحر آمد ایں نداز سروش سینہ بخراش و بیہدہ مخروش
ہوش در مستی است و دلِ مد ہوش نغمہ در ساز و سازِ ما خاموش
از رہِ خانقہ گزشتم دوش! خاست ناگہ صدائے نوشانوس
دل پریشاں حواس و حُسنِ نیاز شیشہ نازک تراست و بادہ بجوش

اے اسیر تعینات جہاں! تو چہ دانی کہ چیست مستی و ہوش!
بادہ پیش آر! تا کنم آغاز داستاں ہائے عشق آفت کوش
حُسن در جنگِ زرگری ست بہ عشق عشق راگو کہ واکند آغوش
عشق در بے لباسیم فرمود ''بجز ایں دیگرے لباس مپوش''
بے خبر رو کہ ہوش در مستی است ہوشیار آ کہ بیخودی ست بہ ہوش
ایں بود، جسم ماشود، بے حس آں مبادا کہ جاں شود خاموش
گفتہ بودم فسانہ از مستی! تو شنیدی چہ از عالم ہوش
قاضیا![1] ایک نظر بسوئے جگر آں کہ یک خادم است و حلقہ بگوش



شب مہ است ولب جوئے وفتنہ ہا خاموش
بگیر! جام بگیر و بنوش! بادہ بنوش



آں کیست نہاں درغم؟ ایں کیست نہاں در دل
دل رقص کناں درغم، غم رقص کناں در دل
جاں از دل و دل ازجاں بیگانہ و مستغنی
گاہے بچنیں در جاں، گاہے بہ چناں در دل
سیری زغم عشقش از وصل نہ شد ہرگز
صد شوق ہماں درجاں، صد ذوق ہماں در دل
ہر آنچہ، نہاں ست، ایں، سا زند عیاں برخلق
ہر آنچہ عیاں ست، آں کروند نہاں در دل



دل عطا کن! تادرونش درد ہا پیدا کنم دیدہ دہ، تابرونش دل رُبا پیدا کنم
از جلالِ غیرتت صد طورہا برہم زنم وزجمالِ رحمتت صد جلوہ ہا پیدا کنم
گہ زخونِ خلق جود برپا کنم، شورِ انا گہ زچاکِ سینۂ خود برقِ لا پیدا کنم
گہ زبارنگیٔ صورت در جہاں آتش زنم گہ زبے رنگیٔ نسبت رنگ ہا پیدا کنم

---

[1] مراد از ذاتِ اقدس مولائی ومرشدی حضرت مولانا الحاج قاضی سید عبدالغنی شاہ صاحب منگلوری نوراللہ مرقدہٗ ۱۲ (جگرؔ)

بیخودی دردہ! کہ مستانہ شوم بر تو فدا
وز خودی بگزار مارا، تا خدا پیدا کنم
در زبانِ بے زبانی ماجرائے گفتن است
حکم فرما، تا صدائے بے صدا پیدا کنم
یک نگاہِ کار فرما از جہانِ دلبری
کز فنائے خویشتن ملکِ بقا پیدا کنم
الفراق، اے دل! کہ بہرِ دردمی باید مکاں
الوداع، اے جاں! کہ بہرِ یار جا پیدا کنم
یک دمے بگزار مارا از نصیحت ہا جگر!
تاز آہِ مضطرب دستِ دُعا پیدا کنم!



اے دیدہ اگر خواہی! آبے زستمگر ہم
آہستہ بریز آبے تالب نہ شود تر ہم
داریم بہ دل چیزے، نازک زگلِ تر ہم
اے موجِ نسیمِ صبح! زیں طرزِ سبک تر ہم
او عین لطافت ہست شاید نہ شود بر ہم
اے عاشقِ نظارہ! دیدار سبک تر ہم
آں مے کہ بسے خوردم، زیں پیشِ ہمی بوید
اے واعظِ خوش نیت! برخیز زکوثر ہم
ایں موجِ نسیمِ صبح دل را کہ بہ جنبا نید
می داشت مگر نسبت، زاں زلفِ معنبر ہم
دل داشت بسے غم ہا، دیدیم مگر آخر
تاراجئ افسر ہم، بربادئ لشکر ہم
درسایۂ زلف او چوں رفت، زخود گم شد
آں آہ کہ باز آمد، زیں گنبدِ بے در ہم
تنہا نہ منِ بے دل در ہجرِ تو رنجورم!
صد خوں بہ فلک دیدم از دیدۂ اختر ہم
زاہد بہ نماز و حج، یک جلوہ زدورش یافت
من عکسِ رُخش دیدم، نزدیک بساغر ہم
اے اہلِ وفا! بینند ایں طرفہ جفائے او
کاتش بزند دردل، وزِ آب کند تر ہم
خاموش فغانے کن! ہر موئے زبانے کن!!
زیں طرح جگر مخروش! تادانہ کند در ہم

مست[1] و سرشار و غزل خواں می روم
از سرِ جاں، سوئے جاناں میں روم
جام دردست و صراحی در بغل
باچہ ساز وباچہ ساماں می روم!
عشق دشوار ست شوقم رہنما
راہ پُر خار است و آساں می روم
یوسفِ گم گشتہ ام در مصرِ عشق
باز سوئے پیرِ کنعاں می روم
در بلائے عشق خود راہ کردہ گم
در ہوائے شوق رقصاں می روم
دل بسویش بستہ، فارغ از جہاں
رُخ بسویش کردہ، حیراں می روم

---

[1] نذرِ عقیدت بحضور مرشدی ومولائی الحاج قاضی سید عبدالغنی شاہ صاحب منگلوری نوراللہ مرقدہٗ

معنیٔ عشقست ترکِ ہر طلب　　من بہ غم ہائے فراواں می روم
مستیٔ عشق است و یادِ روئے دوست　　ہم بکفر وہم بہ ایماں می روم
جاں ہمہ غم ساختہ، رقصم بہ عشق　　دل ہمہ خوں کردہ خنداں می روم
خاک منگلور[1] است چوں دامن کشاں
از در الم دست افشاں می روم



صدمۂ انتظار راچہ کنم　　چہ کنم، جان زار راچہ کنم؟
گردم از روزگار قطعِ نظر　　گردشِ روز گار راچہ کنم؟
او بکاراست وہم جہاں درکار　　دلِ ناکردہ کار راچہ کنم؟
توبہ کردم زمے پرستی، لیک　　ابروبادِ بہار راچہ کنم؟
ترکِ یاری و یار آسان ست　　مشکل اینست، یار راچہ کنم؟
بُوئے آں پیرہن بیار نسیم!　　بُوئے باغ و بہار راچہ کنم؟
یار در باغ و من بہ صحرا مست　　دلِ وحشت شعار راچہ کنم؟
روئے رنگینِ یار من بنما!　　ساغرِ زرنگار راچہ کنم؟
او بخواب است و فتنہ ہا بیدار　　حسرتِ بے قرار راچہ کنم؟
ضبط چیزے ست ناصحا! لیکن　　دردِ ہمت شکار راچہ کنم؟
آں گل و آں بہار مارا بس　　ایں گل و ایں بہار راچہ کنم؟
ہجر دشوار و وصل آساں تر　　لیک، آئینِ یار راچہ کنم؟
موجِ خوں از سرم گزشت جگر!
من لبِ جُوئے بار راچہ کنم؟



من کہ آزارِ کش غمزۂ خوں ریز تو ام　　معذرت خواہِ نگاہِ کرم آمیز تو ام
شادم از لذت دیدار و ز سرمستیٔ شوق　　بے خبر از اثرِ حسنِ دل آویز تو ام
نگہِ لُطف بفرما بہ منِ زار، کہ من　　نو گرفتارِ خمِ زلف بلا خیز تو ام



---

[1] منگلور ضلع سہارنپور آستانہ حضرت مرشدی ومولائی قدس سرہٗ (جگرؔ)

بنشیں بخیالِ او، و زدردیک آہے کن ۔۔۔ زاں بعد زسرتاپا بر خویش نگاہے کن
زلف از رُخ خود بردار، وز لطف نگاہے کن ۔۔۔ یعنی شبِ تارم را رشکِ شبِ ماہے کن



مطرب! بزن سرودے، ساقی! بیار بادہ ۔۔۔ تاجاں شود منور، تادل شود گشادہ
در شوقِ آرزویت، سرگرمِ جستجویت ۔۔۔ ہم عاشقانِ رنگیں، ہم زاہدانِ سادہ
حُسنے و خونِ عاشق، عشقے و خوئے تسلیم ۔۔۔ او تیغِ ناز در کف، من سر بہ پا نہادہ
دل ہا کہ تیرہ گشتند از زنگِ کفرِ غفلت ۔۔۔ روشن نمی تواں کرد امّا ز نورِ بادہ
چوں در بہشت رفتم، دیدم ہمیں تماشا ۔۔۔ زُہّادِ خشک خشک و حورانِ سادہ سادہ
در کوئے مے فروشاں دیدیم زاہداں را
سجّادہ رہن کردہ، تقویٰ بہ باد دادہ



اے کہ زروئے عاشقاں پردہ برخ کشیدہ ۔۔۔ جامۂ صبر و عقل و ہوش از ہمہ جا دیدہ
از دل من نہاں مشو، اے کہ تو جانِ عاشقی! ۔۔۔ از نظرم نہاں مشو، اے کہ تو نورِ دیدہ
بے خبرم زخویشتن ورنہ تو صد ہزار بار
گاہ زجاں گزشتہ، گاہ بہ دل رسیدہ



دیدیم[1] بہ میخانہ پیرے زجواں اولے ۔۔۔ مژگانش بہ از تیرو ابرو زکماں اولے
از عشرت بے عشقت صد آہ و فغاں اولیٰ ۔۔۔ ایں درد کہ تو دادی، واللہ کہ زجاں اولے
ازبارگاہ حسنش یک سمہ مپرس از من ۔۔۔ راز یست کہ می فہمدِ چشم نگراں اولے
ایں یک ستم ظاہر خوشتر زہزاراں لطف ۔۔۔ واں یک نظر پنہاں از ہر دو جہاں اولے
صد سود بہ من گفتی از ترک غمش، ناصح! ۔۔۔ ایں نکتہ نہ فہمیدی، در عشق زیاں اولے
از قربت واز دُوری ہر آنچہ کہ بہ پسندی ۔۔۔ حقّا کہ ہماں خوشتر، حقّا کہ ہماں اولے
ہر چند دریں وقتے تمکین تو ہم خوب است ۔۔۔ در مصلحتم لیکن، مستی ست ازاں اولے
ایں نظم جگر گفتی، گل گفتی و دُر سفتی
ہم رنگِ زباں بہتر، ہم حُسنِ بیاں اولے



[1] نذرِ عقیدت بحضور اقدس مولائی و مرشدی قدس اللہ سرہٗ ۱۲۔

مست است جگر از مے، مستِ مئے ناب او لے
اُو خانہ خرابے ہست، او خانہ خراب او لے
من طالب آزارم، آرام نمی خواہم
بر جانِ منِ خستہ، صد گونہ عذاب او لے
از خرقہ و عمامہ من ہیچ نمی دانم!
گہ گہ مگر ایں ساماں در رہنِ شراب او لے
در آرزوئے بحرے می پویم و می جویم
زیں موجہ وزیں دریا ماراست سراب او لے
بسیار بدم گفتی، وزمن بشنو، واعظ!
از ہر دو جہانِ تو، یک جامِ شراب او لے
من عاشق شیدایم، از غیر ندارم کار
کز مہر فلک از تو صد چشمِ عتاب او لے
من ساغرِ مے در کف، مطرب تو بخواں بردف
صد توبہ وصد طاعت غرقِ مئے ناب او لے
تا کے جگر ایں مستی، بشنو سخنِ حافظ
''رندی و ہوسناکی، در عہدِ شباب او لے''



اے آنکہ بہم کردہ ہشیاری و سرمستی
یک جرعہ خدادادہ، زاں میکدۂ ہستی
غافل زدلم منشیں، اے جان از سرِ مستی
صد نغمہ برانگیز و سازے کہ تو بشکستی
صد حسن دراں پنہاں، صد جلوہ ازاں پیدا
قربانِ نگاہ تو، نازیم بایں مستی
ازا دل گام عشق کردیم نثارِ حسن
دُنیا و غمِ دُنیا، ہستی و غمِ ہستی
گہ تا فلک اندیشم، گر بے خبر از خویشم
گاہے بجہاں ہوشے، گاہے بجنیں ہستی
آں رند خرابات نامش کہ جگر خوانند
صد ہوش بجاں دارد با ایں ہمہ سرمستی



گراز سرے بیا بم، صد عمرِ جاودانی
برمن حرام بادا، اے دوست! زندگانی
ہیچ است زندگی واسباب زندگانی
بگزار تابسوزم ایں پردہ ہائے فانی
کارے ست شکل، اما اے دل! اگر تو دانی
دریاب زندگانی از اصل زندگانی
عمرے ست فانی، اما سرّے ست جاودانی
اے گوشہ گیرِ خلوت! ایں نکتہ ہا چہ دانی؟
یک جام تند ساقی! تا فاش فاش گویم
زاہد خبر نہ دارد ز اسرارِ زندگانی
ہم از برائے قلش دستِ قضاست پنہاں
پیری کہ درر ُودست تاج از سرِ جوانی
ایں نہ رواقِ اخضر در پائے او فگندہ
کو ہیچ شے ندارد، جز دردِ جاودانی
منِ ز ابتدائے عشقت کا ہیدہ ترزِ کاہم
طاقت کجا کہ چینم گل از رُخِ جوانی
عشقم چہ کار کرد و حُسنت چہ گل شگفتہ
ایں رازِ اوّلیں ست من دانم و تو دانی

ہر روز فیض گیرم از روحِ قدسِ حافظ
بر من جگرؔ گواہ است ایں جوش وایں معانی



ہر دم زنازِ تازہ باعاشقاں بہ بازی گاہے زدل گدازی، گاہے زجاں گدازی
اے آنکہ یک اشارت صد عقدہ ہا کشادہ رحمے بحالِ ماہم، شاہنشہِ حجازی
بر خیزواز سرِ صدق درراہِ او قدم زن
تاکے جگرؔ! بہ مستی، تاکے بہ عشق بازی؟



فارغ زخزانے دہم از باغ و بہارے مائیم و خیالِ رُخ خورشید نگارے
دیدم بہ درِ دیر عجب شعبدہ کارے میخانہ بدوشے و گلستاں بکنارے
بربادیٔ ماپرس ازاں سینہ فگارے در عینِ بہارے کہ جداشد ز بہارے
چیزے منگر برتنِ لاغر ز بہارے افسانۂ ما پرس زنوکِ سرِ خارے
نقسم بہ ہوائے من و روئیم طرفِ عقل دشمن بہ یمینے و نگاہم بہ یسارے
یک داغ ز آزارِ تپ عشق بہ سینہ ایں است خزانے وہمیں است بہارے
اشکم سرِ مژگاں ست کہ شبنم بہ سرِ شاخ شبنم سرِشاخ ست کہ منصور بہ دارے
صد بارگزشتیم زہر مرحلۂ عشق حیرت بہماں طرزِ ادا آئینہ دارے
بلبل ہمہ تن خوں شد وگل شد ہمہ تن چاک اے وائے بہارے، اگر این ست بہارے
اغیار بہ دل خندہ زن و دل تبو مشغول خلقے پسِ دیوانہ و دیوانہ بکارے
اے خسروِ خوباں! نظرے کن زسرِ مہر
اُفتادہ بہ کویت جگر سینہ فگارے



سحرم ندا برآمد ز حجاب ہائے رازے کہ ”حریم ماست بالا ز حقیقت و مجازے“
برساں صبا پیامم، بہ حبیبِ دلنوازے کہ ”زخد گزشت شوق دغم عشقِ جانگدازے“
بہ ہوائے عیش تاکے تو بہ خوابگاہ نازے؟ کہ زسوزِ دردمنداں ہمہ عالم ست سازے
تومرا بگو کہ جاناں چہ کنم بجانِ زارے کہ تمام مو بجسم زغم است نے نوازے
ہمہ شہر فتح گشت و بہماں نیاز و نازے دلِ غزنوی اسیرِ خمِ طرّۂ ایازے
بہ میان جاں و جاناں چہ قیامت ست رازے رُخ او نظارہ سوزے، دلِ من نظارہ سازے

ہمہ جلوہ عکسِ رویت، ہمہ نغمہ گفتگویت زہے باصرہ فروزے، زہے سامعہ نوازے!!
زتوائے کفر خیزم ہمہ کعبہ بُت نہفتہ راداۓ سجدہ ریزم ہمہ بتکدہ مجازے
توز خاکِ ماحذر کن کہ دریں مقام، واعظ! دلِ ناز شعلہ گیرد ز تجلّیِ نیازے
جگر حزیں! چہ نازی بمتاعِ جذبۂ دل
تو سپردِ کارِ خودکن بخُدائے کارسازے



من راست راست گویم، دارم گلِ جوانے گلچیں! اشارہ فرما، بلبل! بدہ نشانے
آں جامِ ہوش درکف، ایں پائے عقل درگل آن ست عشق جاناں این ست عشق جانے
اے جانِ بیقراراں! ناگہ ردر دردں آ کز سوز اشتیاقت کار آمدہ بجانے
ہمت اگر تو داری، در عشق کوش، اے دل!
ایں جانِ تازہ برگیر، ازبار گاہِ جانے



شب میکدہ چورفتم، دیدم عجب بہارے ساقی ست مست وبیخود، رنداست ہوشیارے
درشوقِ ماہ روئے، دریادِ گلعذارے ہر جا نظر فگندم، دیدم بہشت زارے
شوقے و دردِ وصلے، صبحے و ہجرِ یارے ساقی! بدہ پیالہ، تابشکنم خمارے
دیر و زبر درِ دیر دیدم عجب نگارے پیمانہ در نگاہے، میخانہ درکنارے
آنجا کہ نیست، ساقی! اندیشۂ خمارے زاں میکدہ عطا کن یک جام زر نگارے
ہشیار بگذر، اے دل! در راہِ عشق و مستی ہر مَوج مے دریں جا بحریست بے کنارے
رازے عجب شنیدم از عاشقے کہ مے گفت مائیم و ہجرِ وصلے، وصلے و ہجرِ یارے
در عاشقی و مستی، مگر یز از ملامت کایں خاکِ راہِ کویش تاچیست زر نگارے
ہر قطرہ کہ بینی در آبِ زندگانی ہم موج وہم سفینہ ست، ہم بحر وہم کنارے
آں را کہ شرح کردند، ایں ست گُل فسانہ
منصور بود شخصے، مشہور شد زدارے



تو اے کو نرگسِ مستانہ داری بیک ساغر عجب میخانہ دارے
منِ بے دل نہ تنہا عشق خیزم تو ہم افسانہ در افسانہ دارے



سراپا

دل بُرواز من دیروز شامے   فتنہ طرازے، محشر خرامے
روئے مبینش صبحِ تجلّے   لوحِ جبینش ماہِ تمامے
مشکین خط او سنبل بہ گلشن   لعلیں لبِ او بادہ بہ جامے
چشمے کہ کوثر یک جرعۂ او   قدے کہ طوباش ادنےٰ غلامے
عارض، چہ عارض، گیسو، چہ گیسو!   صبحے، چہ صبحے، شامے، چہ شامے!
آں تیغِ ابرو، واں تیرِ مژگاں   آمادہ ہر یک بر قتلِ عامے
برقِ نگاہش، صدجاں بہ دامن   زلفِ سیاہش، صد دل بہ دامے
ہر عشوۂ او شیریں مقالے   ہر غمزۂ او، رنگیں پیامے
از جسم لرزاں، لرزاں دو عالم   وز زلفِ برہم، برہم نظامے
گاہے بہ مستی، طاؤسِ رقصاں   گاہے بشوخی، آہو خرامے
از بارِ مینا لرزش بدستے   وزکیفِ صہبا لغزش بگامے

گفتم "چہ جوئی"؟ گفتہ "دل و جاں"
گفتم "چہ خواہی؟" گفتہ "غلامے"

(ناتمام)

خِطاب بہ مُسلم

چشم گشاو جانب رزم گہِ وطن نگر   مقتلِ کانپور بہ بیں، لاشۂ بے کفن نگر
خونِ حیات سُو بہ سُو، خاک سرشتہ مُو بہ مُو   حلقِ بریدہ کو بہ کو، بچّہ و مرد و زن نگر
عشق نظارہ سازرا برق بہ خانماں بہیں   حسنِ نظارہ سوزرا شعلہ بہ پیرہن نگر
برتنِ حُسنِ نازنیں آہ زفرق تاقدم   زخم شفق شفق بہیں، داغ چمن چمن نگر
دیدۂ عشوہ زا کجا؟ خفتہ بخوابِ مرگ بیں   شوخیِ رنگِ رخ کجا؟ سرخیِ پیرہن نگر
طفل و جوان و پیر را، صف بصف، بہم بہم   دست جدااز ساعد و فرق جدا زتن نگر
بچّہ شیر خوار رابیشِ نگاہِ مادرش   چاک ز سینہ تا کمر، کشتہ و بے کفن نگر
حاکمِ شہر را کہ بود، ثانیِ شمر بالیقیں   آہ، بجائے قید قتل سیر کنِ وطن نگر

باز بیا بہ آگرہ، دجلہ خوں نظارہ کن
باز برو بہ کاشمیر، کشتن و سوختن نگر
حیف بریں نتیجۂ نظم و نظام و ذہنیت
تیغِ جفائے ہم وطن برسرِ ہم وطن نگر
ہائے ازیں گزندگاں، وائے ازیں درندگاں!!
ہند و بہار ہندرا، بسمل و خستہ تن نگر
تازہ بہ تازہ خونِ خلق، موج بہ موج بوے خوں
نعرۂ حریت شنو، آں لب وایں دہن نگر
آں ہمہ ہا کہ بنگری، واں ہمہ ہا کہ بشنوی!
پردہ بسوز و صورت بانی صد فتن نگر

اے کہ تو حق نہادہ، مسلمِ پاک زادہ
درچہ بلا فتادہ؟ خیزو بخویشتن نگر

دشمنِ آدم آدمے، ہم سخنے نہ ہمدمے
چشم کشادہ یکدمے، فتنۂ اہرمن نگر
آں ہمہ لغزش و خطا، ایں ہمہ سازش و دغا
خلوت اہلِ دل ببیں، جلوتِ اہلِ فن نگر
بدعت وشرک وافتراق، فسق وفجور وہم نفاق
جملہ بحسنِ اتفاق، ہمدم وہم سخن نگر
گاہ بہ کسوتِ طبیب، روئے اجل نظارہ کن
گہ بہ لباسِ راہبر صورتِ راہزن نگر
نے خبر از حقیقتے، نے اثر از شریعتے
یک سخن ازیں پرس، یک نگہے بمن نگر
خدمتِ بے سبب کجا، طاعتِ خاصِ رب کجا؟
سادگیٔ عرب کجا، خیزو درانجمن نگر
آتشِ قہر آشکار، برقِ عنا و شعلہ بار
صورتِ شیخ راببیں، سیرتِ برہمن نگر
خیز و بیا، نظارہ کن، دل ہمہ پارہ پارہ کن
شوکت رفتہ راجُو، عبرتِ انجمن نگر
جسم زفاقہ زار زار، رُوح زدرد بیقرار
مادرِ ہند اشکبار، مفلسی وطن نگر

وجہ زمفلسی مپرس، سیم و زرِ وطن مجُو
رُخ بنما بہ لندن وسیم و زرِ وطن نگر



جرم و خطا روایتے، غدر و دغا حکایتے
جورِ فرنگیاں مپرس، دار ببیں، رسن نگر
گاہ بروئے معدلت شانِ نظر نظر ببیں
گہ بہ جبینِ خسروی، طرزِ تہمکن شکن نگر
گاہ بیا بہ شہر و دیہہ، شورشِ دار و گیر بیں
گاہ برو بہ سرحد و اذن "بزن بزن" نگر
جدّتِ افتراق بیں، ندرتِ انشقاق بیں
فطرتِ چست وچاق بیں، حکمت علم وفن نگر
شانِ عمارتے ببیں، طرزِ سیاستے ببیں
ایں ہمہ لعنتے ببیں، واں ہمہ بر وطن نگر
گاہ بہ لب شکایتے، گہ ز غلام زادگاں
دعویٔ آشتی شنو، نازشِ حسنِ ظن نگر

نغمۂ سرمدی کجا؟ جلوۂ احمدیؐ کجا؟
سایۂ ایزدی کجا؟ غصۂ اہرمن نگر



شکوۂ غیر تا کجا؟ قصۂ جور تا بکے؟ | آنچہ بہ خویشتن گزشت، آہ ز خویشتن نگر
مسلمِ ہند زادۂ، پند بگیرو گوش کن | آنچہ بخویشتن گزشت، آہ ز خویشتن نگر
ہمتِ دل بجوش آر، جاں ہمہ درخروش را | پیروی صحابہؓ کن، اُسوۂ پنجتنؑ نگر
فلسفہ سنجی علل، ایں ہمہ وحشت و خلل | زود بکوش در عمل، باز بہ خویشتن نگر
بادِ مراد می وزد، سبزہ و غنچہ می دمد | رشحۂ فیض می چکد، رحمتِ ذوالمنن نگر

ساغر جہد نوش کن، طاعتِ مے فروش کن
باز روش روش خرام! باز چمن چمن نگر!



غیر مطبوعہ کلام

داغِ جگر

(دورِ اوّل کا متروک و غیر مطبوعہ کلام)

جگر کا پہلا شعر

[1] کشتیِ حیات اپنی جا رہی تھی دھارے پر
سنگدل تماشائی ہنستے تھے کنارے پر



[2] تصور جب کسی دستِ نگاریں کا رہا دل میں
تو شمعِ طور ہو کر رنگ لائی کیا حنا دل میں

نہیں سوزِ نہانی سے جو میرے آبلہ دل میں
تو مثلِ قلقلِ مینا چھلکتا ہے یہ کیا دل میں

خیالِ سبزۂ روئیدہ پھر آنے لگا دل میں
اٹھا پھر چاک دامانی کا میری ولولہ دل میں

جو دم بھر آ کے ٹھہرو شوخیوں سے تم ذرا دل میں
کہیں زخمِ جگر ہنس ہنس کے کیا کیا مرحبا دل میں

وہ حسرت ہوں کہ حسرت کو ہے حسرت میری حسرت پر
وہ مضطر ہوں کہ گویا ہے گذر سیماب کا دل میں

میں وہ ہوں جس سے لیلائے شبِ فرقت بھی ڈرتی ہے
وہ تم ہو جس سے مجنوں مدتوں کانپا کیا دل میں

کہاں تاب استقامت کی غم و اندوہ و حرماں کو
کہ اب تو ناوکِ سرکردہ کی رہتی ہے جا دل میں

نہیں گر ایک پیمانہ پہ رنگِ دہر کا نقشہ
الٰہی، پھر ہجومِ دردِ فرقت تا کجا دل میں!

وہ ہوں دیوانہ بیکس کہ جب گلشن میں جا نکلا
تو اک شورِ قیامت ہو گیا برپا عنا دل میں

مدد، اے خنجرِ ابروئے قاتل! تا نکل جائے
کہ چبھتا ہے مثالِ خار حرفِ مدّعا دل میں

غضب ہے، وہ سبب ہو تلخ کامی محبت کا
رہے جو جان بن کر کافرِ شیریں ادا دل میں

خجالت ماہِ کامل کو ہوئی اور مہر کو سکتہ
وہ ہیں داغِ جنوں ہائے جذبِ الفت تو جابجا دل میں

وہ میں ہوں جس سے باقی نام ہے مہر و محبت کا
وہ تم ہو جس سے شرماتے رہے جور و جفا دل میں

---

[1] حسب روایت نواب سید شمس الحسن [2] جلوۂ یار (میرٹھ) مئی ۱۹۱۰ء

تہیِ دستانِ الفت کو ضرورت کیا ہے، اے منعم!
کہ ہیں دام و درم ہی سکّہ ہائے نقشِ پا دل میں

وہ بیکس ہوں کہ میری بیکسی پہ بسکہ اے قاتل!
کیا کرتی ہے حسرت خندۂ دنداں نما دل میں

نہ کیوں کر پھر ہو ضبطِ بیقراری امرِ لاینحل
کہ کوئی لے رہا ہے چٹکیاں بیٹھا ہوا دل میں

وہ کہتے ہیں کہ اس نے جان دے دی سنکھیا کھا کر
خدا جانے جگرؔ کم بخت کے کیا آ گیا دل میں



[1] مقابل کاش میرے دیدۂ تر ہو گئے ہوتے
تمہاری بزم میں آئینے پتھر ہو گئے ہوتے

دیا صدقہ وفا کا بڑھ کے پروانوں کی حسرت نے
مرے داغِ محبت شمع کے سر ہو گئے ہوتے

ازل ہی سے تمہیں نفرت تھی اُلفت سے، تو لازم تھا
مرے دل کے نہیں، میرے مقدر ہو گئے ہوتے

بہت اچھا ہوا، بسمل کیا دل کو جو قاتل نے
کہ اب تک خود مرے نالے ہی نشتر ہو گئے ہوتے

خدا! ہو بیکسی کا، سامنے آ ہی گیا، ورنہ
تجھے ہم دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گئے ہوتے

یہاں بھی حسرتیں، بیتاب ہیں دل سے نکلنے کو
اُدھر بھی ایک دن، اے بندہ پرور! ہو گئے ہوتے

حکایت، اے جگرؔ! کیوں کرتے پھرتے ہو زمانے کی
ار بت تھا تو قسمت کے سکندر ہو گئے ہوتے



[2] یہاں نزع ہے، اُن کے لب پر ہنسی ہے
کہاں، میرے یا ربّ[3]! مری بے کسی ہے

بڑی دیر اُٹھنے میں محبّت رہی ہے
ترے درد میں بھی تری نازکی ہے

تمنا ہے دل کی کہ ہو جائے قرباں
ترے ایک تیرِ نظر کی کمی ہے

جواں ہوتے ہی حشر برپا کرے گا
قیامت کسی شوخ کی کم سِنی ہے

جو ارماں ہیں دل میں، وہ ہے ایک نشتر
جو حسرت ہے، پہلو میں، وہ اک چھری ہے

سلامت رہے دردِ دل تا قیامت!
کہ فرقت میں بھی عالمِ بے خودی ہے

اُچھوتی ہے، زاہد! ذرا دُور رہنا
کہ یہ مے نہیں، میکدہ کی پری ہے

گلوں کو کیا کس نے سرشارِ جلوہ؟
کہ چہروں پہ یہ نزہت و تازگی ہے

ملے ہیں کسی پائے نازک کے بوسے
بڑے کام کی میری خود رفتگی ہے

جسے چاہے منظور کر لو، مری جاں!
یہ حسرت ہے، یہ دل ہے، یہ بیکسی ہے

جگرؔ دل کو کب تک بتوں سے بچاتا
فرشتہ تو آخر نہیں، آدمی ہے



---

[1] نقاد فروری ۱۹۱۴ء [2] نقاد (مارچ ۱۹۱۴ء) [3] کذا۔

متفرقات

نزع ہے، اب ہم نہیں اوسان میں! آؤ، کچھ کہہ دیں تمہارے کان میں



چشمِ امید میں ہے جان ابھی تھوڑی سی ابھی دھندلا سا اُجالا نظر آتا ہے مجھے
غیر کی تکریم، اُف! دل تھامنے کی بات ہے سامنے کا ذکر ہے، یہ سامنے کی بات ہے



پیٹا کرو گے کیا یونہی قسمت کا پیٹنا للّٰہ سر اُٹھاؤ، جگرؔ! چاند رات ہے
مستی جمال چھا رہی ہے ہر آنکھ جھکی سی جا رہی ہے



ابھی سے چوڑیاں ٹھنڈی نہ کیجئے خدا جانے، جگرؔ کا حال کیا ہو



دل ہی پہلو میں، نہ قابو میں طبیعت میری دیکھتے دیکھتے کیا ہو گئی حالت میری
.... ڈال دی چشمِ خریدار پہ حسرت میری



مجھے افتادگانِ خاک سے اتنی محبت ہے قدم بھی سایۂ دیوار پر رکھنا قیامت ہے
دلِ محزوں مددخواہِ جنون و خارِ وحشت ہے جگر منت کشِ بُت خانہ ہائے سوزِ فرقت ہے



آسماں پر کیوں نہ ہو آخر دماغِ آبلہ آبلہ ایک ایک ہے چشم و چراغِ آبلہ



سپہرِ دیں کے جو ہیں آفتاب آتے ہیں! اُٹھو اُٹھو کہ رسالت مآبؐ آتے ہیں
نہیں یہ داغِ غمِ مصطفےٰؐ عدم والو! بغل میں داب کے ہم آفتاب آتے ہیں



شعلۂ طور

غزلیات

(ادوار چہارم سوم اور دوم کا متروک و غیر مطبوعہ کلام)

نجد کے ذرّے ذرّے سے آج تک آتی ہے صدا
جو ہے شہیدِ تیغِ عشق، موت اُسے حرام ہے



رات جو میں نے کی تھی آہ، اُس کا ہے کچھ وبال سا
کہتے ہیں آج صبح سے، جی ہے مرا نڈھال سا



آ گئی کون سی حسرت دلِ سوزاں کے قریب
کچھ دھواں سا ابھی اٹھا تھا گریباں کی قریب



واللہ! کرم تیرا جب تک کہ نہ شامل تھا
منزل پہ پہنچ کر بھی بیگانۂ منزل تھا
محدود نگاہیں تھیں، دیکھا نہ گیا، ورنہ
اک جلوۂ بے رنگی ہر رنگ میں شامل تھا
دونوں کی کشاکش میں مطلق نہ ملی فرحت
دل تشنۂ دریا تھا، میں تشنۂ ساحل تھا
جس میں کہ ترے جلوے خود دوڑتے پھرتے تھے
اُس خون کا ہر قطرہ کونین کا حاصل تھا



اشک خونین ہے کہیں، نالۂ رنگیں ہے کہیں
ہر قفس میں اُتر آتا ہے گلستاں کوئی



صبح اس رنگ سے تھی رقص کناں شمع کی خاک
جیسے زندہ کوئی تصویر ہو پروانوں کی!
عشق کے ظلم کی کچھ حد بھی ہے آخر، اے قیس!
خاک تک حُسن سے چھوائی بیابانوں کی!



حشر میں حشر کا عالم ہے، خدا خیر کرے!
چشمک خُلد و جہنّم ہے، خدا خیر کرے!



متزلزل نظر آئے مجھے کُل ارض و سما — صبح کو خاک جب اُڑنے لگی پروانوں کی
آہ! وہ شمع کی لرزش، وہ ہوائے دمِ صبح — گزری کیا جانئے، کیا جان پہ پروانوں کی
عشق کہتے ہیں جسے، حُسن کا اک پرتو ہے — شمع کہتے ہیں جسے جان ہے پروانوں کی
تذکرہ اُن کا بیاں کیجئے کس طرح جگر — کوئی گنتی بھی ہے احسان کے احسانوں کی؟



اب دل لگا کے روتے ہیں وہ حضرتِ جگر — رونا یہ ایک دن کا نہیں، عمر بھر کا ہے



پھر چھیڑ کے زخموں کو تم داغ بنا دیتے — پھر جمع نئے سر سے سامانِ فغاں ہوتا



رُوح اس قالبِ خاکی میں جو محصور نہ ہو — اُس جگہ جو کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ ہو
ایک کی بھی نہ چلی جذبۂ دل کے آگے — چاہتے سب تھے کہ رُسوائیِ منصور نہ ہو



بے خبر رو کہ ہوش در مستی ست — ہوشیار! آ کہ بیخودی ست بہ ہوش
اصغر! یک نظر بہ سُوئے جگر — آں کہ یک خادم است و حلقہ بگوش



مبارک عشق کو اب بے نیازِ جسم و جاں ہونا — نظر نے دیکھ ہی پایا مرا مجھ سے نہاں ہونا
یکا یک پھر دیا ذوقِ طلب نے درسِ بے تابی — کمالِ عشق تھا محو سرورِ جاوداں ہونا



دیکھوں اِدھر منہ موڑنا، گھگو ہے یا کچھ چھوڑنا — ہاں دُم نہ اس کی چھوڑنا، اُڑ جائے گا، پردار ہے



تجھ کو اے جذبِ طلب! حُسنِ ازل ہی کی قسم[1] — دیر کتنی دل پہ اک تصویر اُترانے میں ہے
اُٹھ گیا کافر جگر سا کیا کوئی پھر حق پرست — حشر ہے کعبہ میں برپا، شورِ بُت خانے میں



خونِ دل[2]، خونِ تمنا، خونِ شوق — آپ نے جو کچھ کیا، اچھا کیا



---

1. جامعہ ستمبر ۱۹۲۹ء 2. جامعہ جنوری ۱۹۳۲ء

[1] بے دلی نے دکھا دیا آخر
شامِ فُرقت سیاہ ہوتی ہے



[2] اُٹھ گیا کیا جگر درد بہ دل، شعلہ بہ جاں
در و دیوار سے ماتم کی صدا آتی ہے



[3] پیدا کمالِ جذب تو کیا، ہوش میں تو آ
وہ خود جوابِ شوق ہیں دل کی صدا کے بعد
منظور چارہ ساز کی دل سوزیاں، مگر
اپنی بھی موت ہے غمِ صاحب فزا کے بعد
کافر تو میں نہیں ہوں، جو پی لوں نہ ساقیا!
وہ بھی تری طرف سے، تری التجا کے بعد
کوئی نہ ہجر ہجر، نہ کوئی ستم ستم
لیکن بس اک نگاہِ کرم آشنا کے بعد
کب تک ستم بھی، شانِ تغافل بھی، لُطف بھی
ہر لحظہ التجا ہے یہاں التجا کے بعد



جلووں کا اژدحام ہے، محبوب پاس ہے
اُف (رے؟) نگاہِ شوق کہ پھر بھی اُداس ہے
آئندہ کیا خبر کہ رہے کیا معاملہ
اب تک تو، اے نگاہِ کرم! تیری آس ہے
....
اُس پھول سے بدن پہ جو نیلا لباس ہے



شکایتِ دلِ ایذا طلب کو کیا سمجھے
تمام لطف تو شُکرِ جفا نے لوٹ لیا
تجھے خبر بھی ہے کچھ، اُس کے دل پہ کیا گذری
وہ ہر ادا کہ جسے ہر ادا نے لوٹ لیا



نگاہ ڈال کے میری تمام ہستی پر!
مجھے تمام محبت بنا دیا تو نے



غم نے بنا دیا ہے ماتم گسار سب کا
اب کس کو پوچھتے ہو، کوئی یہاں نہیں ہے



دل تیری محبت کی قسم! تجھ سے بھی بڑھ کر
مغرور ہے، ہر چند کہ مغرور نہیں ہے



عشق سے بے نیازیاں، کیا خوب!
عشق سارا جہاں ہے، پیارے



---

[1] جامعہ اکتوبر ۱۹۳۲ء [2] جامعہ جولائی ۱۹۳۳ء
[3] مرزا عاشق علی بیگ خیال کا ایک خط مرقومہ ۱۹۳۳ء

اے عشق! یہی ہے جو تنک بخشیِ ساقی   کیا حسن بھی سیرابِ تمنا نہ رہے گا



ایک[1] ایک ذرّے سے حاصل درسِ عرفاں کیجئے   یعنی خود کھو جایئے، اُن کو نمایاں کیجئے
ہم نے تو دکھلا دیا خود بن کے محروم وصال   آپ سے ممکن جو ہو، ناکام ہجراں کیجئے



کوئے[2] جاناں کی ہوا تک سے بھی تھرّاتا ہوں میں   کیا کروں، بے اختیارانہ چلا جاتا ہوں میں
تو فنا آمادہ ہے، تجھ کو نظر آتی ہے موت   زندگی، تابندگی، پابندگی پاتا ہوں میں
مَیں نہیں رہتا ہوں میں، جب پاس آتا ہے وہ شوخ   دل نہیں رہتا ہے دل، جب سامنے جاتا ہوں میں
یا کسی کے قہر پر بھی مُسکرا دیتا تھا دل   یا نگاہِ لُطف سے بھی، آہ! شرماتا ہوں میں
تیرے اک آنکھوں کے ساغر، تیری اک رُخ کی بہار   یہ میسّر ہوں تو ہر جنّت کو ٹھکراتا ہوں میں



سن سن کے طعنِ بے اثری ہر نفس کے ساتھ   کھائیں فریب لذّتِ دردِ نہاں سے کیا



ہر ذرّہ عالم پر حاوی ہیں صفات اس کے   سب کہنے کی باتیں ہیں، مختاری و مجبوری



اوّل[3] اوّل میری نظروں سے بھی جن کو ہے گریز   آخر آخر مری صورت سے نمایاں ہوں گے



کافر[5] عشق ابھی خوگرِ الحاد نہیں   یعنی یہ ہوش ہے اب تک کہ خُدا یاد نہیں
شورشِ شوق کہ ہنگامۂ فریاد نہیں   دل میں وہ کون سی دُنیا ہے جو آباد نہیں
مجھ سے، اے دوست! مری بزمِ شوق نہ پوچھ   بھول جانے کے سوا اب مجھے کچھ یاد نہیں
ہاں غمِ یار، ترے دم سے ہے تعمیرِ حیات   تو سلامت ہے تو ہستی مری برباد نہیں
آ، مرے زود فراموش! دکھا دُوں تجھ کو   نقش ہیں دل پہ وہ باتیں جو تجھے یاد نہیں
مختصر ہے مری ہستی کی حقیقت یہ، جگر!   مجھ میں آباد ہیں سب، مَیں کہیں آباد نہیں



---

[1] جامعہ اگست ۱۹۳۵ء   [2] معارف فروری ۱۹۳۷ء   [3] جامعہ فروری ۱۹۳۷ء
[4] القلم اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۲ء   [5] القلم جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء

دلِ[1] مبتلائے نالہ و آہ و فغاں ہُوا — اے شانِ عشق! حُسن ترا رائگاں ہوا

☆——☆——☆

نقش[2] بن کر اُسے رہنا ہے، سُنو یا نہ سُنو — دل کی آواز ہے یہ، درد کی آواز نہیں!

☆——☆——☆

نگاہوں[3] میں منزل مری پھر رہی ہے — یونہی گرتا پڑتا چلا جا رہا ہُوں!

☆——☆——☆

دنیا بجائے خود ہے اک جنّتِ میسّر — افسوس! اہلِ دُنیا دوزخ بنا رہے ہیں

☆——☆——☆

مانگ[4] نظارۂ بے جلوہ کی توفیق، جگرؔ! — یہ طلب وہ ہے کوئی جس کا طلبگار نہ ہو

☆——☆——☆

ہجوِ[5] مے اور پھر جنابِ جگرؔ — پی پلا کر برائیاں، توبہ!

☆——☆——☆

تو[6] چاہے تو اے جلوۂ اعجازِ محبت! — تصویر کو تصویر کا دیوانہ بنا دے

☆——☆——☆

عشق[7] کا رازِ جنوں عشق کی حد ہی میں رہے — دل گیا ہے تو گریبان نہ جانے پائے

☆——☆——☆

شورشِ[8] بے خودی شوق نہ پُوچھ! — کس طرف کی ہوا ہے، کیا کہیے!

☆——☆——☆

کہنے[9] سننے میں جو نہیں آتی! — وہ بھی اک داستان ہے پیارے!

☆——☆——☆

آسماں[10] کو نہ دیکھیے تن کر — پھر یہ بوڑھا جواں نہ ہو جائے
آہ! اک تیر ہی سہی، لیکن — آشنائے کماں نہ ہو جائے
خاک سیرابیٔ بہار، اگر — آنکھ شبنم فشاں نہ ہو جائے
حُسن کا آئینہ تو دل ہے، مگر — یہی خود درمیاں نہ ہو جائے

---

۱ شعلۂ طور حیدرآباد ایڈیشن ۲ تحریک اکتوبر ۱۹۶۲ء ۳ شعلۂ طور (حیدرآباد ایڈیشن)

۴، ۵ شعلۂ طور (حیدرآباد) ۶ تحریک اکتوبر ۱۹۶۲ء ۷، ۸، ۹، ۱۰ شعلۂ طور

تا کُجا انتظارِ خُلد، جگرؔ ! حور اک دن یہاں نہ ہو جائے



ہاں[1] مزے لُوٹ لے جوانی کے پھر نہ آئے گی، جو یہ رات گئی



عشق[2] مُضطر ہے مرے دل میں سما جانے کو قیس نے دیکھ لیا نجد کے ویرانے کو
کششِ حُسن مقامات بدلتی ہی رہی ایک عالم میں نہ رکھا کبھی ویرانے کو
ہر حقیقت ہے رہِ عشق میں دامن کشِ دل اب میں کعبہ کی طرف جاؤں کہ ویرانے کو
حضرتِ عشق مجھے لے گئے کثرت کی طرف کعبہ کی راہ سے پہنچائیں صنم خانے کو



بے خودی نے مری صدہا کیے منظر پیدا وہ سمجھ بیٹھے تھے زندانیٔ حیرت مجھ کو
اُٹھ گئے وہ تو یہ اب سوچ رہا ہوں دل میں بند کرنے نہ تھے لب ہائے شکایت مجھ کو
وہ حریصِ غمِ کونین ہوں، اے حُسنِ ازل! کہ گوارا نہیں تقسیمِ محبت مجھ کو
عین بیچارگی و خستگی و دل ریشی میں ہوں تو مجبور، مگر کیا نہیں قدرت مجھ کو
لکھنؤ میں کوئی ہستی ہے تو ناطق کی جگرؔ ورنہ معلوم ہے سب اصل حقیقت مجھ کو



ابھی پھر سرمدی نغموں سے بھر دوں بزمِ امکاں کو ذرا چھیڑے تو مضرابِ جنوں تارِ رگِ جاں کو
جدھر نظریں اُٹھا کر دیکھنا اک وار کر جانا نہ سمجھیں وہ مسلماں کو، نہ دیکھیں وہ مسلماں کو



آپ کو دُنیا سے کیا مطلب، جگرؔ ! آپ ہوں بادہ ہو، اور پیمانہ ہو



کچھ اضطراب، کچھ امید، کچھ سکوں، کچھ یاس عجیب لذّتِ غم دورِ اوّلیں میں رہی
حجابِ قدس کو بھی بڑھ کے پھونک دیتا تھا یہ اک کمی نفسِ شعلہ آفریں میں رہی



ہوا بھری تھی جو سر میں اُس آستانے کی الگ رہا میں معیّت میں ہر زمانے کی
وجودِ دانہ ہے کیا شے، شجر کا اک اجمال شجر ہے کیا، وہی تفصیل ایک دانے کی

---

[1] تحریک اکتوبر ۱۹۶۲ء [2] العلم جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء

تغیّراتِ نظر کے یہ جلوے ہیں، ورنہ
ازل سے ایک ہی رفتار ہے زمانے کی

تغیّراتِ دلِ اہلِ درد کے ہمراہ
بدلتی رہتی ہیں خاصیتیں زمانے کی

سمندِ نفس ہے وہ بدلگام اسپ، جسے
قدم قدم پہ ضرورت ہے تازیانے کی

گدازِ عشق کو دل میں چھپا کے رکھ، غافل!
خبر نہ بو الہوسوں کو ہو اس خزانے کی

غبارِ نفس سے چمکے گا جوہرِ ذاتی
کریں گی پاک خود آلائشیں زمانے کی

اسیرِ دام ہُوا عین موسمِ گل میں
قفس میں لے کے میں وسعت اُس آشیانے کی

موافقت کا یہ عالم کہ اصل سب کی ایک
تضاد یہ کہ جُدا شان ہر فسانے کی

کوئی ہے شاہدِ مقصود بھی پسِ پردہ
یہ بے سبب نہیں نیرنگیاں زمانے کی

تصوّرات کی آئینہ بندیاں ہیں جگر
یہی ہے جلوہ گری اِس نگار خانے کی



ہم خاک کے پُتلوں نے جو کچھ تجھے سمجھا ہے
تُو اس سے بھی برتر ہے، تُو اس سے بھی اعلیٰ ہے



اے موجِ نفس! لے چل اُس بزمِ تجلّی میں
ہر ذرّہ جہاں کا ہو اک برقِ سرِ طوری

ہشیاری و غفلت می بس فرق ہے اتنا ہی
یہ رشتۂ قُربت ہے، وہ سلسلۂ دُوری

یہ کیا ابھی ظاہر ہو، یہ کیا ابھی پوشیدہ
قُربت ہو تو پھر قُربت، دُوری ہو تو پھر دُوری



کبھی جو یار کو مستِ شراب دیکھیں گے
ہر ایک جلوہ میں سو آفتاب دیکھیں گے

بتائیں کیا تمہیں روزِ حساب دیکھیں گے
جو خواب ہے وہی تعبیرِ خواب دیکھیں گے

بغور جب یہ جہانِ خراب دیکھیں گے
قدم قدم پہ طلسمِ حجاب دیکھیں گے

جو دل کا کر کے کبھی احتساب دیکھیں گے
تو اپنی زیست کو ہم اک عذاب دیکھیں گے

اُلٹ کے آپ جب اپنی نقاب دیکھیں گے
یقین ہے کہ تجھے بے حجاب دیکھیں گے

وہ ہو گا اپنا ہی اک انعکاسِ حُسنِ طلب
یہ سب غلط کہ تجھے بے حجاب دیکھیں گے

نہیں ہے جن کی نگاہوں کی انتہا کوئی!
وہی ترا کرمِ بے حساب دیکھیں گے

کسی طرح نہ جُدا کر سکیں گے اہلِ نظر
بہم کچھ ایسا عذاب و ثواب دیکھیں گے

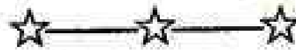
وہ قہر ہو کہ عنایت، فراق ہو کہ وصال
عذابِ دوست ہمیشہ عذاب دیکھیں گے



دل کے احساسات کی یوں شرح پیہم کیجئے
ہر نفس سے آج پیدا ایک عالم کیجئے
ساری کیفیاتِ باطن کو مجسّم کیجئے
پُوری ہستی کو پھر اُن کے سامنے خم کیجئے
ٹوٹ جائیں حلقہ ہائے دامِ نیرنگِ نمود
جست ایسی تا فرازِ عرشِ اعظم کیجئے



حاصلِ کون و مکاں بس دلِ دیوانہ ہے
عاشقوں کی یہی بستی، یہی ویرانہ ہے
اپنا اک سب سے جُدا، عشق میں میخانہ ہے
رُوح ساقی ہے، دلِ صاف جو پیمانہ ہے
کچھ عجب چیز ہمارا دلِ دیوانہ ہے
شمعیں آسودہ جبیں ہیں، یہ وہ پروانہ ہے
اے برہمن! نظر آیا نہ کوئی فرق ہمیں
جیسا کعبہ تھا، اُسی طرح کا بُت خانہ ہے
دیکھ، کس شان سے ہوتے ہیں نثارِ رُخِ شمع
ادب آموزِ فنا جذبۂ پروانہ ہے
جھک گئے، دیکھ لیا اُس کو جدھر جلوہ فروز
مست کیا جانیں، وہ کعبہ ہے کہ بُت خانہ ہے
ربط ہی کوئی سمجھ میں نہیں آتا مطلق
کیا مری طرح پریشاں مرا افسانہ ہے
پاؤں خود مرکزِ اصلی سے نہیں ہٹ سکتے
کتنی بے کار مری کوششِ مردانہ ہے!
نیستی سے بھی گذر جائے تو پہنچے اُس تک
حائل اک بیچ میں پُر ہول یہ ویرانہ ہے
کیوں جگر کی ہے شکایت لبِ احباب پہ، آہ!
جانتے کیا نہیں، بدمست ہے، دیوانہ ہے



اب اور نئے جلوے آنکھوں میں سمائیں کیا
دل نے جو بنائی تھی دُنیا، وہ بنا ڈالی
جب حُسن نے یہ دیکھا، بے تاب ہیں خود جلوے
اک برق سی چمکا کر حیرت کی بِنا ڈالی



جلوے تھے جس قدر چمنِ روزگار کے
تھے چند انعکاسِ دلِ بیقرار کے
اک رنگِ مستقل یہ کہاں دہر کعبہ میں
ہنگامے ہر جمود میں ہیں انتشار کے
آئے جو روزِ حشر نگاہوں کے سامنے
تھے سارے واقعات دلِ بیقرار کے
یہ مشربِ تصنّعِ علمی نہیں پسند
قائل ہیں ہم تو مسلکِ بے اختیار کے
مذہب میں عشق کی ہے تزلزل دلیلِ کفر
قائل ہیں اہلِ دل طلبِ استوار کے
عظمت میں رہنے پائیں نہ تادیر اہلِ دل
یہ راز ہیں حوادثِ بے اختیار کے
موقوف حیات ہی بے تابیاں نہیں
عالم ہزارہا ہیں مرے اضطرار کے
ایما جو پائیں، کر دیں زمانے کو منقلب
بیٹھے ہیں انتظار میں تائیدِ یار کے



اپنے ہی جلوے نظر آتے ہر اک تنویر سے
پردہ اُٹھ جاتا اگر اِس عالمِ تصویر سے

پرتوِ حُسنِ ازل کی اُف یہ نقش آرائیاں!
بن گئے کتنے مرقعے ایک ہی تصویر سے

آرزو سے اپنی شاید وہ ابھی واقف نہیں
لاکھ تصویریں کروں پیکر اسی تصویر سے

گر نہیں ہے عشق معنی، عشق صورت ہی سہی
ربط پیدا کر لے دیوانے کسی زنجیر سے

یہ نقوشِ دہر، یہ ہنگامہ ہائے کائنات
ساری تعمیریں ہیں وابستہ مری تعمیر سے

اُس کی ہستی بے تعلق مجھ سے ہو سکتی نہیں
صاحبِ تصویر کو نسبت ہے اس تصویر سے



رہتی ہے اُس کی یاد یوں وردِ زبانِ عاشقی
مسجودِ شانِ دلبری، معبودِ جانِ عاشقی

رکھتے ہیں سینوں میں نہاں ہم کشتگانِ عاشقی
وہ دل کہ جانِ آرزو، وہ غم کہ جانِ عاشقی

جو کچھ کہیں اہلِ نظر، زیبا ہے تجھ کو سربسر
تو جانِ ایمانِ وفا، ایمانِ جانِ عاشقی

کچھ بوالہوس بھی ہیں یہیں، ہشیار، او جانِ حزیں!
رُسوا نہ ہو جائے کہیں حُسنِ نہانِ عاشقی!

جس تک نہ پہنچی ہو نظر، عالم ہو جس سے بے خبر
پیدا دلِ ویراں میں کر وہ گلستانِ عاشقی



رُوح پر جو بھی گزرتی ہو تصوّر میں ترے
یہ تو ظاہر ہے کہ رگ رگ کو ہلا دیتا ہے

کیوں تڑپنا دلِ مضطر کا نہ ہو مجھ کو عزیز
کہ ترے دردِ محبت کا پتہ دیتا ہے



رنگِ رُخ و شگفتگیٔ دل لئے ہوئے
جاتا ہے کون رونقِ محفل لئے ہوئے

کل کائناتِ عشق کا حاصل لئے ہوئے
دل کی جگہ ہوں آرزوئے دل لئے ہوئے

مجھ کو دیا فریبِ نظر ہائے شوخ شوخ
نشتر تھے خود قریبِ رگِ دل لئے ہوئے

اُفتادگیٔ راہ بھی ہو رہ نمائے عشق!
ہاں چشمِ شوق جلوۂ منزل لئے ہوئے



کہاں تک اب ترے جلووں میں امتیاز کرے
وہ اک نظر جو حقیقت کو بھی مجاز کرے



کس قدر فیضِ نگاہِ مستِ ساقی عام ہے
قطرہ قطرہ موجِ صہبا، ذرّہ ذرّہ جام ہے

حُسن اور قیدِ تعیّن کا خیالِ خام ہے
بے خبر! یہ سب فریبِ جلوۂ اوہام ہے

دل ازل ہی سے ہلاکِ کوششِ ناکام ہے
اس کو کیا کیجئے کہ تیری آرزو بدنام ہے



جو ادائے مضطرب ہے، میکدہ بردوش ہے
زندگی مستی ہے خود، لیکن بہ قیدِ ہوش ہے



چہرہ چھپا کے پھر مجھے بیتاب کیجئے
جلوہ دکھا کے پھر مجھے حیران بنایئے
آنکھوں کو اور کیجئے محوِ جمالِ یار
ان مشغلوں کو اور فروزاں (؟) بنایئے
سینہ سے بھی ہو پنجۂ وحشت کی چھیڑ چھاڑ
اُس کو بھی اک طرح کا گریباں بنایئے



کہتے ہی رہے حضرتِ منصور انا الحق
حاصل ہوئی فُرقت نہ حجاب نظری سے
جی دیکھیے، آتا ہے نظر اور ہی عالم
حیران ہوں نیرنگِ جمالِ نظری سے
ہر غنچہ نے دی کُھل کے جو یوں دادِ مسرت
کیا راز سُنا موجِ نسیمِ سحری سے
مایوس پھرا بارگہِ خاص سے اُس کی
واقف جو نہ تھا مرحلۂ بے خبری سے



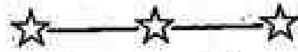
دل سے پیارے کو پیار کون کرے
مست کو ہوشیار کون کرے



مشقِ خطا و جوشِ تقاضا و شغلِ مے
کیا کیا نہ کیجئے ستم یار کے لئے



اصل میں ہو تو کوئی دیوانہ ندرت پسند
ہر قدم پر ہے نیا زنداں، نئی زنجیر بھی



مجھ سے مطلب بھی کچھ نہیں اُن کو
اور مری ہی دیکھ بھال بھی ہے



جس دل میں امنگیں تھیں، اُس میں غمِ ہجراں ہے
جب بھی ترا احساں تھا، اب بھی ترا احساں ہے



بے لوث جذبِ عشق کی تاثیر چاہیئے
لفظوں سے ماورا کوئی تقریر چاہیئے



مٹا کر اپنی ہستی، یار کی تصویر دیکھیں گے
ہم اس تخریب ہی میں صورت تعمیر دیکھیں گے
بغور اپنی حقیقت کی اگر تصویر دیکھیں گے
خیال آزاد پائیں گے، نظر زنجیر دیکھیں گے
ہوئے آزاد جب قیدِ تعلق سے ترے وحشی
بڑی مایوسیوں سے جانبِ زنجیر دیکھیں گے
اِدھر احساسِ رُوحانی، اُدھر ادراکِ جسمانی
کس آئینہ میں، کیا جانے، تری تصویر دیکھیں گے

جنہیں تاریکیاں بھی دیکھنا اب تک نہیں آئیں
وہ کس صورت سے تیرے حسن کی تنویر دیکھیں گے
کہاں ممکن جمالِ شاہدِ فطرت کا نظارہ
ان آنکھوں سے یہی بس عالمِ تصویر دیکھیں گے



ضیا بارِ حقیقت ہے یہ شمعِ زندگی میری
جہاں دیکھو گے، پاؤ گے وہیں پر روشنی میری
نہ ہستی جادۂ راہ اور نہ منزل نیستی میری
کہاں پہنچے گی گردِ کاروانِ زندگی میری



ذہن سے علم کتابی سب بھلانا چاہیئے
یہ بڑا پردہ ہے، اس کو بھی اٹھانا چاہیئے
جلوۂ بے رنگ بھی دل کو دکھانا چاہیئے
اور دیوانے کو دیوانہ بنانا چاہیئے
اس طرح اک نغمۂ دلکش سنانا چاہیئے
وجد میں ہر ذرّۂ فطرت کو لانا چاہیئے
نفس کہہ دیتا ہے اکثر، ختم منزل ہو گئی
مطلق اس دھوکے میں انساں کو نہ آنا چاہیئے
گوہرِ مقصود تو قسمت سے ملتا ہے، مگر
آدمی کو کارِ ہمّت کر دکھانا چاہیئے
عشق میں مدہوشی و مستی مناسب ہے، مگر
ہوش کی جب ہو ضرورت، ہوش آنا چاہیئے
سامنے گر وہ نہیں آتے، تو اے حسنِ نظر!
کوئی تصویرِ خیالی ہی بنانا چاہیئے
سجدے بھی ہو جائیں گے، پیدا تو کر ذوقِ نیاز
سر بھی جھک جائے گا، پہلے دل جھکانا چاہیئے



ایک سوزِ بے اماں ہے دونوں جانب مشترک
شمع میں پروانہ ہے اور شمع پروانے میں ہے
ہوش کیسا، جوش کیا، ہستی کہاں، مستی کجا
عشق کی معراج ہر صورت سے کھو جانے میں ہے
اُٹھ گیا کافر جگر سا کیا کوئی پھر حق پرست
حشر ہے کعبہ میں برپا، شور بت خانے میں ہے



دکھا دوں حسن بے تابی، مگر پھر خوف آتا ہے
مرا دل ہی نہ بن جائیں مرا دل دیکھنے والے
کسی اک نقطہ موہوم ہی کی شرح تو کر دیں
کتابِ عشق کے گہرے مسائل دیکھنے والے
حقیقت بیں نظر میں ہر تجلی اک حقیقت ہے
وہ خود باطل میں جو ہیں نقشِ باطل دیکھنے والے
کمالِ بے حسی شوق پر بھی اک نظر ڈالیں
مری ہر سانس میں اک محشرِ دل دیکھنے والے
تری صورت کا مظہر ہے ترا ہر پرتوِ رنگیں!
تجھ کو دیکھتے ہیں تیری محفل دیکھنے والے



یہ میرا طائرِ دل ہے، سمجھتا کیا ہے تو ظالم!
ترے آزاد کرنے سے کہیں آزاد ہوتا ہے
جنونِ رشک کا عالم یہاں تک عشق میں پہنچا
کبھی میں شاد ہوتا ہوں، تو دل ناشاد ہوتا ہے

نگاہِ دُور بیں وقُرب بیں کا فرق ہے، ورنہ — جسے نغمہ سمجھتے ہو، وہ خود فریاد ہوتا ہے
محبت میں گزرتا ہے جو عالم، کیا خبر مجھ کو — نہ جانے شاد ہوتا ہے کہ دل ناشاد ہوتا ہے
نگاہِ ناز کی معجز بیانی، واہ! کیا کہنا — سمجھ لیتا ہے از خود جس سے جو ارشاد ہوتا ہے



تا کُجا ہم درد مندوں پر تبسّم، تا کُجا — اک نظر اپنی طرف بھی، بندہ پرور! کیجئے!



دمِ اخیر دُعائیں نہ دوں انہیں کیوں کر — ستم کے بھیس میں کیا کیا کرم نواز رہے
دیارِ حُسن میں آئینِ حُسن ہی ہے جُدا — جو سر فروش رہے، وہ نہ سرفراز رہے

یادِ ایّام

ہی چشمِ کرم — حاصلِ صد میکدہ ایک ایک جامِ آرزو
اک تکمیلِ شوق — اللہ اللہ کس قدر تھا اہتمامِ آرزو



؟؟؟

نونہال بچّو! — اے قوم کے خوش خصال بچّو!
گلشنِ ہند! — اے تازہ بہارِ گلشنِ ہند!
ے نُور ہو تم — ماشاء اللہ! چشمِ بد دُور ہو تم
ے نُور ہو تم — اللہ تجھے اماں میں رکھے!
سفر ہے — پنجاب تمہاری پشت پر ہے



رہی ہے — وہ تیز قدم بڑھا رہی ہے!
رہی ہے — اب ہند نہیں ہے وہ فرشِ مخمل



؟؟؟

معنی صد زندگانی تیری
ایک ادنیٰ سے اشارہ میں ہ

اے قوم کے [2]
اے نقش و نگارِ
ماں باپ کی آنکھ
ماں باپ کی آنکھ
بنگال تمہارا ہم

ڈائر کی وہ فوج آ
ڈائر کی وہ فوج آ

؟؟؟

مُحبت تمہاری خُدا کے لئے تھی   عداوت تمہاری خُدا کے لئے تھی
عدالت تمہاری خدا کے لئے تھی   حکومت تمہاری خُدا کے لئے تھی
نہ تھا فقر سے اور نہ مطلب غنا سے   خُدا تم سے راضی تھا، تم تھے خُدا سے



سوئے سوراج قدم اپنا بڑھاتے جاؤ   جس طرف جاؤ اُدھر آگ لگاتے جاؤ
خون ابھی اور بہانا ہے زمینوں پہ تمہیں   گولیاں اور بھی کچھ کھانی ہیں سینوں پہ تمہیں



گاندھی

ع

اب ہوئے میکدۂ ہند کے ساقی گاندھی

سہرا (۱)

خوشی[1] سے نہ کیونکر ہو معمور سہرا   کہ ہے زینتِ رُوئے منصُور سہرا
یہ سہرا نہیں حسب دستور سہرا   یہ سہرا ہے نور علیٰ نُور سہرا
خبر ہے اسے کیا ہجوم نظر کی   جوانی کے نشہ میں ہے چُور سہرا
سرِ بزم لیتا ہے رُخ کی بلائیں   بہت شوخ و گستاخ و مغرور سہرا
مُرادوں کے پُھولوں سے رنگین محفل   محبت کی خوشیوں سے معمور سہرا



سہرا (۲)

جگر[2] رشید وظفر میاں کو رہے نہ کیوں ساز گار سہرا
لکھا ہے پڑھ کر دُرودِ پیہم، بنامِ پروردگار سہرا
سُنائے جا مطربِ محبت، اسی طرح بار بار سہرا
تمام حسن و شباب نوشہ، تمام باغ و بہار سہرا

۱۔ ۲۔ غالباً رشید الظفر کی شادی کے موقع پر لکھا گیا۔

نشاط اندر نشاط محفل، جمال اندر جمال منظر
قطار اندر قطار خوشبو، بہار اندر بہار سہرا

جو اب اُس حُسن کا کہاں ہے، عجیب عالم، عجب سماں ہے
تجلّیاں رُخ پہ ہیں تصدّق، تجلیوں پہ نثار سہرا

یہ دو دلوں کی محبّتوں کی کشاکشیں بھی ہیں کیا قیامت
اِدھر بھی ہے بیقرار سہرا، اُدھر بھی ہے بیقرار سہرا

بنا ہے نوشہ کے رُخ سے مل کر کچھ اس طرح شاندار سہرا
کہ جیسے خود باغبانِ فطرت کے ہاتھ کا شاہکار سہرا

ترے سراپا کا مَیں نے لکھا، عجب سراپا بہار سہرا
کہ تُو ہے دریائے حُسن و خوبی تو اُس کا ہے آبشار سہرا

اگر ہو منظور دل لگی کچھ، جنابِ نقی[1] سے کوئی کہہ دے
بلائیں لے لے کے چشم و عارض کی بن گیا میکسار سہرا

جو مادرِ مہرباں کی آنکھوں میں اس سے خنکی ہے صبح کی سی
تو ہے سعید الظفر میاں کے لئے بھی وجہِ قرار سہرا

الٰہی تا دورِ ماہ و انجم رہے مبارک بہ صد تبسم
یہ مستِ جامِ شرابِ اُلفت، یہ رندِ شب زندہ دار سہرا

جگرؔ سب احباب کی نگاہیں اگر نہ بروقت کام آئیں
تو کیا یہ شک ہے کہ بن نہ جائے لطافتِ رُخ پہ بار سہرا



شکستِ توبہ

[2]

وسعت بقدرِ جوشِ طلب پا کے پی گیا
ساقی کی لہر دیکھ کے، لہرا کے پی گیا

اُن مست انکھڑیوں کی قسم کھا کے پی گیا
جب لہر آ گئی کوئی، لہرا کے پی گیا

میں مست توبہ کرتے ہی پچھتا کے پی گیا
بانہوں میں بانہیں ڈال کے اِٹھلا کے پی گیا

میں اور ترکِ شاہد و ساغر، خدا گواہ
جب آگیا خیال ہی، جھلاّ کے پی گیا

---

[1] مکتوب جگرؔ بنام میکش اکبرآبادی (۱۹۲۵ء) [2] کذا

اے ساقیٔ ازل! تری رحمت کے میں نثار — توبہ کے ہر خیال کو ٹھکرا کے پی گیا
میری نگاہ و فکر پہ جب چھا گئی بہار — رنگینیوں میں ڈوب کے لہرا کے پی گیا
جب جب جہانِ ہوش سے فرصت ملی مجھے — اپنی حقیقتوں کی طرف آ کے پی گیا
افسانہ مختصر یہ مری میکشی کا ہے — تو نے پلا دی جب مجھے، لہرا کے پی گیا
میں اور شکستِ توبہ، بس اب اور کیا کہوں — کیا جانے کس خیال میں گھبرا کے پی گیا
جس جس مقام پر مجھے مشکل کچھ آ پڑی — افسانۂ حیات کو دُہرا کے پی گیا
ملتی ہے کس کو خاص ترے دستِ ناز سے — میرے نصیب تھے کہ تجھے پا کے پی گیا
جب جام و بادہ بھی میری نظروں سے چھپ گئے — میں عالمِ خیال میں تیورا کے پی گیا



بادۂ شیراز

روشن جہاں زجلوۂ برقِ یک آہ کیست — در حیرتم جگرؔ کہ نگا ہم نگاہ کیست



جلنے زجنس اور بہ تماید اگر بہ عشق! — ایں اشک و آہ از اثرِ اشک و آہ کیست



ہر اشکِ رواں رنگے از خونِ جگر وارد — شاید بہ منِ خستہ او نیز نظر دارد
اے آنکہ دلِ عالم زیرِ قدمت افتاں — آخر چہ کند آنکس کو سوختہ پر دارد



ہر نفس را کردہ محوِ حُسنِ دوست — ہم چو بوئے گل پریشاں می روم
باتن وہم باز جانِ در شورِ عشق — بانے وہم بانیستاں می روم
مظہرم دراصل خواہم گم شدن — محشرم در محشرستاں می روم



بہ حضورِ خرقہ پوشاں، خبرے وہم زرازے — کہ حقیقت است پنہاں پسِ پردۂ مجازے



بہ سرِ تو ساقی مست من، بہ سرورِ بے طلبی خوشم[1] — اگرم شراب نمی دہی، بہ خمارِ تشنہ لبی خوشم

---

[1] کلیاتِ جگرؔ (حیدرآباد ایڈیشن)

چہ خوش است ذوقِ بختنم! چہ بلاست لذتِ فرقتم! — کہ بہ یادِ زلفِ سیاہ تو، بہ ہجومِ تیرِ شب خوشم
چہ مقامِ عشق و چہ منزلے، کہ دریں زمانِ من بیدلے — نہ بہ شاہدے، نہ بہ مطربے، نہ بہ حاصلِ علمی خوشم
ز نگاہِ عشوہ طراز تو چہ گذشت بر دلِ من، کہ من — نہ بہ نالۂ سحری خوشم، نہ بہ آہِ نیم شبی خوشم
ز جفائے حُسنِ تمام تو نہ حکایتے، نہ شکایتے — چہ حکایتے، چہ شکایتے کہ بہ ترکِ بے ادبی خوشم!



ہمہ ہوشِ عشقم، ہمہ سوز جانم — حذر، اَے جواناں! کہ پیرِ جوانم
نہ اسمم، نہ جسمم، نہ اینم، نہ آنم — چہ رازِ عیانم! چہ سرِّ نہانم!
جہاں از من و من زجانِ محبت — بجانِ محبت! کہ جانِ جہانم!
خوشا نسبتِ عشقِ لافانیٔ تو — فنا گشتم و زندۂ جاودانم



آتشِ گل

عشق مٹتا اور مرتا ہی رہا — حُسن بنتا اور سنورتا ہی رہا
عشق کارِ عشق کرتا ہی رہا — گو بظاہر وہ نہ کرتا ہی رہا
وہ جلاتے ہی جلاتے رہ گئے — دل کو مرنا تھا سو مرتا ہی رہا



فتنۂ[1] روزگار میں امن ہے کیا، قرار کیا! — حاصلِ زیست غم سہی، غم کا بھی اعتبار کیا
فطرتِ شوق کی قسم، غیرتِ عشق کی قسم! — دولتِ دو جہاں سہی، دولتِ مستعار کیا
عشقِ خزاں مزاج سے لطف مزاج پوچھیے — جس کی نظر ہو خود بہار، اُس کے لئے بہار کیا
سوزِ تمام چاہیے، رنگِ تمام چاہیے — شمع تہِ مزار ہو، شمع سرِ مزار کیا



ہائے[2] اُس عاشقِ دیوانۂ گلشن کی بہار — کہ جب آئی ہو، بہ اندازِ خزاں آئی ہو



بارِ[3] عیادت اُٹھ نہ سکا، اُف رے نازکی — تکلیفِ چند گام وہ فرما کے رہ گئے
اب دل سے کیا نکلتے ہیں تیرِ نگاہِ ناز — جو دل میں آکے رہ گئے، بس آکے رہ گئے



---

[1] جامعہ نومبر ۱۹۳۹ء [2] جامعہ ۱۹۳۹ [3] جامعہ ۱۹۴۱ء

جس میں پہنائی و رفعت ہی نہیں　　اور کچھ ہے، وہ محبت ہی نہیں
اس زمانے میں دلائل کے سوا　　ہر حقیقت اب حقیقت ہی نہیں



کہتے ہیں، نہیں ہم کو تیری مہر و وفا یاد　　اب دیکھیے، کب تک اُنہیں رہتا ہے خُدا یاد
بندے کی نہیں تاب، کرے یاد خُدا کی!　　بندے کو اگر خود نہ کرے اُس کا خدا یاد



[1]
اُس حسن کا شکوہ کیا کیجیے، محدود ہو جس کی اک دُنیا　　اُس سعی طلب کو کیا کیجیے، جو سعی طلب ناکام نہیں



[2]
کیا تعجب کہ مری رُوح رواں تک پہنچے　　پہلے کوئی مرے نغموں کی زباں تک پہنچے
جب ہر اک شورشِ غم ضبطِ فغاں تک پہنچے　　پھر خُدا جانے، یہ ہنگامہ کہاں تک پہنچے
آنکھ تک دل سے نہ آئے، نہ زباں تک پہنچے　　بات جس کی ہے، اُسی آفتِ جاں تک پہنچے
تُو جہاں پر تھا بہت پہلے، وہیں آج بھی ہے　　دیکھ، رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے
جو زمانے کو بُرا کہتے ہیں، خود ہیں وہ بُرے　　کاش! یہ بات ترے گوشِ گراں تک پہنچے
بڑھ کے رندوں نے قدم حضرتِ واعظ کے لئے　　گرتے پڑتے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے
تو میرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر　　اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ، کہاں تک پہنچے
اُن کا جو فرض ہے، وہ اہلِ سیاست جانیں　　میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے
جلوے بیتاب تھے جو پردۂ فطرت میں جگر　　خود تڑپ کر مری چشمِ نگراں تک پہنچے



سُن کے نغمے بھی خاموش فغاں تک پہنچے　　اب ترے حوصلے، اے عشق! کہاں تک پہنچے
عشق کی چوٹ دکھانے میں کہیں آتی ہے　　کچھ اشارے تھے کہ جو لفظ و بیاں تک پہنچے



غالبؔ مرحوم

لاریب، کہ اس رمز سے واقف تھی تری ذات　　افسانہ ہمہ رنگ و حقیقت ہمہ بے رنگ
اے، وہ کہ تری ذاتِ گرامی بہ ہمہ رنگ　　قدرت کی جو ہم راز تو فطرت کی ہم آہنگ

---

[1]، [2] مکاتیبِ جگر

اے، وہ کہ تری فکر بہ ہر طرز و بہ ہر صنف — ہم شعلہ وہم شبنم و ہم شیشہ وہم سنگ
اے، وہ کہ ہر اک نغمہ ترا نغمۂ فطرت — اے، وہ کہ ہر اک نقش ترا روکش ارژنگ
اے، وہ کہ ترے معجزۂ جنبشِ لب سے — اک جنت شاداب ہر اک غنچۂ دلِ تنگ
ہر پھول ترے باغ کا فردوش بہ دامن — ہر خار ترے دشت کا انگشتِ شفق رنگ
اقلیم سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے — ہم نغمہ وہم شیشہ و ہم نکہت وہم رنگ
اک گوشۂ دامن میں ترے دجلہ و جیحوں — اک موجِ نفس میں تری رقصاں جمن و گنگ
تھے مُلکِ سخن میں ترے ہم عصر ہزاروں — تنہا تھی تری ذات مگر صاحب اورنگ
تو نظم میں بھی، نثر میں بھی مجتہد العصر — لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ
تو نے اُسے گنجائش کونین عطا کی!! — ہر چند بہت تھا کبھی دامانِ غزل تنگ
عرفیؔ و نظیریؔ و ظہوریؔ و فغانیؔ! — تیرا کوئی ہم سر، نہ ترا کوئی ہم آہنگ
لاریب، کہ اس رمز سے واقف تھی تری ذات — افسانہ ہمہ رنگ و حقیقت ہمہ بے رنگ
الحق، کہ تری وسعتِ تخیل کے آگے — صحرا کفِ خاکستر و گلشن قفسِ رنگ



[1] اب غمِ عشق نغمہ بار نہیں — اب کوئی شعر شاہکار نہیں



[2] اب کہاں حسنِ صداقت کہ بنے نقشِ دوام — اب تو لے دے کے بس اک حُسنِ بیاں ہوتا ہے



[3] مدت گذری، یاد ہے اب تک — تیری گلی کی ہیرا پھیری
دشمن سمجھے رحم کے قابل — کیا ہوئی، اے دل! غیرت تیری



قطعہ

آپ کے سب اُصول جمہوری — جیسے کاغذ کے پھول کچھ رنگیں
مختصر یہ کہ آپ خود کیا ہیں؟ — آپ کی ذہنیت ہے کتنی حسیں

---

[1] مکاتیب جگر [2] [3] مکتوبِ جگر بنام حبیب احمد صدیقی

آپ کہتے ہیں کچھ، عمل کچھ ہے　　اس کے شاہد ہیں آسمان و زمیں
میں بس اتنا ہی عرض کرتا ہوں　　آپ جمہوریت کے اہل نہیں



نغمہ و صہبا، شعر و ادب　　تیری نظر کے تشنہ سب
ختم ہوا انعامِ فراق!　　آ ہی گیا پیغامِ طلب
حسن و محبت، رُوح و جسد　　تنہا تنہا، ہائے غضب



عِلم ہی ٹھہرا عِلم کا باغی　　عقل ہی نکلی عقل کی دُشمن



آسماں مرکزِ تخیل و تصوّر کب تک　　آسماں جس سے خجل ہو، وہ زمیں پیدا کر
رُوحِ آدم نگراں کب سے ہے تیری جانب　　اُٹھ اور اِک جنّتِ جاوید یہیں پیدا کر



نگاہوں[1] میں منزل کوئی پھر رہی ہے　　یونہی گرتا پڑتا چلا جا رہا ہوں
مجھے کوئی دیکھے، مجھے کوئی سمجھے!　　یہ کیا سامنے ہوں، یہ کیا جا رہا ہوں
خود اپنی بھی پہنائیاں ختم کرکے　　خود اپنی نظر میں چھپا جا رہا ہوں



جیسی[2] کرنی ویسی بھرنی　　ظالم فطرت رحم نہ کھائے
آج ہے بے ڈھب دل کی دھڑکن　　جیسے کوئی پاس بلائے
کوئی ہنسے یا کوئی روئے　　فطرت اپنا جی بہلائے



چھپتا[3] ہے کہیں بانیِ بیداد کا عالم　　ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ فریاد کا عالم
دیکھ، اے نگہ شوق! یہیں تک نہ ٹھہرنا　　اک اور بھی ہے حُسنِ خدا داد کا عالم
اب[4] کیا کوئی سمجھے مری رُو داد کا عالم　　نغموں میں ہے ڈوبا ہوا فریاد کا عالم

---

1. تحریک اکتوبر ۱۹۶۲ء　2. العلم اپریل تا جون ۱۹۶۲ء　3. حیات جگر (قیسی الفاروقی)
4. جگر کی بیاض نمبر ۲ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)

اللہ رے، اک مطربِ بے نام کا اعجاز — ہر سانس ہے اک نغمۂ آزاد کا عالم
ہر نغمہ ہے جس کے لئے فریاد کا عالم! — اللہ رے، اس نغمۂ آزاد کا عالم!

☆——☆——☆

رفتہ رفتہ ہر نحوِ فکر و توجہ بن گئی!![1] — اپنی بربادی کو حسنِ رائیگاں سمجھا تھا میں

☆——☆——☆

یادش بخیر! پھر سے اُسی رہ گذر کی یاد — گذرے تھے ہم جہاں سے کبھی سر لئے ہوئے
پھر عشقِ سادہ لوح کو دعوائے ضبط ہے — ہر ہر نفس میں شورشِ محشر لئے ہوئے
تو خود ہی عین ذات ہے، خود جلوۂ صفات — پھرتا کہاں ہے شوق کا دفتر لئے ہوئے
جس کی شفا محال ہے، جس کی دوا حرام — اے چارہ گر! وہ زخم ہوں دل پر لئے ہوئے
یا رب! کہاں گیا وہ زمانہ کہ عشق میں — اک دل تھے ہم بھی دل کے برابر لئے ہوئے
جن کو خبر نہیں کہ ہے رنگِ زمانہ کیا — بیٹھے رہیں وہ شاہد و ساغر لئے ہوئے

☆——☆——☆

آج سے ترکِ ملاقات بھی تسلیم مجھے — توبہ توبہ کر ترے حُسن کی رُسوائی ہو

☆——☆——☆

نظر کو فرصتِ نظارگی نہیں، نہ سہی — یقیں تو ہے کہ وہ آئے تھے بے حجابانہ

☆——☆——☆

کوئی منزل ہو، کوئی مرحلہ ہو — عشق کی دسترس سے دُور نہیں

☆——☆——☆

تیرے جلوے تو بیکراں ہیں، مگر — کم نہیں عشق کا بھی ظرفِ نگاہ

☆——☆——☆

نظر جب سے کسی نے پھیر لی ہے — بہت برہم مزاجِ زندگی ہے

☆——☆——☆

رندی کے لئے ہے نہ عبادت کے لئے ہے — انسان محبت ہے، محبت کے لئے ہے

☆——☆——☆

کیا کرے گا وہ کسی اور کا شیدا ہو کر — جس نے اپنے کو نہ سمجھا کبھی اپنا ہو کر

☆——☆——☆

---

[1] فروغِ اُردو فروری و مارچ ۱۹۲۱ء

ناز تھا جس پر بُلبل و گل کا سوکھ چلی وہ شاخِ نشیمن



توبہ، زاہد، ہم اور توبۂ مے! مفلسی وجہِ پارسائی ہے[1]
بس اسی کی ہے زندگی، جس نے آپ اپنے پہ فتح پائی ہے
اُس نے اک رُوح پھونک دی ہے جگرؔ جب نظر سے نظر ملائی ہے



---

[1] مسودہ آتشِ گل (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)

آتشِ گُل کے بعد

غزلیات

[1]جب تک کہ غمِ انساں سے جگر انسان کا دل معمور نہیں
جنّت ہی سہی دُنیا، لیکن جنّت سے جہنّم دُور نہیں

جز ذوقِ طلب، جز شوقِ سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق! بتا اب کیا ہو گا، کہتے ہیں کہ منزل دُور نہیں

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ، مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نُور نہیں

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں، قاتل سے یہ کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی، وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

اربابِ ستم کی خدمت میں بس اتنی گذارش ہے میری
دُنیائے قیامت دُور تو ہے، دُنیا کی قیامت دُور نہیں



کم نہیں ظلمت میں کچھ اہلِ نظر کے لئے
کون رہے شب نشیں نُورِ سحر کے لئے

لاکھ چمن زارِ حُسن پیشِ نظر ہوں تو کیا
ہاتھ یہ بڑھتے نہیں ہر گلِ تر کے لئے

جس پہ بہت ناز ہے آہ تجھے، بوالہوس!
ننگ ہے وہ زندگی اہلِ نظر کے لئے

جوشِ طلب چاہیئے ہوشِ ادب چاہیئے
بند نہیں کوئی راہ پائے بشر کے لئے

رقص میں ہے زندگی ایک ترے واسطے
وجد میں ہے کائنات اہلِ نظر کے لئے

کم نہ ہوئیں ظلمتیں اُف رے شبستانِ غم!
بجھ گئے لاکھوں چراغ ایک سحر کے لئے



---

[1] حیاتِ جگر (قیسی الفاروقی)

محبت کا، بالآخر رقصِ بے تابانہ کام آیا
نگاہِ شہرگیں اٹھی، سلام آیا، پیام آیا
ادب، اے گردشِ دوراں! کہ پھر گردش میں جام آیا
سنبھل اے عہدِ تاریکی! کہ وقتِ انتقام آیا
نہ جانے آج کس دُھن میں زباں پر، کس کا نام آیا
فضا نے پھول برسائے، ستاروں کا سلام آیا
جہادِ زندگی میں جب کوئی نازک مقام آیا
جُنوں نے ہی قیادت کی، خلوصِ غم ہی کام آیا
نئی تخریب لازم ہے، نئی تعمیر کی خاطر
ہُوا کیا تو اگر کچھ گرتی دیواروں کو تھام آیا
سنبھل کر یوں تو ہم گذرے کسی کی راہ میں، لیکن
کچھ ایسے بھی مقام آئے کہ گر پڑنا ہی کام آیا
مجھے شکوہ نہیں ساقی سے اپنی تشنہ کامی کا
میری قسمت میں دل آیا، ترے حصّہ میں جام آیا
اُٹھا تعظیم کو ساقی، جُھکے شیشے، بڑھے ساغر
نہ جانے آخرِ شب کون رندِ تشنہ کام آیا
اندھیرے سے اُجالے پھوٹ نکلے، دل یہ کہتا ہے
مرا افسوں خرام آیا، مرا ماہِ تمام آیا
نکل آیا جگرؔ جب میکدہ میں شور یہ اُٹھا
وہ رندِ دل بہ یار و مے بہ جام و تشنہ کام آیا

☆——☆——☆

[1] سرِ محفل جب اُن خاموش نظروں کا پیام آیا
زبانِ بے زبانی پر پیامِ بے پیام آیا

☆——☆——☆

[2] مدت میں جو اُس شوخ کا دیدار ہوا ہے
تا دیر سمبھلنا مجھے دشوار ہُوا ہے
منصور ہر اک دور میں بیدار ہوا ہے
افسانہ کہیں ختم سرِ دار ہوا ہے؟
اب حُسن سے کچھ کام، نہ جلووں سے سروکار
اب عشق ہی خود عشق کا معیار ہوا ہے

---

1 جگرؔ کی بیاض نمبر ۱۱ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی) 2 حیاتِ جگرؔ (قیسی الفاروقی)

بے شاہد و ساقی بھی کبھی پی تو ہے، لیکن
جو گھونٹ بھی اُترا ہے، وہ تلوار ہوا ہے

کیا کیا نہ تپایا ہے اسے آتشِ غم نے
تب جا کے یہ دل شعلۂ بیدار ہوا ہے

کچھ دل کا تقاضا ہی نہ تھا عرضِ محبت
کچھ اُن کی نگاہوں کا بھی اصرار ہوا ہے

شبنم کی نظر میں نہیں تخصیص کسی کی
سیراب ہر اک پھول، ہر اک خار ہوا ہے

فیضانِ غمِ عشق سے حاصل ہے جو نسبت
ہر سانس حدیثِ لب و رخسار ہوا ہے

کیا کہیے جگر! کس گلِ رعنا کی بدولت
ہر شعر مرا شعلۂ رخسار ہوا ہے



بے نام و نشاں ایسا بھی اک وار ہوا ہے[1]
ہر عزم، ہر اک حوصلہ بیکار ہوا ہے

ڈھائی ہے اسی کو غمِ دوراں یہ قیامت
یہ دل جو ابھی فتنۂ بیدار ہوا ہے

کچھ دن سے عجب دل کی نزاکت کا ہے عالم
اک حرفِ تسلّی بھی گراں بار ہوا ہے

کیا چیز تھی رندانِ خوش انفاس کی صحبت
سُنتے ہیں کہ واعظ بھی قدح خوار ہوا ہے



یہ میخانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

شکستِ دل شکستِ غم نہیں ہے
مجھے اتنا سہارا کم نہیں ہے

ذرا سا دل ہے، لیکن کم نہیں ہے
اس میں کونسا عالم نہیں ہے

یقینِ عشق اگر محکم نہیں ہے
کوئی عالم بہ ہر عالم نہیں ہے

ابھی ناکام ہے دردِ محبت
ابھی تک دم بہ دم، پیہم نہیں ہے

تو پھر کیا ہے، اگر یہ حُسنِ فطرت
مآلِ لغزشِ آدم نہیں ہے

کہاں کا حسن، اگر اُٹھ جائے پردہ
حقیقت کیا، اگر مبہم نہیں ہے

ارے او شکوہ سنج عمرِ فانی!
یہ فانی زندگی بھی کم نہیں ہے

زباں سے کوئی کچھ کہہ لے، پر اے دوست!
سرِ تسلیم کس کا خم نہیں ہے

کہیں ایثارِ غم جاتا ہے ضائع؟
چمن شاداب ہے، شبنم نہیں ہے

وفا اک جنس ہے معروف و دلکش
مگر یہ فطرتِ آدم نہیں ہے

نہ جا شانِ تغافل پر کہ، اے دوست!
مقامِ التجا بھی کم نہیں ہے

ستم کچھ اور کر لیں حُسن والے!
مزاجِ عشق ابھی برہم نہیں ہے

---

[1] مکاتیب جگر

نگاہ و فکر کو کیا کہیے، ورنہ حقیقت کوئی بھی مبہم نہیں ہے
ابھی کیا لذّتِ دردِ محبت پیامِ دم بہ دم، پیہم نہیں ہے

☆——☆——☆

کیا چیز غمِ عشق کی دیوانہ وشی ہے رونا ہے تو رونا ہے، ہنسی ہے تو ہنسی ہے
ہر چند کہ تکرارِ نظر بے ادبی ہے پر کیجیے کیا، عشق کی فطرت ہی یہی ہے
اک منزلِ بے نام، یہ حسرت، نہ تماشا اک عالمِ حیرت کہ نہ غم ہے، نہ خوشی ہے
آسان نہیں جہدِ مسلسل سے گزرنا ہر گام یہاں مرحلۂ خود شکنی ہے
اک طرزِ تصوّر کے کرشمے ہیں بہر رنگ اے دوست! یہ دنیا نہ بری ہے نہ بھلی ہے
بن جاؤں میں بیگانۂ آدابِ محبت اتنے نہ قریب آؤ، مناسب بھی یہی ہے
بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے
وہ ظلم بھی ڈھاتے ہیں تو فرماتے ہیں احساں میں آہ بھی کرتا ہوں تو خاطر شکنی ہے

☆——☆——☆

پہنچنا زندگی سے زندگی تک نہ پوچھو، خاک! پروانے کے جی سے
بحمد اللہ! جنونِ شوق پہنچا بہت آگے مقامِ آگہی سے
مرا کفرِ محبت، اللہ اللہ! شعاعیں پھوٹ نکلیں تیرگی سے
خزانے بھر لئے ہیں اہلِ دل نے ترے مستوں کے دامانِ تہی سے
وہی دل ہے مگر اے حُسنِ جاناں! کسے فرصت جہادِ زندگی سے
خبر دار، اپنے میخانے سے ساقی! اُٹھے شعلے مرے جامِ تہی سے

☆——☆——☆

اب[1] کسی شے میں دل کشی نہ رہی رہ گیا سایہ، روشنی نہ رہی!
کہنے سننے کا جب مقام آیا کہنے سننے کی تاب ہی نہ رہی!
رشک نے ایسے تفرقے ڈالے دیدہ و دل میں دوستی نہ رہی
رہ گیا کیا، اگر محبت میں سر فروشانہ زندگی نہ رہی
عشق ہی درد، عشق ہی درماں اب ضرورت کسی کی بھی نہ رہی
ہم نہ تھے گرچہ مستحقِ کرم اُس طرف سے مگر کمی نہ رہی
لوٹ لے دولتِ فراق، جگر! فرصتِ غم رہی رہی نہ رہی

☆——☆——☆

---

[1] حسبِ روایت تسکین قریشی

[1] واعظ نہ کیوں ہو طاق حساب و کتاب میں — گزری ہے ساری عمر عذاب و ثواب میں
ان زاہدانِ خشک پہ ہو رحمتوں کی مار — توڑا کئے دلوں کو حصولِ ثواب میں



[2,3] جو تیری یاد سے معمور و نغمہ خواں گذرے — وہ لمحے کتنے حسیں، کس قدر جواں گذرے
کہاں وہ جائے تری بزمِ ناز سے اُٹھ کر — ترے بغیر جسے زندگی گراں گذرے



[4] عشق ہی اِس کو جانتا ہے کہ ہے — اک نگہ اور بھی ورائے نگاہ



ارمان اگر ہے اور یہی، اے قاتل ناداں! یہ بھی سہی
میں سینے پہ لُوں ہر وار ترا، تو تیر چلا، تلوار اُٹھا



جب یاس سے ہو چلا میں خُوگر!! — وہ آگئے دفعتاً غزل خواں
لذّت ہے تو مصیت میں، لیکن — کتنی ارزاں ہے، کتنی آساں



[5,6] وہ رہے ہم سے دُور تو کیا — ہم نے بوسے ادا ادا کے لئے
گردشیں آسماں کو ہیں کیا کیا — اک اسی خاک زیرپا کے لئے



[7] اپنی جنّت کی فکر کر، واعظ — میری جنّت تو مجھ سے دُور نہیں



[8] لطیف طبع کو لازم ہے سوزِ غم بھی لطیف — چمن میں آتشِ گل کا کبھی دُھواں نہ رہا
فراقِ زیست کی شورش، وصالِ موت کے بعد — کہاں کا لُطف، جو یہ لُطف درمیاں نہ رہا



کرم کر رہے ہیں ستم ڈھا رہے ہیں — ہمیں ہم وہاں اب نظر آ رہے ہیں



---

۱ مکتوب جگرؔ بنام حبیب احمد صدیقی ۲ ماہنامہ جگر مئی ۱۹۵۳ء ۳ القلم اپریل تا جون ۱۹۶۴ء
۴ حسبِ روایت نیاز گونڈوی ۵ مکتوبِ جگرؔ بنام میکش اکبرآبادی ۱۹۵۸ء ۶ شاہراہ مئی ۱۹۵۸ء
۷ شاہراہ جون ۱۹۵۸ء ۸ جگرؔ کی بیاض نمبر ۱ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)

دہر کا پھر وجود کیا، کوئی جو دہریا نہیں ۔۔۔ پھر یہ خودی ہے کیا بلا، کوئی اگر خدا نہیں



پابندِ کرم مائلِ بیداد رہے گی ۔۔۔ دنیائے محبت یونہی برباد رہے گی
میں لاکھ گرفتارِ تعیّن سہی، لیکن ۔۔۔ فطرت میری آزاد ہے، آزاد رہے گی



کچھ اب اور ہی پا کے منشا کسی کا ۔۔۔ اُلٹنا پڑا مجھ کو رُخ زندگی کا
بہ ایں عقل و دانش، بہ ایں علم و حکمت ۔۔۔ بشر پھر بھی پُتلا ہے کم مائگی کا



یوں سبزۂ بیگانہ کو روندا نہ کریں آپ ۔۔۔ چُبھ جائے نہ تلوؤں میں کوئی خارِ محبت



داغِ دل کیوں کوئی ممنونِ پذیرائی ہو ۔۔۔ گُلِ ویرانہ بنے، لالۂ صحرائی ہو
دل درِ دولت اگر ہے، تو بتا، اے واعظ! ۔۔۔ حرم و دیر میں کیوں مشقِ جبیں سائی ہو



طبیعت آ کے پھر تا حدِ امکانی نہیں جاتی ۔۔۔ نہیں جاتی، نہیں جاتی، یہ دیوانی نہیں جاتی



دکھا دے، اے دلِ بیتاب! عالی ہمّتی اپنی ۔۔۔ دو عالم بن کے پھیلا دے دو عالم میں خودی اپنی
نہ حُسن و عشق کی چھیڑیں، نہ امن و آشتی اپنی ۔۔۔ تری جنّت کو اے واعظ! یہیں سے بندگی اپنی
انہیں کو اب نگہبانی بھی کرنی پڑ گئی اپنی ۔۔۔ زہے دیوانگی اپنی، خوشا فرزانگی اپنی
نثارِ ہمّت ساقی ہے مرگ و زیست بھی اپنی ۔۔۔ معاذ اللہ یہ دریا نوشیاں، یہ تشنگی اپنی
نظر پڑتی ہے عالم پر اسی صورت، یونہی اپنی ۔۔۔ کسی نے جیسے آئینے میں صورت دیکھ لی اپنی
زمانہ تھا کبھی اپنا، یہ دُنیا تھی کبھی اپنی ۔۔۔ مگر اب تو نہ شامِ غم، نہ صبحِ سرخوشی اپنی
مکمّل تو کوئی کر لے حیاتِ عاشق اپنی ۔۔۔ خُدائی چیز ہی کیا ہے، خُدا اپنا، خودی اپنی
حقیقت ہی نہیں، جو چھوڑ دے اپنی حقیقت کو ۔۔۔ وہی حسرت ہے صرف اپنی، جو حسرت رہ گئی اپنی
مری بربادیوں میں کیوں ہو یہ احساس بھی شامل ۔۔۔ مرے سر ڈال دیجئے خیر سے شرمندگی اپنی
نگاہیں چار ہوتے ہی طلسمِ غیریت ٹوٹا ۔۔۔ حقیقت نے حقیقت جان لی، پہچان لی اپنی



کی ہے تڑپ تڑپ کے سحر یادِ یار نے
یہ کیا غضب کیا نفسِ شعلہ بار نے
بدلے ہیں رنگ رنگ دلِ بیقرار نے
رکھا ہے بھینچ بھینچ کے آغوشِ یار نے
ہاں، اے نگاہِ شوق! ذرا تو بھی کام کر
آتے نہیں انہیں ابھی گیسو سنوار نے
تصویر کھینچ دی کسی بیکس شباب کی
بے اختیار آج اک اُٹھے غبار نے
اک کشتۂ خزاں کو بھی دم بھر سُلا دیا
دے دے کے تھپکیاں سی نسیمِ بہار نے



بڑھے ہیں تری جستجو میں، بڑھے ہیں
کہیں اب قدم یہ ہیں رُک جانے والے
مبارک! تجھے تیری گستاخ کوشی
کھنچے آ رہے ہیں کھنچے جانے والے
محبت سے آویزشیں، توبہ، توبہ!
بہک کر رہیں گے یہ بہکانے والے



رہتا نہیں ہے جس میں کہ یارائے صبر وضبط
کیا جانے، اُس جنون میں کیا کیجئے گا آپ



جو دل کہ تیری جلوہ گہِ خاص تھا کبھی
کیوں کر یہ اب کہوں، وہ تری رہگذر نہیں
اس عہدِ مغربی میں ہے کس چیز کی کمی
کہتے ہیں جس کو دل کی سکینت مگر نہیں



اس زمانے میں دلائل کے سوا!
ہر حقیقت اب حقیقت ہی نہیں
آج کل زورِ بیاں، حُسنِ زباں
کیا نہیں، لیکن صداقت ہی نہیں



جس کے پردے میں نہ ہوں لاکھوں فریب
وہ سیاست اب سیاست ہی نہیں



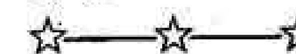
جہاں پاؤں رکھتے ہیں، سر لوٹتے ہیں
وہیں سر سے جانے کو جی چاہتا ہے



جگر! میری یہ حسرت ہے کہ خوابِ مرگ سے پہلے
مرا ہندوستاں، مرا وطن بیدار ہو جائے



کہنا نہ پھر کہ ہائے مجھے ہو گیا ہے کیا
لیجئے، بلند دستِ دعا کر رہا ہوں میں
جب آ گئی ہے ضد مجھے سرکارِ حُسن سے
ہر نقشِ آرزو کو مٹا کر رہا ہوں میں



مری عرضِ غم پر وہ فرما رہے ہیں ترے دل کی خاطر ہے، ترپا رہے ہیں
ہمہ شعر و نغمہ، ہمہ حُسن و خوشبو وہ کچھ گنگناتے چلے آ رہے ہیں
یہ ہے مشہدِ عشق، یعنی یہاں پر حسینوں کے سر ٹھوکریں کھا رہے ہیں



ترا حریف مقابل کہیں نہ بن جائے کہ ہر ادا مرے دل میں سمائی جاتی ہے
یہ آگ عشق کی ہے، یونہی رہنے دے ہمدم! بھڑکتی اور ہے جتنی بجھائی جاتی ہے
اک آستاں پہ جو تا حشر جھک نہیں سکتی ہزار در پہ وہ گردن جھکائی جاتی ہے



بجھے گی سوزِ غم سے رُوح کی پیاس اسی شعلہ کو بن جانا ہے شبنم
مرا ذوقِ نظر خود پردہ بن جائے نہ ہو گر فرصتِ نظارگی کم



پھر رُخصت، اے سکوت! کہ برسوں گذر گئے نغماتِ سرمدی کو پریشاں کئے ہوئے



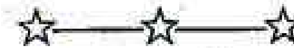
یہ حُسن ہے کیا، یہ نام ہے کیا، کیونکر یہ معمّہ حل کیجئے ہر حُسن کے ساتھ اک نام تو ہے، ہر حُسن مگر خود نام نہیں



نغمہ و نالہ ساتھ ساتھ، خندہ و گریہ پاس پاس درد یہ کس نے بھر دیا سینۂ آبشار میں



مجھے آ گیا یاد اپنا زمانہ نہ کچھ دل نے سمجھا، نہ آنکھوں نے جانا



سچ ہے کہ بلا کوئی بھی تنہا نہیں آتی کیا موت بھی بے منتِ عیسیٰ نہیں آتی



اس موت میں پوشیدہ حیاتِ ابدی ہے سر دے کے تو میدانِ شہادت سے گذر جا
قرآن و احادیث کو جو کھیل بتائے اُس قبلۂ دیں کی بھی قیادت سے گذر جا



عُمرِ عزیز آخر و کارِ جہاں دراز کہہ دے کوئی اجل سے کہ فرصت نہیں ابھی



ہر شامِ غم ہے قاصدِ صبحِ نشاط تو یہ آنکھ کی خطا ہے، اگر دیکھتی نہیں



یہ عیش و طرب، یہ رنج و تعب، سب فکر و نظر کے دھوکے ہیں
دھوکے میں نہ آنا اِن کے جگرؔ، یہ راہ گزر کے دھوکے ہیں



قحط ہو بنگال میں تیری بدولت، شرم شرم! شرم شرم، اے غیرتِ احساسِ ملت، شرم شرم!
بھوک کے مارے ہوؤں کی اُف یہ ذلت، شرم شرم! اے مروّت، اے محبت، اے شرافت، شرم شرم!



آپ ہی اپنی دید سے محروم آپ ہی اپنا مدّعا ہوں میں



تو خود ہی عینِ ذات ہے، خود جلوۂ صفات پھرتا کہاں ہے شوق کا دفتر لئے ہوئے



آج سے ترکِ ملاقات بھی تسلیم مجھے توبہ توبہ! کہ ترے حُسن کی رُسوائی ہو
قعرِ دریا میں بھی ہے سطح وہی ساحل کی یہ تو ممکن نہیں گہرائی ہی گہرائی ہو
کوئی اپنا نہیں، عرفاں نہ اگر ہو اپنا سب شناسا ہیں، اگر حق سے شناسائی ہو



بے سبب کب کوئی رسوائے فغاں ہوتا ہے دل سے جب آگ نکلتی ہے، دُھواں ہوتا ہے
تو جو ہے پاس، تو اک زندہ حقیقت ہے جہاں تو نہیں جب، تو یہ سب وہم و گماں ہوتا ہے



اس خطۂ زرخیز میں یہ قحط، یہ افلاس غیروں کی حکومت کا اثر دیکھ رہا ہوں



جنابِ شیخ بھی انساں تو خوب ہیں، لیکن حدودِ وسعتِ انسانیت سے بیگانہ
مرے لئے یہ مری تشنگی ہی کیا کم ہے میں کیوں طلب کروں ساقی سے جام و پیمانہ
نظر کو فرصتِ نظارگی نہیں، نہ سہی یقیں تو ہے کہ وہ آئے تھے بے حجابانہ



[1] وہ مری غزل سرائی، وہ کسی کا مُسکرانا وہ ذرا ٹھہر کے خود ہی، کوئی شعر گنگنانا
شبِ ماہ و موسمِ گل، وہ کنارِ جو، وہ خلوت وہ ہجومِ کیف و مستی، وہ فسانہ در فسانہ

---

[1] جگرؔ کی بیاض نمبر ۲ (لائبریری جامعہ ملّیہ دہلی)

تجھے یاد اگر نہ ہو، تو تجھے یاد میں دلا دوں — مجھے یاد ہے وہ سب کچھ، وہ مقام، وہ زمانہ
وہ نئے نئے سے جذبے، وہ نئی نئی سی ہر شے — وہ نئی نئی اُمنگیں، وہ نیا نیا زمانہ
وہ گھٹائیں اُمڈی اُمڈی، وہ ہوائیں مہکی مہکی — وہ نگاہیں بہکی بہکی، وہ ادائیں والہانہ
وہ شکستِ عزم و ہمّت، وہ غرورِ فتح و نصرت — وہ سرورِ درد مندی، وہ نشاطِ دلبرانہ
ترے سنگِ غم نے توڑا مرے شیشۂ خودی کو — مرا دل تھا توبہ توبہ، کہ "خدائے بے زمانہ"



اُس جگہ آج غمِ عشق کا عالم پایا — حُسن کو خود بھی جہاں شوقِ مجسّم پایا



اپنی بربادیٔ پیہم کا خیال آ ہی گیا — غیرتِ عشق کے چہرہ پہ جلال آ ہی گیا
زندگی سخت مقامات سے گذری، لیکن — وقت پر کام مرا جامِ سفال آ ہی گیا



ہر انقلاب ایک پیامِ سحر سہی — ہر روشنی دلیلِ طلوعِ سحر نہیں



تنگ دستی ہے، فاقہ مستی ہے — واہ کیا شانِ حق پرستی ہے



تمنا ہے اماں مل جائے، یا رب! — جہنّم کو مری تر دامنی سے
کتابوں میں اھرا ہی کیا ہے، واعظ! — سبق لے زندگی کا زندگی سے
نہ جانے، کیوں محبت کانپ اٹھی — اُٹھا جب کوئی پردہ زندگی سے



یہ رزم گاہ محبت ہے، اے دلِ ناداں! [1] — شکست دے نہ سکے، جو شکست کھا نہ سکے
سمجھتے رہ گئے لیکن سمجھ میں آ نہ سکے — مگر وہ میرے عزائم کا سر جھکا نہ سکے



اس عہد میں کہ جُز غمِ دوراں نہیں ہے کچھ — وہ شخص ہے ولی جو محبت سے کام لے
مجھ سے اُلٹا اُنہیں شکوہ ہی ستم گاری کا — اے جنوں! خواب کا عالم ہے کہ بیداری کا
عشق محدود نہ رہ جائے تو سُبحان اللہ! — ورنہ صرف ایک حسیں شغل ہے بیکاری کا



---

[1] جگر کی بیاض نمبر ۸ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)

رگ رگ میں ہے کون یہ خراماں   دل سے ہے نگاہ تک چراغاں



تری شکل سب دلنشیں ہو گئی   محبت بھی کتنی حسیں ہو گئی!



ان دنوں روز گارِ عشق نہ پوچھ   شام بھی ہے خفا سحر ہی نہیں
زندگی کی ہے کوئی منزل بھی   زندگی صرف اک سفر ہی نہیں
کیوں غمِ عشق کو نہ وسعت دیں   جب غمِ عشق سے مفر ہی نہیں
دل کو کیا ہو گیا، خدا جانے   کیا گزرتی ہے، کچھ خبر ہی نہیں
یوں وہ بیگانہ وار ملتے ہیں   جیسے اب تک اُنہیں خبر ہی نہیں
دل کی باتوں کو مختصر نہ سمجھ   دل کی ہر بات مختصر ہی نہیں
فتنۂ شر کے جاننے والے!   فتنۂ خیر کی خبر ہی نہیں
ہائے، وہ اک نگاہ خاص، جگرؔ   جو بہت کچھ ہے، مختصر ہی نہیں



طوفاں کو موج، موج کو طوفاں نہ کر سکے   وہ کونسا ہے کام کہ انساں نہ کر سکے
ہم شکوہ سنجِ غمِ دوراں نہ کر سکے   اپنے سوا کسی کو پشیماں نہ کر سکے
چپکے سے آج ایک برہمن یہ کہہ گیا   کافر ہے وہ جو کُفر کو ایماں نہ کر سکے
شرمندۂ جنونِ محبت نہیں، اگر   ہم احتیاطِ دست و گریباں نہ کر سکے



غمِ[1] دوراں کی میں تفسیر کبھی کر نہ سکا   غم دوراں مری تفسیر کئے جاتی ہے[2]
کیا ستم عشق کی تقدیر کئے جاتی ہے   ہر بال پاؤں کی زنجیر کئے جاتی ہے
کچھ[3] تو نامہ ہی کا اثر ہے مجھ پر   اور کچھ شوخیٔ تحریر کئے جاتی ہے



یہی[4] دل جلوہ گاہِ یار بھی ہے   یہی دردِ دلِ عطار بھی ہے



۱؎ جگر کی بیاض نمبر 9 (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)   ۲؎، ۳؎ کذا
۴؎ جگر کی بیاض نمبر ۱۰ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)

[1] دل کی لگی کو خاک بجھاتا آگ لگاتا آیا ساون



حقیقت حُسن کی سمجھیں گے کیا خاک   وہ ناداں جو بہلتے جا رہے ہیں



مرا عزمِ باغیانہ کبھی کھل گیا جو اُس پر   تو نہ پوچھو لطفِ پیہم، بہ گدازِ مخلصانہ



جوانی حاصلِ حُسن دو عالم ہوتی جاتی ہے   نظر بیگانۂ حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
مذاقِ شعر کا معیار اونچا ہوتا جاتا ہے   ارے توبہ! قیامت قدِ آدم ہوتی جاتی ہے



کیسی نظر کہاں کی نظر، کیا نظر میں ہے   جب تم نہیں تو خاک مری چشمِ تر میں ہے



چشمِ ساقی! میں تصدّق ترے پیمانوں کے   چند گھونٹ اور بھی، لیکن انہی میخانوں کے
آگ میں پھاند پڑیں، موت سے ٹکرا جائیں   واہ! کیا کھیل ہیں ان سوختہ سامانوں کے
کاش! یہ راز ہر انسان سمجھ لے ہم دم!   اپنا مقسوم ہے خود ہاتھ میں انسانوں کے
موت کیا آئے گی ہم عشق کے دیوانوں کو   موت خود کانپتی ہے نام سے دیوانوں کے
ہر قدم لاکھ چھیڑے سہی طوفانوں کے   حوصلے پست نہ ہوں گے کبھی انسانوں کے
زندگی جس سے عبارت ہے محبت، زندہ   وہ سکوں صرف ہے آغوش میں طوفانوں کے



بیمار کا حشر جو ہونا تھا ہو چکا   بیٹھے رہیں وہ حُسنِ پشیماں لئے ہوئے
دل بھی وہی ہے، غم بھی وہی، پھر یہ کیا کہ آج   ہر اشک ہے تبسّمِ پنہاں لئے ہوئے



جاتے ہوئے نظر سے نظر یوں ملا گئے   اپنے سوا ہر ایک حقیقت چھپا گئے
بجلی سی ایک کوند گئی، مسکرا گئے   اب کیا کہیں کسی سے، وہ کیا آئے، کیا گئے



[2] عشق نے لی اک انگڑائی، جاگ اُٹھا غیرت کا ضمیر   چھوٹ گیا دیوانہ آخر، ٹوٹ گئی زنجیر!
مرنے بھی نہ دیں، جینے بھی نہ دیں، کیا افسوں کیا تاثیر   پیاری پیاری نظریں اُس کی، نازک نازک تیر



---

[1] جگر کا مسودہ "آتشِ گل" نمبر ۱۶ (لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)   [2] حسب روایت نیاز گوونڈوی

آخرِ زندگی کُھلا یہ راز آپ کتنے قریب رہتے ہیں



دونوں عالم نہ سہی اک دلِ دیوانہ سہی جشنِ احساس تو ہے، رقصِ تمنا نہ سہی
وہ بلا نوش ہوں میں بھی کہ الٰہی توبہ! ہر ادا حُسن کی میخانہ بہ میخانہ سہی



مے کی حاجت ہے نہ اب درکار پیمانہ مجھے میرے ساقی نے پلا دی رُوحِ میخانہ مجھے



کیا رہبر و رفیق، کہاں کا کچھ امتحاں یہ بات ہے جنوں کے مذاقِ سفر سے دُور
اہلِ جہاں کی ہائے رے یہ کم نگاہیاں آئینہ سے قریب اور آئینہ گر سے دُور
رحمت تو خاص کر ہے گنہگار کے لئے رہ سکتی ہے کہیں مرے دامانِ تر سے دُور



ہاں وطن میں مرے فطرت کے مطابق، اے دوست! روزِ روشن بھی ہے، تاریک تریں رات بھی ہے
حُریت بھی ہے، مساوات بھی، جمہوریت بھی ہے تو دستور میں سب کچھ مگر اک بات بھی ہے



مرے ہوتے یہ کرم ہو نہ کسی پر، یا ربّ! ہر بلا کے لئے میرا ہی سیہ خانہ سہی
میری دُنیا بھی نہیں کم کسی دنیا سے جگر میری تقدیر میں یہ آپ کی دُنیا نہ سہی



یہ فلک، یہ ماہ و انجم، یہ زمیں، یہ رنگ و بُو جب وہ ہوتے ہیں تو کچھ اُن کے سوا ہوتا نہیں
یہ حقیقت بھی جنوں نے فاش کر دی بارہا ماسوا کہتے ہیں جس کو، ماسوا ہوتا نہیں



چارہ گر اب مجھے معاف کریں اب سکوں درد ہی سے ملتا ہے
سخت ناداں سہی، مگر ناصح کتنی شائستگی سے ملتا ہے!
موت کچھ رازِ غیب کھولتی ہے بھید کچھ زندگی سے ملتا ہے



مری طرف سے کوئی یہ کہہ دے، مجاہدِ بے خبر سے پہلے
صفائے قلب و نظر ہے لازم، جہادِ تیغ و تبر سے پہلے
سفر تو اک شرطِ جستجو ہے، مگر جو ہے شرطِ ہمرہی بھی
مرے بھٹکنے میں ساتھ دے گا، یہ پوچھ لوں راہ بر سے پہلے

خود اپنی ہی جستجو تھی یعنی، خود اپنی ہی جستجو کی حد تک
وہیں پہ آ کر قدم رُکے ہیں، چلے تھے جس رہ گذر سے پہلے
شباب میں اے جگر! غزل تو حقیقتاً ہی غزل تھی، لیکن
غزل میں یہ وسعتیں کہاں تھیں، شعورِ فکر و نظر سے پہلے



غیب کی طاقت اللہ اللہ! جیسا چاہے، ناچ نچائے



جب حُسن و محبت مل کے بہم، سرشار و غزل خواں ہوتے ہیں
فطرت کو بھی حال آ جاتا ہے، نظارے بھی رقصاں ہوتے ہیں
باطل کی ہو کتنی ہی طاقت، باطل کی اطاعت کیا معنی
ایماں پہ فدا ہو جاتے ہیں، جو صاحبِ ایماں ہوتے ہیں
اپنوں سے بھی نفرت رکھتے ہیں، ایسے تو ہزاروں لاکھوں ہیں
دشمن کے بھی کام آ جاتے ہیں، ایسے بھی کچھ انساں ہوتے ہیں
وہ عشق کی وسعت کیا جانیں، محدود ہے جن کی فکر و نظر
وہ درد کی عظمت کیا سمجھیں، بیدرد جو انساں ہوتے ہیں
یہ فیصلہ اپنے دل سے کر، ہونا ہے تجھے کِس صف میں شریک
ہمدرد بھی انساں ملتے ہیں، بے درد بھی انساں ہوتے ہیں



حُسن پر جب بُری گھڑی آئی عشق کانپا، حیات تھرّائی



اک عشق ہے کہ جس سے عبارت ہے زندگی یہ درد جس کے دل میں نہیں، آدمی نہیں



محبت سخت کوش آئی، جنوں تیشہ بدوش آیا سنبھل، اے گردشِ دوراں! کہ دیوانوں کو ہوش آیا



وہ حسن ہی نہیں ہے جو ہو جائے مطمئن وہ عشق ہی نہیں ہے جو ثابت قدم نہیں



نظر آتے ہیں ہم سب آدمی سے مگر کہیئے تو کیا کہیئے کسی سے
نہ بدلے بحر کو بھی تشنگی سے تعجب کیا مزاجِ عاشقی سے

مجھے ہر ایک شک ہے خضرِ منزل! نشانِ راہ پاتا ہوں اسی سے



لب ترستے ہیں التجا کے لئے ہاتھ اُٹھتے نہیں دعا کے لئے
ہم نے تنہائیوں میں کیا کیا لُطف ایک آوازِ بے صدا کے لئے
عشق کی وسعتیں، خُدا کی پناہ حوصلہ چاہیئے وفا کے لئے
پھُول کو رنگ و رامش و نکہت اور آوارگی صبا کے لئے
مجھ کو جو چاہو، ناصحو! کہہ لو کچھ نہ کہنا اُسے خُدا کے لئے



قندِ پارسی

بہ سرِ تو ساقیِ مستِ من، بہ سرورِ بے طلبی خوشم
اگرم شراب نمی دہی، بہ خمارِ تشنہ لبی خوشم
چہ خوش است ذوقِ محبتم! چہ بلاست لذّتِ فرقتم
کہ بہ یادِ زلفِ سیاہ تو، بہ ہجومِ تیرہ شبی خوشم
چہ مقامِ عشق وچہ منزلے کہ دریں زماں منِ بے دلے
نہ بہ شاہدے، نہ بہ مطربے، نہ بہ حاصل علبی خوشم
زنگاہِ عشوہ طرازِ تو، چہ گزشت بر دلِ من کہ من
نہ بہ نالۂ سحری خوشم، نہ بہ آہِ نیم شبی خوشم
زجفاے حُسنِ تمام تو نہ حکایتے نہ شکایتے
چہ حکایتے چہ شکایتے کہ بہ ترکِ بے ادبی خوشم



ہمہ ہوشِ عشقم، ہمہ سوزِ جانم حذر اے جواناں! کہ پیرِ جوانم
نہ اسم نہ جسمم نہ اینم نہ آنم چہ رازِ عیانم! چہ سرِّ نہانم
جہاں از من و من بہ جانِ محبت بہ جانِ محبت! کہ جانِ جہانم
خوشا نسبتِ عشق لافانیِ تو
فنا گشتم و زندۂ جاودانم



نعت شریف

اے از لب صداقت شنیدہ نا دیدہ خدا، خدائے دیدہ

خصوصیات محمدیہ

اے مثل تو در جہاں نگارے یزداں دگرے نہ آفریدہ
اے آں کہ بہ "امتزاج کامل" در جملہ صفات برگزیدہ
تو پرتو حسنِ ذات و ازتو یک شمہ بہ دیگراں رسیدہ
اے بے ہمہ خلق و باہمہ خلق اے از ہمہ خلق برگزیدہ



عہدِ رسالت تا خلافتِ راشدہ

آں خیر کہ بود در زمانت بعداز تو زمانہ ہم نہ دیدہ
در عشق و وفا دِگر مثالے نے دیدہ دنے ز کس شنیدہ



عہدِ حاضر

امروز بہ بیں کہ مرد ماں را کارے بہ ہلاکتے رسیدہ
مشرق ہمہ پُر زفتنہ و شر مغرب ہمہ مست و سر کشیدہ



معراج

اے آں کہ زشوقِ بے نہایت حق راہمہ آشکار دیدہ
طے کردہ مراحل و منازل تا سِدرَہ باساعتے رسیدہ
وز سِدرَہ بہ منتہائے قوسین باعظمتِ خاص رہ بریدہ



شمہ از حقیقت معراج

اے آں کہ درونِ پردۂ راز از خویش بہ خویشتن رسیدہ



کے عقل تواں رسد بہ پایاں ہم عشق ہنوز نا رسیدہ
"لَوْ لاکَ لَمَا خَلَقْتُ الافلاکَ" در مدحِ تو جانِ ہر قصیدہ
اے اسم تو حرز جانِ عشاق اے ذکرِ تو نورِ قلب و دیدہ
اے پرتو نثار "شرم عصیاں" اے پرتو فدا "دل پتیدہ"
یک گوشۂ چشم التفاتے بر اُمتیانِ غم رسیدہ
رحمت بہ اشارۂ تو جوشاں جنت بہ نگاہت آرمیدہ



قطع و مقطع

اِستادہ بہ پیش بارگاہت پیرے بہ رُخ آستیں کشیدہ
شاید جگرے حزیں ہمیں است از بارِ گنہ کمر خمیدہ



حقیقت و مجاز

اے عین تو ہیچ کس ندیدہ افسانہ بہ ہر زباں رسیدہ
دیدن نتواں واز رہِ شوق خارے بہ دِلے جہاں خلیدہ
عالم ہمہ پُر ز جلوۂ دوست اے واے نگاہِ نارسیدہ
گہہ گہہ نگہے بہ پائمالاں اے سرو روانِ سرکشیدہ
داریم دلے بہ سینۂ عشق نازک "زگل بہار چیدہ"
جاے زہے کشیدہ ساقی کیفِ ز شرابِ ناکشیدہ



قطعہ (مجاز و محاکات)

دی شب بہ کنارم آمد آں شوخ — دامانِ حیا بہ رُخ کشیدہ
یک پیکرِ حُسن و شعر و نغمہ — یک صنعتِ قدرت آفریدہ
یک حُسنِ نگار و صد بہاراں — یک شوقِ من و ہزار دیدہ
گل[1] تمکنتے بہ رُخ فروزاں — خوش معذرتے بہ لب رسیدہ
آں دیدۂ سُرمگیں کہ گوئی — مے خانہ بہ ساغرے کشیدہ
پنہاں نظرے بہ شوقِ گستاخ — پیدا اثر دلِ تپیدہ
مژگانِ دراز صف بہ بستہ — ابروے سیہ کماں کشیدہ
جنبش بہ نگاہِ ناتمامے — لرزش "بہ لبے سخن رسیدہ"
ہم سطوتِ حُسن بہرِ تادیب — ہم ناز، نیاز آفریدہ
از جوشِ خلوص، مہر برلب — وز کیفِ نشاط، آبدیدہ
گفتم کہ چساں گزشت بے من — گفتا، بہ خیالت آرمیدہ



قطعہ

اے آں کہ زعشق پُرسی از من — عشق است نہالِ برگزیدہ
بیخش بہ دلِ ازل نہفتہ — شاخش بہ سرِ ابد رسیدہ



کلامِ تازہ

(یہ غزلیں "آتشِ گُل کی اشاعت کے بعد کہی گئی ہیں)

کم نہیں ظلمت بھی کچھ، اہلِ نظر کے لیے
کون رہے شب نشیں نورِ سحر کے لیے
لاکھ چمن زارِ حُسن پیشِ نظر ہوں تو کیا
ہاتھ یہ بڑھتے نہیں ہر گُلِ تر کے لیے

---

[1] گل ہر ایسے محل پر مسرت و احترام کا مقصود ہو، اہل فارس کا محاورہ ہے مثلاً گل آری، گل گفتنی وغیرہ

جس پہ بہت ناز ہے آہ، تجھے بوالہوس
ننگ ہے وہ زندگی اہلِ نظر کے لیے
جوشِ طلب چاہیے ہوشِ ادب چاہیے
بند نہیں کوئی راہ پائے بشر کے لیے
رقص میں ہے زندگی ایک ترے واسطے
وجد میں ہے کائنات اہلِ نظر کے لیے
کم نہ ہوئیں ظلمتیں اُف رے شبستانِ غم
بُجھ گئے لاکھوں چراغ، ایک سحر کے لیے

گونڈہ، جون ۱۹۵۸ء



محبت کا بالآخر رقصِ بیتابانہ کام آیا
نگاہِ شرمگیں اُٹھی، سلام آیا، پیام آیا
نہ جانے آج کس دُھن میں زباں پر کس کا نام آیا
فضا نے پھول برسائے، ستاروں کا سلام آیا
ادب اے گردشِ گردوں کہ پھر گردش میں جام آیا
سنبھل اے عہدِ تاریکی کہ وقتِ انتقام آیا
جہادِ زندگی میں جب کوئی نازک مقام آیا
جنوں ہی نے قیادت کی، خلوصِ غم ہی کام آیا
نئی تخریب لازم ہے نئی تعمیر کی خاطر
ہوا کیا تو اگر کچھ گرتی دیواروں کو تھام آیا
مجھے شکوہ نہیں ساقی سے اپنی تشنہ کامی کا
مری قسمت میں دل آیا ترے حصّے میں جام آیا
اندھیروں سے اُجالے پھوٹ نکلے، دل یہ کہتا ہے
مرا افسوں خرام آیا، مرا ماہِ تمام آیا
سنبھل کر یوں تو ہم گزرے کسی کی راہ میں لیکن
کچھ ایسے بھی مقام آئے کہ گر پڑنا ہی کام آیا
اُٹھا تعظیم کو ساقی، جھکے شیشے، بڑھے ساغر
نہ جانے آخرِ شب کون رندِ تشنہ کام آیا
نکل آیا جگر جب میکدے میں شور یہ اُٹھا
وہ رندِ دل بہ یاروے بجام و تشنہ کام آیا

گونڈہ، جولائی ۱۹۵۸ء



منصور ہر اک دور میں بیدار ہوا ہے
افسانہ کہیں ختم سرِ دار ہوا ہے
مُدّت میں جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے
تا دیر سنبھلنا مجھے دُشوار ہوا ہے
بے نام و نشاں ایسا بھی اک وار ہوا ہے
ہر عزم، ہر اک حوصلہ بیکار ہوا ہے
کیا کیا نہ تپایا ہے اسے آتشِ غم نے
تب جا کے یہ دل شعلۂ بیدار ہوا ہے
اب حُسن سے کچھ کام نہ جلووں سے سروکار
اب عشق ہی خود عشق کا معیار ہوا ہے

فیضانِ غمِ دوست سے حاصل ہے وہ نسبت — ہر سانس حدیثِ لب و رُخسار ہوا ہے
کچھ دل کا تقاضا ہی نہ تھا "عرضِ محبت" — کچھ ان کی نگاہوں کا بھی اصرار ہوا ہے
بے شاہد و ساقی بھی کبھی پی تو ہے لیکن — جو گھونٹ بھی اُترا ہے وہ تلوار ہوا ہے
ڈھائی ہے اسی کو غمِ دوراں پہ قیامت — یہ دل جو ابھی فتنۂ بیدار ہوا ہے
کچھ دن سے عجب دل کی نزاکت کا ہے عالم — اک حرفِ تسلّی بھی گرانبار ہوا ہے
شبنم کی نظر میں نہیں تخصیص کسی کی — سیراب ہر اک پھول، ہر اک خار ہوا ہے
کیا چیز تھی رندانِ خوش انفاس کی صحبت — سنتے ہیں کہ واعظ بھی قدح خوار ہوا ہے

کیا کہیے جگرؔ کس گلِ رعنا کی بدولت
ہر شعر مرا شعلۂ رُخسار ہوا ہے

گونڈہ، اگست ۱۹۵۸ء



یہ مے خانہ ہے، بزمِ جم نہیں ہے — یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے
شکستِ دل شکستِ غم نہیں ہے — مجھے اتنا سہارا کم نہیں ہے
ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے — اسی میں کون سا عالم نہیں ہے
یقینِ عشق اگر محکم نہیں ہے — کوئی عالم بہ ہر عالم نہیں ہے
نہ جا شانِ تغافل پر کہ اے دوست — مقامِ التجا بھی کم نہیں ہے
تو پھر کیا ہے اگر یہ حُسنِ فطرت — مآلِ لغزشِ آدم نہیں ہے
کہاں کا حُسن اگر اُٹھ جائے پردہ — حقیقت کیا؟ اگر مُبہم نہیں ہے
ستم کچھ اور کر لیں حُسن والے — مزاجِ عشق اگر برہم نہیں ہے
ارے او شکوہ سنجِ عمرِ فانی — یہ فانی زندگی بھی کم نہیں ہے
وفا اک جنس ہے معروف و دلکش — مگر یہ فطرتِ آدم نہیں ہے
نگاہ و فکر کو کیا کہیے ورنہ — حقیقت کوئی بھی مبہم نہیں ہے
زباں سے کوئی کچھ کہہ لے پر اے دوست — سرِ تسلیم کس کا خم نہیں ہے

کہیں ایثارِ غم جاتا ہے ضائع
چمن شاداب ہے، شبنم نہیں ہے

گونڈہ، مارچ ۱۹۶۵ء

شہرہ آفاق عظیم شعراء کے شعری مجموعے

کلیاتِ میر	میر تقی میر
کلیاتِ نظیر	نظیر اکبر آبادی
کلیاتِ سودا	مرزا محمد رفیع سودا
کلیاتِ آتش	خواجہ حیدر علی آتش
کلیاتِ ناسخ	شیخ امام بخش ناسخ
کلیاتِ ذوق	شیخ ابراہیم ذوق
کلیاتِ مومن	مومن خان مومن
کلیاتِ داغ	داغ دہلوی
کلیاتِ اکبر	اکبر الہ آبادی
کلیاتِ حسرت	حسرت موہانی
کلیاتِ فانی	فانی بدایونی
کلیاتِ اصغر	اصغر گونڈوی
کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی